لداخ

محققوں اور سیّاحوں کی نظر میں

ہندوستان ـ سرزمین اور عوام

لداخ

محققوں اور سیّاحوں کی نظر میں

عبدالغنی شیخ

نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا

فہرست مضامین

پیش لفظ

زمانۂ قدیم سے لداخ میں ہزاروں لوگ آتے رہے ہیں۔ ان میں تاجر، یاتری، پجاری، فوجی، سیاح، سائنس داں، محققین اور مبلغین شامل ہیں۔ دشوار گزار راستے، برفانی درّے، ناسازگار آب وہوا اور ضروری اشیا کی نایابی اور عدم دستیابی اُن کی راہ میں حائل نہیں ہوئے ہیں۔ ماضی میں بہت سارے مسافر اور محققین لداخ کے راستے وسط ایشیا اور تبت جاتے رہے ہیں۔ تب لیہہ سے تبت کی راجدھانی لہاسہ تین ماہ، مشرقی ترکستان کا پہلا بڑا شہر یارقند ایک ماہ اور سری نگر سولہ دن لگتے تھے۔

لداخ میں مہم جو اور محقق قبیل کے سیاح زیادہ آتے تھے، جو زیادہ تر مغربی ملکوں سے تعلق رکھتے تھے۔ لیہہ میں مقیم ایک پادری فادر ہیبر نے پچھلی صدی کے شروع میں لکھا تھا: 'جو کوئی لیہہ آتا ہے، وہ یا تو اچھا آدمی ہوتا ہے یا انوکھا۔ زیادہ تر محقق، مہم جو، سائنس داں، فن کار اور قلم کار ہوتے ہیں'۔

فادر ہیبر نے ان افراد کی ایک فہرست بنائی تھی۔

لداخ کا ایک شیدائی انگریز میجر کمپارٹنر نے بھی ایسے ہی تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے: 'جو کوئی لیہہ آتا ہے، وہ یا تو عجیب وغریب یا عمدہ آدمی ہوتا ہے۔ زیادہ تر بھلے مانس لوگ ہوتے ہیں'۔

میجر ایم ایل اے کمپارٹنر المعروف گنپت نے گزشتہ صدی کی بیس کی دہائی کے دوران دو مرتبہ لداخ کی سیاحت کی تھی۔ لداخ پر اس کی کتابیں 'میجک لداخ' اور 'دی روڈ ٹو لاما لینڈ' آج بھی بڑے شوق سے پڑھی جاتی ہیں۔

لداخ آنے والے سینکڑوں سیاحوں نے سفرنامے، یادداشتیں، علمی اور تحقیقی کتابیں لکھی ہیں جو لداخ کے مختلف ادوار کے سماجی، ثقافتی، تمدنی اور سیاسی حالات کی تصویریں پیش کرتی ہیں۔ زیر نظر کتاب میں صدیوں سے زمانہ حال تک آنے والے ۲۲۲ سے زائد سیاحوں، اسکالروں اور محققوں کے تاثرات اختصار سے پیش کیے گئے ہیں یا ان کے میدان عمل کا تذکرہ ہے — نیز لداخ نہ آنے والے متعدد محققوں کے بیانات بھی شامل ہیں۔ اس ضمن میں لگ بھگ ۱۷۵ سے زائد کتابوں اور ماخذوں سے استفادہ کیا گیا ہے۔

ہیروڈٹس، سکندر اعظم، میگ ستھنیز، فاہیان، ہیون سانگ اور البیرونی جیسی نامور شخصیتوں اور مورخین نے لداخ کا مختصر ذکر کیا ہے۔

لداخ میں مختلف ذوق کے سیاحوں کے لیے کشش رہی ہے۔ اپنی جغرافیائی خصوصیات کے لیے لداخ کو 'مون لینڈ (چاند کی دھرتی)'، 'دُنیا کی چھت' اور مخصوص رسومات اور ثقافت کے پیش نظر 'میجک لینڈ (جادوئی دیش)'، 'مسٹریس لینڈ (پُراسرار زمین)'، 'نیا شنگریلا' اور 'ہرمٹس کنگڈم (زاہدوں کی مملکت)' اور نادر جنگلی جانوروں کے لیے 'اسپورٹس مینس پیراڈائز (شکاریوں کی جنت)' کہا گیا ہے۔

برطانوی ہند کے ایک افسر رابرٹ شا نے اپنے آپ سے سوال کیا ہے:

''مجھے لداخ جانے کا شوق کیونکر پیدا ہوا؟'' وہ اس کا جواب یوں دیتا ہے۔ 'ہر سال چند انگریز شکاری لداخ جاتے ہیں اور وہاں سے بودھوں کے انوکھے رسم و رواج اور حیرت انگیز جانوروں کی خبریں لاتے ہیں۔ جنگلی بھیڑیں جو ٹٹوؤں کے برابر ہیں۔ جو شکاری نہیں ہیں، ان کے لیے گنپوں، پریروہیلوں، عظیم مورتیوں اور قدیم صحیفوں میں کشش ہیں۔'

رابرٹ شا پہلے پہل ۱۸۶۸ء میں لداخ آیا۔ بعد میں وہ برطانوی ہند کے ایک تجارتی افسر کی حیثیت سے لداخ میں رہا۔

ہمارے دیش کی گنگا جمنی تہذیب کی طرح لداخ کو بودھ مسلم مشترکہ ثقافت ورثہ میں ملی ہے۔

ماضی میں لیہہ وسط ایشیا کا اہم تجارتی مرکز تھا۔ ایک برٹش جوائنٹ کمشنر آر ایل کیمبن نے لکھا تھا: سوئز کنال کے لیے جتنی پورٹ سعید ضرور ی ہے وسط ایشیا کے لیے لیہہ ضروری ہے۔

زمانہ حال میں لداخ ملک کے نقشے پر ایک اہم سیاحتی مرکز بن کر اُبھرا ہے۔ خاص کر مغربی ملکوں کے سیاحوں کے لیے لداخ ایک پسندیدہ منزل مقصود ہے۔ کئی سیاح بار بار لداخ آتے ہیں۔ یوروپ کے کئی دانشوران اور لداخ کے قدردانوں نے انٹرنیشنل ایسوسی ایشن فار لداخ اسٹڈیز کے نام سے ایک تنظیم قائم کی ہے جو ہر تیسرے سال یوروپ اور لداخ میں خطے کی تہذیب وثقافت، تاریخ وتمدن پر مجلس مناظرہ منعقد کرتی ہے۔ اب تک لداخ سمیت انگلینڈ، فرانس، جرمنی، ڈنمارک اور اٹلی میں تیرہ سمینار منعقد کیے جاچکے ہیں۔ سمیناروں میں پیش کیے گئے مقالات کو کتابی صورت میں شائع کیے جاتے ہیں۔

عبدالغنی شیخ

لداخ

لداخ صدیوں سے سیّاحوں، محققوں اور مہم جوؤں کا گہوارہ رہا ہے۔اس کے بلند وبالا پہاڑ، دشوار گزار درّے اور بے آب وگیاہ میدان مہم جوؤں اور منچلے سیاحوں کی مہم جوئی اور شوق سفر کی راہ میں حائل نہیں ہوئے۔لداخ کا جغرافیائی محل وقوع مسافروں اور مہم جوؤں کے لیے اہم گزرگاہ کا کام دیتا رہا ہے۔زمانۂ قدیم سے لداخ کے راستے مسافر، حملہ آور، علما، مبلغین اور محققین تبت، چین اور وسط ایشیا آتے جاتے رہے ہیں۔لیہہ صدیوں سے وسط ایشیا کا اہم تجارتی مرکز رہا ہے۔گرمیوں میں یہاں کے بازار میں سینٹرل ایشیا کے علاوہ تبت، شمالی ہند، سائبیریا اور افغانستان تک کے تاجر جمع ہوتے تھے اور مختلف اشیا کا تبادلہ اور خرید وفروخت کرتے تھے۔

اُنیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں دُنیا کے بہت سارے ممالک برطانیہ، امریکہ، روس، چین، سویڈن، آسٹریا، ہنگری، بھوٹان، تبت، نیپال، فرانس، جرمنی، جاپان، افغانستان، ناروے، ہالینڈ، اٹلی، سوئٹزرلینڈ وغیرہ سے ہزاروں سیاح وارد لداخ ہوئے۔ان میں عام سیاح سے لے کر ماہرین حیاتیات، ماہرین نباتات، ماہرین بشریات، ماہرین طبعیات، ماہرین طیور اور حشرات الارض، نقشہ ساز، آثار قدیمہ اور دوسرے شعبوں کے ماہرین تھے۔ان میں بیسیوں نے اپنی یادداشتیں، روزنامچے اور سفرنامے لکھے ہیں، جو اس دور کے لداخ کے لوگوں کی سماجی، ثقافتی اور مذہبی زندگی، سیاسی حالات اور دوسرے عوامل پر روشنی ڈالتے ہیں۔

ان سفرناموں اور تحریروں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے لیے لداخ کی سنگلاخ چٹانوں، بے آب وگیاہ میدانوں، کھاری جھیلوں اور برف پوش کوہساروں میں بے پناہ کشش اور جاذبیت تھی۔سخت جسمانی تکالیف اور بڑے مالی اخراجات برداشت کرنے کے بعد جب لداخ

میں وہ اپنی منزل پا لیتے تو اُنھیں بے پناہ مسرت حاصل ہوتی اور بے ساختہ کہتے کہ ان کی ریاضت بیکار نہیں گئی۔

اکبر کے نورتن اور وزیر ابوالفضل نے 'آئین اکبری' میں لداخ اور تبت کا ذکر کیا ہے۔ آئین اکبری ۱۵۹۵ء میں لکھا گیا تھا۔ مغل اور کشمیری مورخین نے لداخ کو تبت، تبت کلاں اور تبت بزرگ لکھا ہے اس لیے قارئین کوئی دفعہ اصلی تبت اور لداخ میں فرق کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔ تاہم دونوں کی تاریخ اور ثقافت میں یکسانیت کی وجہ سے مورخین کی تاریخوں کا دونوں خطوں پر اطلاق ہوتا ہے۔

آئین اکبری میں لکھا ہے۔ ''تبت میں آج کل لاموں کا ایک طبقہ یا منگول پجاری، گوشہ نشین اور تارک الدنیا ہیں، جو دو سو سال یا اس سے زیادہ زندہ رہتے ہیں۔''

اکبر نے اس پر یقین کیا اور ابوالفضل لکھتا ہے۔ 'اسی سبب جہاں پناہ نے ان لاموں کے طور طریقوں کی تقلید میں حرم میں اپنے رہنے کا وقت محدود رکھا۔ کھانا پینا خاص طور پر گوشت کے پکوان کا استعمال کم کیا۔ اُنھوں نے چندیا کے بال کاٹ لیے اور کناروں پر بال بڑھنے دیئے۔ کیونکہ وہ یہ اعتقاد رکھتے تھے کہ ایک مکمل آدمی کی روح کی آمد موت کے وقت ہوتی ہے اور چندیا سے بادلوں کی گرج کے سے شور کے ساتھ نکلتی ہے جو انسانی بدن کا دسواں سوراخ ہے۔ اسے مرتا ہوا آدمی اپنی خوشی اور گناہ سے رستگاری کا ثبوت سمجھتا ہے اور اس بات کی علامت سمجھتا ہے کہ اس کی روح عمل تناسخ سے کسی عظیم اور طاقتور بادشاہ کے بدن میں داخل ہوگی۔'

ابوالفضل نے لداخ میں دریائے سندھ کے صاف اور شفاف پانی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ پینے کے لیے صحت بخش ہے اور اتنا شفاف ہے کہ مچھلیاں نظر آتی ہیں۔ لوگ اُنھیں آہنی نیزے مارتے ہیں اور دوسرے طریقوں سے بھی اُنھیں پکڑتے ہیں۔

آئین اکبری میں یاک کی غیر معمولی شکل و شباہت کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔

شاہ جہاں نامہ میں سترہویں صدی میں عنایت خان نے لکھا ہے کہ جہانگیر (۲۷-۱۶۰۵) نے تبت اور لداخ پر مغل عمل داری قائم کرنے کا منصوبہ بنایا اور کشمیر کے گورنر ہاشم خان نے حملہ کیا اور ناکام رہا۔

مصنف نے کتاب میں جن میوہ جات کا ذکر کیا ہے، یہ سارے میوے بالائی لداخ میں نہیں بلتستان اور جزوی طور پر پوریگ (علاقہ کرگل) میں پیدا ہوتے ہیں ان میں خوبانی، ناشپاتی، خربوزہ، انگور، شہتوت وغیرہ شامل ہیں، جو بڑے مزے دار ہیں۔

مرزا حیدر گورکان نے اس سے پہلے تاریخ راشدی میں لداخ سے متعلق لکھا تھا کہ زیادہ تر علاقوں میں بلندی اور سخت سردی کی وجہ سے صرف شلغم اُگتا ہے اور ایک قسم کا جو اُگایا جاتا ہے، جو دو ماہ میں پکتا ہے۔ کچھ علاقوں میں موسم گرما صرف چالیس روز رہتا ہے وار اس دوران میں بھی آدھی رات کو دریا جم جاتے ہیں۔

لداخ کو شکاریوں کی جنت کہا جاتا ہے۔ بہت سارے یورپی شکار کھیلنے آتے تھے۔ اُنیسویں صدی میں زار روس نے وسط ایشیا کی چند مسلم مملکتوں پر قابض ہونے کے بعد برصغیر ہند کی طرف پیش قدمی کی اور ملک کی سلامتی کو خطرہ لاحق ہوا۔ گلگت اور لداخ ان کے پہلے ہدف تھے۔ برطانوی ہند سرکار کو بڑی تشویش ہوئی اور خطے کا سروے کرنے کے لیے ماہرین، روسی فوجوں کی نقل و حرکت کا جائزہ لینے کے لیے جاسوس اور سفارتی مشن روانہ کیے۔ ان کی رپورٹ خطے کے جغرافیہ اور سیاسی حالات کی عکاسی کرتی ہے۔

ابتدا میں سیاح جان ہتھیلی پر رکھ کر بلا اجازت لداخ میں داخل ہوتے، لیکن جب ایسٹ انڈیا کمپنی اور وسط ایشیا کے مابین تجارتی معاہدہ ہوا تو سری نگر میں مقیم برطانوی ریذیڈنٹ لداخ جانے والے سیاحوں کو پروانۂ راہداری اجرا کرتا تھا۔ لداخ کی محدود پیداوار اور وسائل کے پیش نظر محدود تعداد میں سیاحوں کا تانتا بندھتا تھا۔ لداخ کے بڑے بوڑھوں کا کہنا ہے کہ چند اہم منزلوں پر چولھے کی آگ ابھی گرم ہی ہوتی کہ دوسرا یورپی سیاح پہنچ جاتا۔

یورپ کے مہم جووں، سروے کرنے والوں اور سیاحوں نے لداخ میں کارہائے نمایاں سرانجام دیئے ہیں۔ اُنھوں نے لداخ کا چپہ چپہ چھانا، برفانی چوٹیاں سر کیں۔ گہری جھیلوں کی تہ معلوم کی۔ مختلف شاہراہوں کی پیمائش کی۔ چنگ چھنمو، لینگزی تھنگ، قراقرم اور اکسائی چین کے بے

آب وگیاہ میدانوں اور گھاٹیوں کی دشت نوردی کی۔ گلیشیروں پر راتیں گزاریں۔ کئی یوروپی سیاحوں نے لداخی اور تبتی زبانوں میں مہارت تامہ حاصل کی۔ تمدن، ثقافت اور تاریخ کا گہرا مطالعہ کیا۔ لداخ کے آثار قدیمہ، نسل، طبعی ماہیئت اور چٹانوں پر سائنسی تحقیق کر کے کتابیں لکھیں۔ مختلف مقامات کی بلندیاں اور درجہ حرارت معلوم کیا۔ کئی سیاح لداخ کے بودھ خانقاہوں میں موٹا جھوٹا کھانا کھاتے ہوئے علم، تجسس اور تحقیق کی پیاس بجھاتے رہے۔ کئی سیاحوں نے سفر کے دوران اپنی جانیں گنوائیں۔ آج بھی لیہہ میں اُنیسویں صدی میں آنے والے محققوں سٹولیکزا، ہربرٹ نور، ڈلگلیش اور کئی دوسرے سیاحوں کی خبریں ماضی کی مہم جوئی کی یاد دلاتی ہیں۔

لداخ آنے والے سیاحوں میں کئی مہم جو اور منچلی عورتیں گزری ہیں۔ مسز ہاروے ۱۸۵۰ء اور ۱۸۵۱ء میں دو مرتبہ لداخ آئی۔ دوسری مرتبہ وہ اکیلی تھی۔

مسز بلاک فینی ورک منیں نے لداخ میں ۲۳،۳۰۰ فٹ بلند نُن سر کیا اور ۲۲،۵۶۸ فٹ بلند لونگما چوٹی پر چڑھی۔ ہالینڈ کی ایک خاتون مسز ویسر اور اس کے شوہر نے قراقرم کے گلیشیروں کی تلاش کی۔

ایک امریکی دانیال جے بورسٹین لداخ آنے والی ایک خاتون از بیلا برڈ بشپ سے متعلق رقم طراز ہے: 'کسی بھی دور یا ملک میں کسی اور عورت کا پانا بہت مشکل ہے، جس نے اتنا لمبا سفر کیا ہو، اتنا زیادہ دیکھا ہو اور جو دیکھا، اس کا ایسا فکر انگیز ریکارڈ چھوڑا ہو'

لداخ پر لکھی گئی کتابوں میں ایسی اور کئی عورتوں کا تذکرہ ملتا ہے۔ اُس زمانے کا لداخ آج سے بہت مختلف تھا، سفر انتہائی کٹھن تھا، اونچے مقامات تو در کنار، سری نگر اور لیہہ کے درمیان راستہ اتنا خراب تھا کہ مسافروں کو کئی مقامات پر گھٹنوں اور پیٹ کے بل چلنا پڑتا تھا۔ کہیں بالکل تنگ راستوں پر چلنا پڑتا تھا جہاں ہر لمحہ سینکڑوں فٹ گہرائی میں گرنے کا خدشہ رہتا تھا۔

۱۹۷۴ء میں لداخ کو دوبارہ سیاحوں کے لیے واگزار کیا گیا، تب سے ہر سال ہزاروں غیر ملکی سیاح لداخ آرہے ہیں۔ کئیوں نے لداخ کی تاریخ، تمدن اور فنون لطیفہ پر بصیرت افروز کتابیں لکھی ہیں۔ ریسرچ اسکالروں نے لداخ کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر تحقیقی کام کیا ہے اور اپنے تھیسس شائع کرائے ہیں۔

لداخ میں چٹانوں پر برہمی، کھروشتی، عربی، سنسکرت، تبتی، شاردا اور سریانی سمیت دس زبانوں میں لکھی تحریریں ملی ہیں۔ ماہرین کے مطابق کچھ تحریریں اور تصویریں قبل مسیح اور کشان دور حکومت سے تعلق رکھتی ہیں۔ کئی تاریخ دانوں کا خیال ہے کہ پہلی اور دوسری صدیوں میں پائین لداخ میں کشان خاندان کی حکومت تھی۔

لداخ کے سرحدی گاؤں ٹانکچے میں سریانی، عربی، بیکٹرین وغیرہ کی لیپیاں چٹانوں پر تراشی گئی ہیں۔ خیال کیا جاتا ہے کہ سریانی تحریر نسطوری مسیحوں کا کام ہے جو یہاں سے صدیوں پہلے گزرے تھے۔ عربی میں قرآنی آیات اور عرب نام ہیں۔ چند مغربی محققوں کے مطابق یہ ساتویں اور نویں صدی کے درمیان تراشے گئے تھے۔

لداخ آنے والے قدیم دردوں نے چٹانوں اور بولڈرس بڑے پتھروں پر گوناگوں تصویریں تراشی ہیں۔ یہ سارے سنگ تراش گمنام ہیں۔

لداخ آنے والے بلند پایہ رشی منی، علمائے کرام اور برگزیدہ خدارسیدہ بزرگوں نے کوئی تحریری ریکارڈ نہیں چھوڑا ہے۔ ان میں پدماسمبھاوا، ناروپا، میر سید علی ہمدانیؒ، میر شمس الدین، زین شاہ ولیؒ اور نصیب الدین غازیؒ شامل ہیں۔ ایسے بہت سارے خدا کے نیک بندے، مہم جو اور محقق آئے ہوں گے جنھوں نے اپنی سرگزشت نہیں لکھی ہے اور گمنام ہیں۔

قدیم لداخ سے متعلق مورخوں کو بہت کم مواد ملا ہے۔ چینی سیاح فاہیان، ہیون سانگ اور اوکونگ نے اپنے سفرناموں میں قدیم لداخ کا ذکر کیا ہے، لیکن لداخ میں ان کی آمد سے متعلق کوئی ثبوت نہیں ملا ہے۔

فاہیان نے چوتھی صدی میں لداخ کو کچھا پایا خاچن پا کہا ہے۔ 'خا' لداخی میں برف کو کہتے ہیں۔ خطے میں برف باری کی مناسبت سے یہ نام پڑا ہے۔

ساتویں صدی میں ہیون سانگ نے لداخ کی سرحد کے پاس کلو سے لاہول سفر کیا تھا۔ وہ لکھتا ہے: 'یہاں سے شمال کی جانب راستہ بڑا کٹھن ہے۔ ٹھنڈی اور برفیلی ہوائیں چلتی ہیں۔ تب مولوسو کی قلمرو میں پہنچتا ہے،

ہیون سانگ نے مولوسو کو سامپو بھی کہا ہے۔ مولوسوا اور سانپو لداخ کے دو قدیم نام ہیں۔

تاریخ میں پہلے پہل یونانی مورخ ہیروڈٹس نے بلا واسطہ طور پر لداخ کا ذکر کیا ہے۔ پانچ صدی قبل مسیح ہیروڈٹس نے لکھا تھا کہ ہندوستان کے شمال میں سونا نکالنے والی چیونٹیاں ہیں جو کتوں سے چھوٹی اور لومڑیوں سے بڑی ہیں۔ یہ زمین کو کھود کر اس کی گہرائی سے سونا نکالتی ہیں۔ دراصل یہ مارموٹس (Marmots) تھے جن کو لداخی میں پھیا کہا جاتا ہے۔ اس کا بل زمین کی بڑی گہرائی میں پایا جاتا ہے۔ ماضی میں لداخ میں دریائے سندھ کے کنارے کچھ سونا نکالا جاتا تھا۔ یہ زیر زمین رہنے والا پھیا اپنے بل کے باہر مٹی کا جو ڈھیر لگاتا تھا، غالباً اس میں سونے کے ذرات اور سفوف ملتے ہوں گے۔

پہلے پہل لداخ میں اپنے سفر کا تذکرہ کرنے والا ایک چینی یاتری ہوئی چاؤ ہے۔ وہ ۷۲۷ء میں ہندوستان سے وسط ایشیا روانہ ہوا تھا۔ اس نے بڑا پُولو اور دو مقامات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ علاقے تنگ ہیں۔ پہاڑ اور وادیاں دشوار گزار ہیں۔ یہاں گنپے اور بھکشو ہیں اور لوگ بدھ مت کے پیروکار ہیں۔ تبت بدھ مت سے انجان ہے اور کوئی گنپہ نہیں ہے۔ تب بڑا پولو بلتستان کو کہتے تھے۔

سیاحوں نے لداخ کے قدرتی مناظر کی بڑی تعریف کی ہے۔ بہتوں کے لیے لداخ ایک عجوبہ تھا۔ رابرٹ شا نے کہا تھا: 'لداخ کی یہ بستیاں کسی اور ملک کی لگتی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کو قینچی سے تراش کر ایک ریگستان میں چپکا دیا گیا ہے۔'

ایوے اور مے نے ۱۹۲۹ء میں لداخ سے متعلق کہا تھا: 'ہم ایک ایسے ملک میں پہنچے ہیں جو کسی اور سیارے کا حصہ لگتا ہے۔ جس دُنیا کو ہم جانتے ہیں اس سے یہ بالکل مختلف ہے۔'

ایک انگریز فوجی افسر میجر گومپارٹز المعروف گنپت نے اپنی کتاب میجک لداخ (Magic Ladakh) میں لکھا ہے: 'لداخ بلوچستان سے ملتا جلتا ہے۔ بلوچی کہتے ہیں جب خدا نے دنیا بنائی تو بچے کھچے پتھر مٹی گارا وغیرہ ایک ڈھیر کی صورت میں نیچے پھینک دیا۔ یہ ڈھیر بلوچستان ہے لیکن لداخ کے معاملے میں روزانہ اپنے برش اور رنگوں کی گونا گونی سے اس میں تبدیلیاں لاتا ہے تاکہ صبح

شام پہاڑوں کے بدلتے رنگ دیکھ کر لوگ خدا کو یاد کریں۔ ان پہاڑوں میں تتلی کے پر ''جنگلی پھولوں''، سمندر کے کہرے اور قوس وقزح کی رنگت ہے۔''

لداخ میں مختلف شکلوں اور رنگوں کی چٹانیں اور پہاڑ ہیں۔ کئی مقامات پر چٹانوں میں بڑے بڑے سوراخ ہیں۔ ترکی تاجروں نے ان کو کبوتر خانہ کہا ہے۔ لارڈ ڈینمور (The Pamir) میں رقمطراز ہے: 'مغربی تبت (لداخ) میں وادی شایوق کو دیکھنے سے پہلے میں سوچتا تھا کہ کشمیر کے نظاروں کا ثانی نہیں'۔

غیر ملکی سیاحوں نے لداخ کو غالباً اس کی خاموش اور پرسکون بستیوں کی وجہ سے ہرمٹس کنگڈم یا گوشہ نشینوں کی قلمرو کہا ہے۔

سطح سمندر سے بہت بلند ہونے کی وجہ سے لداخ کو بام عالم یا ''دُنیا کی چھت'' بھی کہا جاتا ہے۔ سیاحوں کا دیا ہوا ایک مقبول نام ''مون لینڈ'' (چاند کی سرزمین) ہے۔ ای ایف نائٹ آج سے تقریباً ایک سو پندرہ سال پہلے لداخ میں لامایورو کی بودھ خانقاہ میں پہنچا تو بقول اس کے اس کی دلی کیفیت داستان الف لیلہ کے اس مسلمان شاہزادے کی سی تھی جو بت پرستوں کے ایک عجیب وغریب ملک میں پہنچتا ہے۔

سی ای ٹینڈل بسکو لکھتا ہے: 'خانقاہوں اور لاموں کے اس عجیب وغریب ملک سے متعلق تاثرات بیان کرنا مشکل ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انسان تصورات اور خیالات سے ماورا ایک دُنیا میں آیا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ اپنے بدن کی چٹکی لے کر دیکھوں کہ آیا جاگا ہوں یا خواب دیکھ رہا ہوں'۔

گنپت کو لداخ اور اس کے لوگوں سے گہرا لگاؤ تھا۔ اپنے تاثرات کا وہ ان الفاظ میں اظہار کرتا ہے۔ 'عموماً برفانی چوٹیاں، خصوصاً لداخ میرے لیے بے پناہ کشش رکھتا ہے.......... یہ سپنوں اور تخیلات کا دیش ہے...... مجھے تعجب ہے، مسٹر گاندھی لداخ کیوں نہیں آئے؟ یہاں وہ لگ بھگ وہ ساری چیزیں پاسکتے تھے، جن کے وہ متلاشی ہیں۔ جب کبھی میں لداخ آیا میرا میلان طبع گاندھی جی کے افکار کی طرف مائل ہوا'۔

ڈاکٹر ہیبر لیہہ کی مسیحی مشنری سے وابستہ تھے۔ وہ اور اس کی اہلیہ کیتھرائن ہیبر لداخ میں بہت سال رہے۔ اس کے باوجود لداخ کے رسم ورواج ان کے لیے معمہ تھے۔ موصوف اپنی کتاب ہمالین تبت (Himalyan Tibet) میں لکھتے ہیں: 'ہم یقیناً ایک عجیب وغریب سرزمین پر آئے ہیں جہاں کا باوا آدم ہی نرالا ہے، جہاں اُلٹی گنگا بہتی ہے۔ ہمارے نظریے میں جو اُصول درست ہیں، وہاں ان کے الٹ ہیں۔'

سیاحوں کے لیے لداخ کے ویران پہاڑوں، ننگے میدانوں اور عجیب وغریب رسم ورواج میں ایک ایسی دلکشی تھی کہ ایک دفعہ یہاں آنے کے بعد دوسری مرتبہ دیکھنے کی حسرت رہتی تھی اور آرام وآسائشوں سے بھری پری مہذب دُنیا میں پہنچ کر اُنھیں دلی افسوس ہوتا تھا۔ چنانچہ اے ای وارڈ نے اپنی کتاب 'دی ٹورسٹ اینڈ اسپورٹس مینس گائیڈ ٹو کشمیر اینڈ لداخ' (The Tourists and Sports man's Guide to Kashmir and Lddakh) میں رقم طراز ہے: 'لداخ کے ننگے پہاڑوں اور میدانوں میں آخر کون سی کشش ہے کہ ہم کشمیر کے ہریالے مرغزاروں سے ان بنجر بانجھ اور سرد علاقوں میں گھومنے جاتے ہیں اور بار بار جاتے ہیں۔'

گنپت جب لداخ کے پہاڑوں کو پیچھے چھوڑ کر آتا ہے تو اظہار تاسف ان الفاظ میں کرتا ہے۔ 'تہذیب کی عشرتوں اور گوناگوں آسائشوں کی طرف پلٹ کر دیکھو گے جن کے پیچھے وہ درد پنہاں ہے جہاں سے تم آئے ہو اور تاسف کے دھیمے احساس سے اس طرف دیکھتے رہو گے۔'

سیاحوں نے لداخ کو شنگریلا یا آخری شنگریلا بھی کہا ہے۔ شنگریلا شمبھالا کا ہم معنی ہے۔ بودھ عقیدے کے مطابق یہ ماورائی خوبصورت جنت نما دیش ہماری اس دُنیا میں کہیں پوشیدہ ہے۔

ماضی میں لداخ آنے والے سیاحوں کو چھ زمروں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ (۱) سیاسی، سفارتی اور تجارتی مشن پر لداخ آنے والے برطانوی ہند کے نمائندے۔ ان میں مورکرافٹ (۱۸۲۰ء) کپتان جے ڈی کیننگھم (دسمبر ۱۸۴۱ء)، الیگزنڈر کیننگھم، سسٹ یلچی، تھامس تھامسن (۴۷-۱۸۴۶ء) سرہنری لارنس اور لیڈی لارنس (۱۸۵۰ء) فریڈرک ڈریو (۶۹-۱۸۶۲ء)، کپتان تھامسن جارج

منٹگمری (۱۸۶۲ء) ڈاکٹر ہنری کیلے (۱۸۹۷ء)، رابرٹ شا (۱۸۶۸ء)، کپتان گاڈفری (۱۸۹۴ء) وغیرہ شامل ہیں۔

روس کی توسیع پسند پالیسی کے سد باب، وسط ایشیا سے تجارتی تعلقات کو تقویت دینے اور خطے کی سیاسی صورت حال کی معلومات کے لیے وقتاً فوقتاً وفود اور اہل کار خطے میں بھیجے گئے۔

کپتان جے ڈی کیننگھم کو برطانوی ہندسرکار نے دسمبر ۱۸۴۱ء میں تبت پر وزیر زورآور سنگھ کی فوج کشی روکنے اور ڈوگرہ فوج کے انخلا کا مشاہدہ کرنے کے لیے بھیجا۔

۱۔ الیگزنڈر کیننگھم (مصنف ''لداخ'') مہاراجہ گلاب سنگھ اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے مابین ایک معاہدہ کے تحت لداخ اور تبت کی سرحد کے تعین کے لیے ۱۸۴۲ء اور ۱۸۴۷ء میں دو مرتبہ لداخ آیا۔

۲۔ لداخ کے راستے مشرقی ترکستان، وسط ایشیا، چین، تبت وغیرہ وقتاً فوقتاً سیاسی، سفارتی، تجارتی اور سائنسی مشن اور مہمیں روانہ ہوتی رہی ہیں۔ ان کی فہرست ملی ہے۔ ان میں عزت اللہ ۱۸۱۲ء، جارج ہیورڈ ۱۸۶۸ء، ڈوگلس فورستھ ۱۸۷۰ اور ۱۸۷۳ء، ینگ ہاسبنڈ کی سیاسی مہمات جو ۱۸۹۰ء سے شروع ہوئیں۔ لارڈ ڈینمور کی مہم پامیر ۱۸۹۲ء، کپتانی ویلبے اور لیفٹیننٹ ملکولم کی مہم تبت اور چین ۱۸۹۶ء سون ہیڈن ۱۸۹۶ء تا ۱۹۰۸ء سمیت اور کئی مہمیں شامل ہیں۔ ان کے علاوہ جانسن، شا کیلے، بوور اور بہت سارے انگریز افسروں نے مختلف مشن پر مشرقی ترکستان وغیرہ کا سفر کیا۔

۳۔ سلک روٹ اور صحرائے گوبی میں آثار قدیمہ کے انمول خزینے کی تلاش میں لداخ سے کئی مہمیں گزریں اور لداخ کے راستے نوادرات انگلستان بھیجے گئے۔ آثار قدیمہ کی کھدائی اور کھوج کرنے والوں میں کئی قومیتوں کے ماہرین تھے۔ ان میں سر ارل سیٹن، البرٹ وون لے گوگ، پیلیوٹ، سون ہیڈن، لنگ ڈون ورنر، کاؤنٹ اوٹانی اور کوزلوف چند اہم نام ہیں۔ سلک روٹ پر متعدد مقامات پر ایک ہزار غار دریافت ہوئے۔ کئی غاروں میں سنسکرت، چینی، برہمی، کھروشتی، شاردا، سریانی اور کئی دوسری زبانوں کے متعدد مخطوطات ملے۔

۴۔ قدرت کے سربستہ رازوں کا انکشاف کرنے والے مہم جو سیاح اور جاسوس اور سروے پر آنے والی ٹیمیں۔اس زمرے میں بہت سارے مہم جو اور منچلے افراد کے نام آتے ہیں، جن کو برطانوی ہند سرکار کی اعانت اور سرپرستی حاصل تھی۔

اڈولف شلیے گین وائٹ پہلا یوروپی سیاح تھا، جو ۱۸۵۶ء میں لداخ آیا اور خطے کے اکسائی چین اور چنگ چھنمو کے ویران اور دشوار گزار خطے سے چینی ترکستان پہنچا۔اس کے بعد متعدد یوروپی محققوں اور سیاحوں نے یکے بعد دیگرے لداخ، ترکستان بلتستان وغیرہ کا سروے کیا۔گلیشیروں، جھیلوں، دشوار گزار دروں اور اونچے پہاڑوں کی بلندی وغیرہ سے متعلق تفصیلات معلوم کیں۔ان کوہ پیماؤں اور محققوں میں چند اہم نام گوڈوین آسٹین، ڈریو، ٹروٹر، رچرڈ لیڈیکر، تالبوٹ، ہیورڈ، کیرے، ریال، ولیم ورک مین، فینی ورک مین، فیلپو فلیپی، ویسر، ازبیلا بشپ، جانسن، گریزڈ، نے الیاس وغیرہ ہیں۔

روس نے بھی لداخ اور بیرون لداخ اپنے جاسوس اور محقق بھیجے جن میں یاف رے موف، رافیل ڈانی بے گوف اور میکیتھی رانے لوف کے نام قابل ذکر ہیں۔

چین کا کہنا ہے کہ ۱۸۹۱ء میں دو چینی ماہرین اے یُن اور لی یُو آنگ پینگ کی سرکردگی میں دو ٹیموں نے لداخ کے اکسائی چین اور لینگنری تھنگ کی جنوب مغربی اور شمال مغربی سرحدوں کا الگ الگ سروے کیا۔

ڈوگرہ حکمران مہاراجہ رنبیر سنگھ (۱۸۸۵-۱۸۵۷) نے بھی مشرقی ترکستان اپنے جاسوس اور سفارت کار بھیجے۔

۵۔ عیسائی مشن اور محققین۔شروع میں لداخ آنے والوں میں تبلیغی مشن پر آنے والے پادری تھے۔گیالپو جمیانگ نگیل (۱۶۱۶-۱۵۹۵) کے عہد میں پرتگال سے فادر انٹونیو اندرادے مئی ۱۶۲۴ء میں لداخ پہنچے۔ان کے بعد ۲۵ اکتوبر ۱۶۳۱ء کو دو اور پادری فادر فرانسسکو ڈی آزے ویڈو اور فادر گیووانی ڈی آویسو رو مغربی تبت کی راجدھانی ژھپرانگ سے لیہہ

پہنچے۔تب لداخ میں گیالپو سینگے نمگیل کی حکومت تھی۔ان کی آمد کے چوراسی سال بعد دو اطالوی پادری فادر ڈیزی ڈیری اور فادر فریرے کشمیر کے راستے لیہہ پہنچے۔

۱۸۸۵ء میں جرمنی کے مسیحی مشن موراوین نے لیہہ میں ایک شاخ قائم کی۔اس کے پانچ سال بعد ۹۱-۱۸۹۰ء میں کیتھولک مشن کا قیام عمل میں آیا۔

تبلیغی مقاصد سے قطع نظر مشن کے ڈاکٹروں اور پادریوں کی زندگی ایثار، بے لوث خدمات اور عملی تحقیقات کی ایک لمبی داستان ہے۔مشن نے لداخ میں پہلا اسکول کھولا اور علم کا اجالا پھیلایا۔ لیہہ لداخ میں اولین ہسپتال کا قیام کے سہرا بھی مشن کے سر ہے۔

لداخیوں میں مشن کے ارکان بڑے مقبول تھے۔اُنھوں نے زندگی کا بڑا حصہ یہاں گزارا اور کئی یہاں کی مٹی میں جذب ہوئے۔

مشن سے وابستہ کئی پادریوں نے لداخی اور تبتی زبانوں میں یدطولیٰ حاصل کیا۔لداخ کی تاریخ، تمدن، فنون لطیفہ، ثقافت اور زبان پر ریسرچ کیے اور کتابیں لکھیں۔ان عالموں اور محققوں میں یشکے، مارکس، فرانکی، ریباک، پیٹر، ہیبر اور والٹر اسبو مشہور ہیں۔

٦۔ لداخ آنے والے عام سیاح: لداخ آنے والے عام سیاحوں کی بھاری اکثریت مذکورہ بالا مہم جو سیلانیوں اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے بھیجے گئے نمائندوں اور افسروں سے مختلف ہے۔یہ سیاح کے عام مستعمل اور مسلمہ معانی پر پورا اترتے ہیں۔یہ سیلانی شکار کھیلنے، بودھ خانقاہیں دیکھنے، عجیب وغریب معاشرت اور رسوم کا مطالعہ کرنے اور ذوق سیاحت کی تسکین کے لیے لداخ آتے تھے۔

لداخ کے ننگے پہاڑوں اور میدانوں میں دُنیا کے چند مشہور جنگلی جانور پائے جاتے ہیں۔ یہاں کا جنگلی بکرا ساری دُنیا میں مشہور ہے۔اس کی کئی قسمیں ہیں۔کسی نے لداخ کو Ovis Poli (ایک قسم کا جنگلی بکرا) اور کسی نے Ovis Ammon (مقامی نیان) کی سرزمین کہا ہے۔اس کے علاوہ یہاں کیل، مشک نافہ والا ہرن، برفانی چیتا، جنگلی یاک، جنگلی گدھا، تبتی غزال، مارخور، بارہ

سنگھا، مرگ، ریچھ وغیرہ پائے جاتے ہیں۔ان میں مشک نافہ والا ہرن، مارخور اور بارہ سنگھا اب معدوم ہو گئے ہیں۔کم سے کم ایک درجن شکاریوں جیسے جرنیل کینلوچ، جرنیل میسن ٹائر، کرنل ڈورانڈ، کرنل وارڈ اور کرنل ہیبر جیسے برطانوی ہند کے اعلیٰ فوجی افسروں اور کئیوں نے اپنے شکار کے تجربات کو کتابی صورت دی ہے۔یورپ کے شکاری لداخ میں جنگلی بکروں کے خوبصورت اور لمبے سینگ جمع کرتے تھے جن کو وہ اپنے ڈرائنگ روم کی زینت بناتے تھے یا عجائب گھروں اور برٹش میوزیم کی نذر کرتے تھے۔کئی لداخی جنگلی جانور یوروپ کے مہم جو محققین کے ناموں سے منسوب ہیں۔مشہور جنگلی بکرے کو Hodgsoni Sheep مقامی شاپو یا Urial کو Vignesi Sheep اور خرگوش کی ایک قسم کو Stoliczka's Mouse Hare بھی کہتے ہیں۔ ۱۸۹۵ء میں کل چار سو شکاری شکار کھیلنے لداخ اور بلتستان گئے۔یہ مختلف پہاڑوں اور وادیوں میں پھیل جاتے تھے۔ان دنوں لداخ کو Sports Man's Paradise بھی کہا جاتا تھا۔

یوروپی شکاریوں اور خاص کر غیر ذمہ دار شکاریوں نے لداخ کے جنگلی جانوروں کو بڑا نقصان پہنچایا ہے۔آج کل جنگلی جانوروں کے شکار ممنوع قرار دیا گیا ہے۔

لداخ آنے والے بہت سارے مغربی سیاح یہاں کی بودھ خانقاہوں، مورتیوں، مصوری کے اعلیٰ نمونوں، ناچ اور نغموں میں دلچسپی لیتے تھے۔لداخ کی ثقافت ،لباس اور رسم ورواج سے بھی سیاحوں کو بڑا لگاؤ تھا۔لداخ میں دستیاب چینی پیالیاں، اژدہا، مور وغیرہ کے بیل بوٹوں والے چینی کپڑے، تبتی برتن، تانبے کی چائے دانیاں، قالین، چینی ترکستان کا ریشم اور دوسری مصنوعات سیاحوں کو لداخ کھینچتی تھیں۔

۱۹۴۸ء کے بعد لداخ میں بیرون ملکوں کے سیاحوں کے داخلے پر پابندی عائد کی گئی تاہم کئی غیر ملکی اجازت لے کر لداخ آتے اور کبھی کبھی ذوق سیاحت کسی کو اجازت لیے بغیر کھینچ لاتا جو دور رفتگاں کی یاد دلاتا ہے۔۱۹۷۳ء میں چند امریکی اور انگریز سیاح جن میں دو عورتیں بھی تھیں، پائین کے جنگلات سے ہوتے ہوئے وادئ وردوان کے درے سے خطرناک گلیشیر پر چل کر پاپیادہ اچانک کرگل پہنچے جہاں سے ان کو واپس کر دیا گیا۔

وسط ایشیا سے تجارتی تعلقات منقطع ہونے کے بعد تجارتی لحاظ سے لداخ کی افادیت ختم ہوگئی ہے۔ جن شاہراہوں پر صدیوں تک اونٹوں اور گھوڑوں کی ٹنٹناتی گھنٹیاں بجتی تھیں، اب وہ خاموش ہیں۔ نمک کی تھیلیاں اور اُون کے گٹھے اُٹھائے ہزاروں بھیڑیں سر جھکائے اور گرد وغبار اُڑاتی نظر آتیں۔ نغمہ سرا تاجروں کے گیت اور ٹٹو والوں کی دوشاخہ بانسیوں کی تانیں سنائی نہیں دیتیں لیکن ان کی یادیں باقی ہیں۔ ان سیاحوں کی کتابیں، یادداشتیں اور سفرنامے موجود ہیں جو ان راستوں پر چلتے تھے۔ یہی تحریریں ماضی کی یادیں تازہ کرتی ہیں۔

زیر نظر کتاب میں آگے جاکر ہم مذکورہ چھ زمروں کے سیاحوں، محققوں اور سائنس دانوں اور اُن کے تاثرات اور تجربات کا فرداً فرداً تذکرہ کریں گے۔

لداخی کردار

ملک کو آزادی ملنے سے پہلے لداخ آنے والے تقریباً تمام مغربی اور دوسرے سیاحوں نے لداخی چال چلن کی تعریف کی ہے اور اُنھیں خوش اخلاق، شریف، راست باز، دیانت دار، خوش مزاج، قانع اور امن پسند بتایا گیا ہے۔ اُنھوں نے لکھا ہے کہ خطے میں جرائم کی وارداتیں نفی کے برابر ہوتی ہیں۔ چوری چکاری نہیں ہوتی اور لوگ اپنے گھروں کو تالا نہیں لگاتے۔ تاہم لگ بھگ سبھوں نے لکھا ہے کہ لوگ بہت کم نہاتے دھوتے ہیں اور گندے رہتے ہیں۔ البتہ کئیوں نے اس کا سبب لداخ کی سردیوں کو قرار دیا ہے۔ کئی مشاہدین نے لکھا ہے کہ لداخی جسمانی طور پر صفائی سے نہیں رہتے لیکن اپنے گھروں، گلی کوچوں اور ماحول کو صاف ستھرا رکھتے ہیں۔

موجودہ لداخ اور لداخیوں پر ان اوصاف کا اطلاق نہیں ہوتا۔ آج کل لداخی صاف ستھرے رہتے ہیں۔ مادی خوش حالی کی وجہ سے اچھا پہنتے ہیں اور اچھے گھر میں رہتے ہیں۔ البتہ ایک اوسط لداخی کے کردار سے متعلق دو رائے ہوسکتی ہے۔

سبھی غیر ملکیوں کا یہ متفقہ تاثر ہے کہ لداخی بڑے خوش وخرم رہتے ہیں۔ ان کی سرشت میں

مزاح اور ظرافت ہے۔ یہ ناچ گانے کے شوقین ہیں۔ غریبی ان کی خوش مزاجی اور ایمان داری کی راہ میں اثر انداز نہیں ہے۔

الیگزنڈر کینگھم لکھتا ہے: 'یہ لوگ بڑے ملنسار ہیں۔ ہر واقعہ ان کے لیے دعوت کا ایک بہانہ ہوتا ہے جو ہنگاموں پر ختم ہوتا ہے۔ عموماً مے نوشی کی محفل جمتی ہے۔ مے نوشی سے متعلق گیت گائے جاتے ہیں۔ زنانہ رقاصاؤں کا ناچ تفریح کا ایک بڑا حصہ ہے............ بچے کے جنم، نام رکھائی، شادی بیاہ وغیرہ پر رقص وسرود کی محفلیں منعقد ہوتی ہیں۔

لداخی گیت: ملکی اور غیر ملکی اسکالروں اور عام سیلانیوں نے لداخی گیتوں کو پسند کیا ہے اور بہت سارے گیتوں کا انگریزی اور اُردو میں ترجمہ ہوا ہے۔ ڈاکٹر فرانکی نے قدیم اور زمانہ وسطیٰ کے متعدد گیتوں کو انگریزی جامہ پہنایا ہے۔ لداخی شاعروں سے متعلق وہ اپنے تاثرات ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔ ''لداخ کے لوگ شاعری کی فطری صلاحیت رکھتے ہیں لیکن شاعری اور قومی ادب کی نشو ونما پانے کی مناسب طور پر اجازت نہیں دی گئی۔ تاہم ان گیتوں کا اعلیٰ معیار اس بات کا غماز ہے کہ اگر لداخی ادب اور شاعری کو آزادانہ طور پر پھلنے پھولنے کا موقعہ ملتا تو ان لوگوں کی ادبی صلاحیت انتہائی کمال کو پہنچ جاتی۔'' ڈاکٹر فرانکی نے یہ وضاحت نہیں کی ہے کہ شاعری اور ادب کو کس نے اور کیوں نشو ونما پانے نہیں دیا۔ ایک اور پادری ایچ ہینلون (Han Mlone) نے سو سے زائد لداخی گیتوں کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔ ان میں پوریگ، چانگ تھنگ، زنسکار اور نوبراہ کے گیت ہیں۔ اس لحاظ سے یہ لداخ خطے کے نمائندہ گیت ہیں۔

ایک غیر ملکی خاتون جینت رضوی کھیتی باڑی کے مختلف مرحلوں پر گائے جانے والے لداخی گیتوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ یہ گیت سب سے زیادہ توانا اور غنائی خصوصیات کے حامل ہیں۔ لداخی ماخذ کے حوالہ سے اُنھوں نے بتایا ہے کہ صرف شادی بیاہ سے متعلق ۳۲۰ گیت ہیں۔ اس طرح لداخیوں نے موسیقی میں متعدد اور رنگا رنگ دُھنیں بنائی ہیں۔ جینت نے موسیقی کے میدان میں لداخ کے یوگ دان کا ذکر کیا ہے۔ صرف [illegible] موسیقی کی [illegible] دھنیں ہیں۔ لداخ کے

لوگ ناچ گانوں کے بڑے شوقین ہیں۔ بہت سارے یوروپیوں نے اس کا ذکر کیا ہے۔ اُنھوں نے تیوہاروں، ان کے تفریح کے لیے منعقدہ تماشوں اور مختلف موقعوں پر ناچ گانے دیکھے تھے۔

پولو لداخیوں کا مقبول کھیل ہے

پولو صدیوں سے لداخ میں کھیلا جا رہا ہے۔ فریڈرک ڈریو نے تقریباً ڈیڑھ سو سال پہلے لکھا ہے: 'لداخی پولو کے بڑے شوقین ہیں۔ اونچے مرتبہ کے لوگ بڑے چاؤ سے پولو کھیلتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ پولو کھیلنا زندگی کا ایک مقصد ہے اور اس لیے ان کو اس دُنیا میں بھیجا گیا ہے لیکن یہ اونچے طبقے تک محدود نہیں۔ غریب سے غریب آدمی بھی اس دوڑ میں برابر کے شریک ہیں۔ جس کسی کو ایک ٹٹو ملتا ہے وہ پولو کے مقابلے میں کود پڑتا ہے۔ بچے کمسنی میں ہاکی کھیلنے میں جٹے ہیں تاکہ آئندہ زندگی میں اپنے کو پولو کے اچھے کھلاڑی بنائیں۔'

پولو پر خوبصورت گیت لکھے گئے ہیں جن میں اچھے کھلاڑیوں کی تعریف کی گئی ہے۔ جی ٹی وین نے لداخی پولو کو ہاکی آن ہارس بیک یعنی گھوڑے پر ہاکی اور تھورن ٹون نے گھوڑے پر کرکٹ کا کھیل کہا ہے۔

۱۸۷۴ء میں دو انگریز کاؤلے لمبرٹ اور لیڈیکر نے لداخ کے ایک گاؤں اُبریس میں پولو گراؤنڈ دیکھا۔ پولو گراؤنڈ دیکھ کر کاؤلے کو انگریزی شاعر چاسر کی ایک نظم یاد آئی۔ وہ لکھتا ہے۔ 'اس قابل دید پولو گراؤنڈ کے ساتھ ایک عمارت تھی، جس کا دریچہ میدان کی طرف کھلتا تھا۔ ارد گرد شاندار اور تناور درخت کھڑے تھے۔ ہم آنکھیں بند کر کے یہ تخیل آرائی کر سکتے ہیں کہ اس دریچے سے خوبصورت عورتیں اور بچے پولو سے کتنے لطف اندوز ہوتے ہوں گے!'

کاؤلے نے دراس میں پولو میچ دیکھا۔ وہ لکھتا ہے: 'اس کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ گھوڑسوار گھوڑے سے اُترے بغیر گیند اُٹھا کر اور اسے ہوا میں اُچھال کر ہٹ لگاتے تھے۔'

کپتان نائٹ نے ۱۸۶۰ء میں پشکیوم میں پولو میچ دیکھا جس میں پچاس سے ساٹھ کے درمیان گھوڑسواروں نے حصہ لیا۔ وہ لکھتا ہے: 'کھیل کے اختتام تک کوئی کھلاڑی اپنے گھوڑے سے نہیں گرا

اور نہ کسی قسم کا حادثہ پیش آیا۔ پولو کے کھلاڑی گھوڑے سے اُترے بغیر گیند ہاتھوں میں لیتے ہیں اور اپنی اسٹک سے گیند کو فضا میں اچھالتے ہیں۔ اس سے پہلے ۱۸۴۶ء کے آس پاس الیگزنڈر کیننگھم نے مُولبیک میں ایک ٹیم میں بیس بیس کھلاڑیوں کو حصہ لیتے دیکھا انگنت موسیقاران کا ساتھ دے رہے تھے۔

۱۸۹۲ء میں لارڈ ڈینمور کے اعزاز میں دراس میں ایک پولو میچ کی نمائش ہوئی جس میں گیارہ گیارہ کھلاڑی تھے۔

مور کرافٹ نے پشکیوم میں پولو گراؤنڈ کو ناپا۔ اس کی لمبائی ۲۰۰ گز اور چوڑائی ۳۰ گز تھی۔ لداخی پولو گراؤنڈ کو شغارن کہتے ہیں۔ یہ دردی لفظ ہے۔

لداخی پولو کی اسٹائل قدرے مختلف ہے۔ ایک انگریز میجر سی ڈی بروس نے اپنی کتاب In the Footsteps of Marcopolo میں لکھا ہے:

'ماہرین کے نقطہ نظر سے لیہہ کے پولو کے اسٹائل پر نکتہ چینی کرنا آسان نہیں ہے۔ یہاں یہ کھیل ان کھیلوں میں سے ہے جو خالصتاً اصلی روپ میں ہے اور ہماری خواہش ہے کہ یہ سدا اسی طرح رہے۔'

بلندی سے ہونے والی بیماریاں

جیسا کہ اوپر ذکر آیا ہے کہ مرزا حیدر گورکان نے سب سے پہلے لداخ میں دم گیری یعنی آکسیجن کی کمی کی وجہ سے سانس لینے میں تکلیف کا ذکر کیا ہے۔ ۱۷۱۵ء میں فادر ڈیزی ڈیری اور اس کی پارٹی کو لداخ ہمالیائی خطے میں اونچے درے پار کرتے ہوئے سر میں درد اور سانس لینے میں تکلیف ہوئی تھی۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازم میر عزت اللہ نے لداخ میں Mountain Sickness یعنی بلند مقامات کی بیماری کا ذکر کیا ہے قراقرم درہ عبور کرتے ہوئے اس کی پارٹی کے ارکان کو سانس لینے میں تکلیف اور متلی ہوئی تھی۔ میر لکھتا ہے: 'اٹک پہنچنے پر ناسازگار ہوا کا اثر ختم ہوا جہاں چارا، لکڑی اور پانی کی فراوانی تھی۔'

میر عزت اللہ نے ۱۸۱۲ء اور ۱۸۲۰ء میں لداخ اور وسط ایشیا کا سفر کیا تھا۔

۱۸۹۱ء میں ایک یوروپی روکہل نے لکھا ہے کہ لداخ میں پہاڑی کی بیماری کو لرڈوگ یالادوگ یا 'درے کا زہر' کہا جاتا ہے۔ کئی دفعہ لوگ اس کا سبب پہاڑوں میں اُگنے والی ریوند چیلی کو قرار دیتے ہیں۔ لہسن حتیٰ کہ تمبا کونوشی کو بھی اس کے لیے تریاق سمجھا جاتا ہے۔ اس بیماری سے متاثر جانوروں کو بھی لہسن کھلایا جاتا ہے۔

فریڈرک ڈریو نے بھی ۱۸۷۷ء میں لداخ میں اپنے سفر کے دوران ہوا کی کمی کی شکایت کی ہے اور لکھا ہے کہ بلند مقامات کے خانہ بدوش چنگپا قبیلہ کے لوگ اپنے بدن پر زیادہ بوجھ نہیں ڈالتے۔

ایک اور انگریز نائٹ نے ۱۸۹۵ء میں یہ انوکھی بات لکھی ہے کہ لداخی جو بلند مقامات پر رہنے کے عادی ہیں، جب (نشیبی) میدانوں میں آتے ہیں تو بخار کا شکار ہوتے ہیں اور جلدی مرجاتے ہیں۔

ایک اور یوروپی لنڈون (۱۹۰۵ء) نے مقامی لوگوں کے حوالے سے لکھا ہے کہ بلندیوں اور دروں پر مقیم بھوت پریتوں کی وجہ سے برف کے تودے گرتے ہیں اور یہی 'لردوگ' زہریلی ہوا خارج کرنے کے ذمہ دار ہیں۔

ہیرر (Harrer) (۱۹۵۳ء) رقم طراز ہے کہ تبتی اس کے مداوا کے لیے دروں کی بلندی پر مذہبی جھنڈیاں اور Cairns یعنی پتھروں کا مینار نصب کرتے ہیں۔ (اس مینار پر دھارمک جھنڈیاں اور جانوروں کے سر رکھے جاتے ہیں) تبت اور لداخ دونوں میں یہ دستور مروج ہے۔

ڈونکن ۱۸۶۰ء نے بھی لردوگ کا ذکر کیا ہے اور یوں رقم طراز ہے:

'اونچے دروں پر زہریلی ہوا کی موجودگی کا تذکرہ ہے، جن کی بھاپ اُٹھتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ اس سے نمٹنے کے لیے لہسن چبایا جاتا ہے۔'

کینیڈا کی ایک خاتون جوڈی اینے سٹرنز ۱۹۸۰ء کی دہائی میں بلندی کے اثرات پر تحقیق کرنے کے لیے لداخ آئی تھی۔ وہ اپنے تھیسس میں لکھتی ہے کہ لداخی دردسر، متلی اور سانس میں تکلیف کے اسباب دروں پر اُگنے والے چند پھولوں کی بو کو قرار دیتے ہیں جن سے چند لوگ متاثر ہوتے ہیں۔ یہ

شکایت جون، جولائی اور اگست کے مہینوں میں کی جاتی ہے، جب یہ پھول پوری طرح کھلتے ہیں..........لداخی لادوگ یا لردوگ کے علاج کے لیے تیز کالی چائے، خرگوش کا گوشت، مٹھائیاں، روٹی یا پانی کے ساتھ سوکھی خوبانیوں کے سفوف کے استعمال کی تجویز کرتے ہیں۔

پولینڈری (Polyandry) یا کثیر الازدواج

سیاحوں اور ریسرچ اسکالروں نے لداخی بودھوں میں مروج پولینڈری یعنی کثیر الازدواج، جس میں ایک بیوی کے ایک سے زیادہ شوہر ہوتے ہیں، کا ذکر کیا ہے۔ کئی مغربی سیاحوں نے کثیر الازدواج کو ظالمانہ اور بداخلاقی سے تعبیر کیا ہے، تاہم ایک یوروپی اسکالر کرسٹوفر بریکس برٹیلسن نے اسے انسان اور فطرت کا (Interaction) باہمی عمل قرار دیا ہے۔ وہ لکھتا ہے۔ 'یقیناً کوئی مرد یا عورت عموماً اسے پسند نہیں کرے گی۔' مسلمانوں کے مقابلے میں بودھوں کی آبادی میں اضافہ نہ ہونے کی وجہ کثیر الازدواج کو قرار دیا گیا ہے۔ زمانۂ حال میں بودھوں نے اس کے خلاف پرزور مہم چلائی ہے جس کا دوررس نتیجہ نکلا ہے۔ نیز مادی خوشحالی اور سماجی تبدیلیوں کی وجہ سے پولینڈری کی رسم اب تقریباً ختم ہوگئی ہے۔

البیرونی، ڈیزی ڈیری (۱۷۲۰ء)، ولیم مورکرافٹ (۲۱ ـ ۱۸۲۰ء) الیکزنڈر کیننگھم (۴۷ـ۱۸۴۶ء)، جان ایف میلے نن (۱۸۶۵ء)، پرنس پیٹر (کرافٹ ۱۹۳۸ء)، اور دوسرے کئی مغربی مشاہدین نے لداخ میں مروجہ کثیر الازدواج کا ذکر کیا ہے۔ زمانہ حال میں کرسٹوفر (۱۹۹۶ء) نے اس کا دوررس تجزیہ کیا ہے۔

پرنس پیٹر نے کثیر الازدواج کی وجوہات، دگرگوں ماحول، بنجر اور سرد آب وہوا کے سبب پیداوار میں کمی بتائی ہیں جس سے آبادی میں اضافے کا سد باب کیا جاسکتا ہے۔ تاہم پرنس پیٹر کے مطابق اُن دنوں بھی سبھی پولینڈری کے حق میں نہیں تھے۔ وہ لکھتا ہے: 'چند معاملات میں کنبے کے ڈھانچے کے سبب پولینڈری ممکن ہے۔ بعض معاملات میں اسے نامناسب قرار دے کر مسترد کیا جاتا ہے۔ اس ضمن میں خاص کر لیہہ میں اچھے پڑھے لکھے، اُمرا اور ہندوستان کے میدانی علاقوں میں سفر

کرنے والوں میں پولینڈری کے خلاف منفی رجحان پایا جاتا ہے۔

پرنس پیٹر ایک ماہر بشریات تھا اور یونان سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ ۱۹۳۸ء میں لداخ آیا۔ اس نے لیہہ میں چھ کنبوں کا سماجی اور معاشی سروے کیا اور اس کے ۴۳ سال بعد ۱۹۸۱ء میں انگلستان کے پروفیسر جے ایچ کروک اور ایک تبتی ٹی شیکیا نے اُنھیں خاندانوں کا ان ہی خطوط پر سروے کیا۔ ان کا موازنہ کیا جائے تو دلچسپ نقشہ اور نتائج سامنے آتے ہیں۔ ۱۹۳۸ء میں سولہ شادیوں میں دس یعنی ۶۳ فیصد شادیاں کثیر الازدواج طور پر ہوئی تھیں اور ۱۹۸۱ء میں ۳۵ شادیوں میں ۴ کا بیاہ کثیر الازدواج طور پر ہوا تھا۔ ۱۹۳۸ء میں لیہہ کی آبادی ۲۳۱۷ نفوس تھی۔ ان میں ۱۲۸۷ بودھ تھے، ۹۹۱ مسلمان اور کچھ عیسائی، ہندو اور سکھ تھے جب کہ ۱۹۸۱ء میں لیہہ کی آبادی دس ہزار تک پہنچی تھی۔ ۱۹۳۸ء میں چھ کنبوں میں فی گھر اوسطاً ۱۱ اعشاریہ ۵ افراد تھے جب کہ ۱۹۸۱ء میں ۱۷ اعشاریہ ۵ افراد تھے۔ یہ کنبے اب پھیل کر ۴۵ ہو گئے تھے۔

۱۹۳۸ء میں ایک خاندان کے بزرگ نے پرنس پیٹر کو شکایت کی کہ نوجوانوں میں بداخلاقی آئی ہے۔ یہ نئی نسل پولینڈری کے خلاف ہے۔ اس پر ہندوستان سے آئے ہوئے لوگوں، ترکی تاجروں، مشنری اور سیاحوں کا اثر پڑا ہے جو ہمیشہ دیرینہ رواج کے خلاف بولتے رہتے ہیں اور یک زوجگی کی بری رسم پر عمل کر رہے ہیں۔ اس نے پرنس پیٹر سے سوال کیا۔ 'آپ لوگ یوروپ میں کثیر الازدواج کے بغیر اتنے دولت مند کیوں ہیں؟' ....اس نے یہ بھی کہا۔ 'گھر پر آپ کو کھانے کے لیے کافی خوراک نہیں ہے اس لیے باہر جا کر نوآبادیاں قائم کرتے ہیں۔' پیٹر کو بزرگ کی بات بہت اچھی لگی۔ ان دنوں چھ خاندانوں میں کثیر الازدواج شادیاں مروج تھیں۔

۱۹۸۱ء میں جان کروک اور ٹی شیکیا کے سروے کے مطابق سب کا نظریہ بدل گیا تھا اور پولینڈری کو معیوب اور شرم ناک سمجھا جاتا تھا۔ وہ رقم طراز ہیں۔ 'روزگار کے وسائل کی وجہ سے پولینڈری غیر ضروری بن گئی ہے۔ چھوٹے بھائی اپنی آبائی زمین پر مکانات بناتے ہیں۔ اس کے لیے زمین کا بٹوارہ ہوتا ہے۔ سب سے بڑے بھائی کو قدرے زیادہ زمین ملتی ہے۔ ۱۹۳۸ء میں سبھی

مرد کھیتی باڑی میں جڑے تھے۔اب ۳۶ مردوں کو دوسرے نفع بخش روزگار نصیب ہیں۔یہ انجینئر، کلرک، اُستاد، فوجی اور پولیس کانسٹیبل کے پیشے اختیار کررہے ہیں۔ایک لڑکا کالج اور دوسرا یونیورسٹی میں پڑھتا ہے۔باقی بیس بچوں کو اعلیٰ تعلیم ملنے کے امکانات ہیں۔۵۰ فیصد مرد کھیتی باڑی سے منسلک ہیں'

ان افراد میں ایک بزرگ حیات تھے۔وہ اُناسی سال کے تھے اور اُن کو پرنس پیٹر کی لداخ آمد اچھی طرح یاد تھی۔

رپورٹ میں لکھا ہے کہ ان کنبوں میں بچی پیدا ہونے پر کسی کو مایوسی نہیں ہوتی تھی۔ان کے لیے لڑکا اور لڑکی میں کوئی فرق نہیں تھا۔شادی شدہ عورتیں گھر، کھیتی باڑی اور بازار کی زندگی میں اہم کردار ادا کرتی ہیں اور بے روک ٹوک اپنے خیالات کا اظہار کرتی ہیں۔

ان کنبوں کے افراد نے پروفیسر جان کروک سے کہا کہ ان کے افراد کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے۔وہ پہلے سے خوش حال ہیں، دولت زیادہ ہے، روزگار ہے، فصلیں بہتر ہوتی ہیں، وہ زیادہ خرچ کرتے ہیں۔علاقے میں ترقیات کا کام بہت زیادہ ہو رہا ہے۔

۱۹۳۸ء میں ان چھ خاندانوں میں ۶۹ مرد تھے۔اب مردوں کی کل تعداد ۱۰۵ تک پہنچی ہے۔

جان کروک نے اپنی سروے رپورٹ میں لکھا ہے: 'کھڑکیوں میں اب شیشے لگے ہیں۔اوپر کی منزل میں گلاس روم ہے۔اندرون مکان آرائش اور سجاوٹ زیادہ ہیں۔ایک یا دو گھروں میں طالب علموں کے لیے الگ کمرہ ہے جس میں موسیقی کے کیسیٹ، کھیلوں کے انعامات اور مغربی پوسٹر لگے ہیں۔

1981ء کے مقابلے میں اب صورت حال کافی بدلی ہے۔ان خاندانوں کی سماجی اور معاشی حالت میں مزید خوشگوار تبدیلیاں آئی ہیں۔ہر کنبے کے گھروں میں فون ہے اور تقریباً ہر ایک کے پاس گاڑی ہے۔

پولینڈری کی رسم کے باوجود ماضی میں لداخ آنے والے متعدد سیاحوں کی کتابوں میں آیا ہے کہ لداخ میں عورتوں کو پوری آزادی حاصل ہے۔لداخ میں ماں باپ یا کسی فرد کو بچی پیدا ہونے پر مایوسی یا قلق نہیں ہوتا۔

گنپت رقم طراز ہے: 'لداخی عورت اپنے گھر بار کی مکمل مالکن ہے۔ مرد اس کی مضبوط قوت بازو کے زیر نگیں ہیں۔ اس کے پاس اپنا روپیہ ہے۔ وہ اپنی جگہ تجارت کرتی ہے۔ اس کا لفظ قانون کی طرح ہے اور بالا بالا جب وہ راستے میں آپ سے ملے گی تو وہ اپنا وقت آزادی اور بے فکری سے گزارے گی، فلیپو فلیپی نے بھی لداخی عورت کو گھر کی حکمراں قرار دیا ہے۔

مارکو پالیس (۱۹۳۶ء) کا کہنا ہے کہ لداخی بچوں سے ماں باپ کے نام پوچھیں تو وہ باپ سے پہلے ماں کا نام بتاتے ہیں۔

لداخی باپ کے بجائے ماں کی قسم اُٹھاتے ہیں جس کا ذکر ایک اسکالر ڈاکٹر روینہ اگروال نے اپنے تھیسس میں کیا ہے۔

ایک اور یوروپی Pearce Gervis لکھتا ہے۔ 'لداخ ایک ایسی جگہ ہے جہاں عورتوں کو پوری آزادی اور اختیارات ہیں'۔

سیاحوں نے مردوں کے مقابلے میں عورتوں کی اچھی صحت کا ذکر کیا ہے۔

آرغون:

کئی یوروپیوں نے آرغون مسلمانوں کے کردار پر سخت حرف گیری کی ہے اور اُنھیں دھوکے باز اور جھوٹا قرار دیا ہے۔ تاہم کئی یوروپیوں نے آرغون کا دفاع کیا ہے۔

ارتھر نیوے (۱۸۹۵ء) لکھتا ہے: 'یہ کہا گیا ہے کہ آرغون کو اپنے ماں اور باپ دونوں کی برائیاں ورثہ میں ملی ہیں جب کہ دونوں کی خوبیوں سے یہ محروم ہیں لیکن یہ ان لوگوں کی رائے نہیں ہے جو لداخ کو اچھی طرح سے جانتے ہیں۔ اُن کا یہ کہنا ہے کہ آرغون نے اپنی ذہانت اور قوت سے اچھی پوزیشن حاصل کی ہے'۔

آرغون سے متعلق لداخ کے انگریز وزیر ڈریو کے منفی بیان کی مخالفت کرتا ہوا لیہہ کے برٹش جوائنٹ کمشنر کپتان ایچ ایل رمنرے (۱۸۹۰ء) میں لکھتا ہے کہ وہ ڈریو سے کہیں زیادہ تجربہ رکھتا

ہے۔اس کو یہ کہنے میں کوئی جھجک نہیں ہے کہ ڈریو نے اُنھیں (آرغون) کو بدنام کیا ہے..........
ایک اچھا آرغون لداخ میں بہترین فرد ہے۔وہ بہتر تاجر ہے۔دستور کے مطابق اُن کے پاس زمین نہیں ہے۔اس لیے ان کو اپنی گزر بسر کے لیے اپنی ذہانت سے کام لینا پڑتا ہے۔

اسی طرح ایک انگریز ہملٹن بوور آرغون کے بارے میں لکھتا ہے: 'میرے خیال میں اُنھیں بداخلاق کہنا حق بجانب نہیں ہے جیسا کہ چند مصنفین نے اُنھیں کہا ہے۔'

امپیریل گزیٹر آف انڈیا مرتبہ ۱۹۰۹ء میں اس کی توثیق میں یوں لکھا ہے۔'یہ کی مخلوط نسل (آرغون) لداخ میں غیر تسلی بخش نہیں ہے۔ بہت سارے مسافروں نے آرغون کی اچھی صفات کی تصدیق کی ہے۔'

یوروپیوں نے بطور قلی اور رہبر لداخیوں خاص طور پر آرغون کی بڑی تعریفیں کی ہیں اور یہ اعتراف کیا ہے کہ آرغون رہبروں اور قلیوں کے بغیر اس زمانے میں وسط ایشیا، تبت، پامیر وغیرہ میں سفر اور سروے کرنا مشکل ہے۔لداخی اور بیرونی لداخ کے مرد کی اولاد کو آرغون کہتے ہیں۔

آرغون کے علاوہ کئی لداخی بودھوں نے بھی یوروپی محققوں کے ساتھ کام کیا ہے۔فریڈرک ڈریو، جو لیہہ میں وزیر وزارت (منتظم اعلیٰ) رہا لکھتا ہے۔'اگر لداخیوں کو مناسب وقت اور موقع فراہم کیا جائے تو یہ سیکھنے کا اچھا مادہ رکھتے ہیں۔'

لارڈ ڈینمور نے رایل جیوگرافکل سوسائٹی کے سامنے اپنی مہم کی روداد سناتے ہوئے ان الفاظ میں لداخیوں کو خراج تحسین پیش کیا ہے: 'اس سے پہلے مجھے کبھی ایسے جفاکش، عمدہ اور فرماں بردار آدمیوں کی خدمات حاصل نہیں ہوئیں۔'

ینگ ہاسبنڈ نے گلوان رسول کی کتاب 'سرونٹ آف دی صاحبس (Servant of The Sahibs)' کے پیش لفظ میں لکھا ہے کہ یہ افراد مہم جوئی کے اتنے ہی دلدادہ ہیں جتنے ان کے مالکان ہیں۔

گنپوں کے مذہبی لوازمات اور رومن کیتھولک کی عبادات میں یکسانیت

متعدد سیاحوں نے قدرے حیرت سے یہ لکھا ہے کہ لداخی گنپوں کے مذہبی لوازمات اور روم

کے رومن کیتھولک عیسائی کی عبادات میں گہری مماثلت ہے۔ اُنھوں نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ یہ رسومات نسطوری عیسائیوں نے چین سے لداخ لائے تھے، جہاں سینٹ تھامس نے عیسائیت پھیلائی تھی۔ تاہم لداخی بودھ اسکالر اس مفروضہ کو مسترد کرتے ہیں۔

تجارت

لیہہ وسط ایشیا کا اہم تجارتی مرکز تھا۔ یہاں گرمیوں میں تعینات برٹش جوائنٹ کمشنر تجارتی امور کا افسر اعلیٰ تھا— وہ لداخ کی سرحد پر روسی اور چینی افواج کی نقل وحرکت اور ان حکومتوں کی سیاسی سرگرمیوں پر بھی نظر رکھتا تھا۔

برطانوی ہند سرکار نے انیسویں صدی سے وسط ایشیا سے تجارت کا پورا ریکارڈ رکھا ہے— جو نیشنل آرکائیوز دہلی، جموں وکشمیر سرکار کے محافظ خانے وغیرہ میں محفوظ ہے۔

تجارتی لحاظ سے جب لیہہ کی افادیت تھی تو ان دنوں آج کے روپیہ کی قیمت کے تناسب سے کروڑوں روپے کی تجارت ہوتی تھی۔ اگر چہ لداخی اس تجارت میں براہ راست شریک کار نہیں تھے لیکن کارواں کی آمد پر لداخیوں کو ضروری چیزیں دستیاب ہوتی تھیں۔ الیگزنڈر کیننگھم سمیت متعدد سیاحوں نے انفرادی طور پر کارواں کی آمد کا ذکر کیا ہے۔ تجارتی قافلے پہنچنے پر لیہہ بازار میں بڑی چہل پہل اور مختلف نسلوں اور خطوں کے لوگوں کی ریل پیل رہتی تھی۔ ترک، تبتی، پنجابی، کشمیری، ہماچلی، افغان، اُزبیک، تاجک حتی کہ سائبیریا اور ایشیا کے دور دراز خطوں کے لوگوں کا آنا جانا رہتا تھا۔ یہاں بھانت بھانت کے لوگوں کے ساتھ ہمسایہ ملکوں اور خطوں کے سکّے بھی ملتے تھے۔ ان میں روسی وسط ایشیا، بخارا اور کوکنڈ کے سونے کے سکّے، چین اور نیپال کے چاندی کے ڈلے، رام پور کے تانبے کے سکّے، مغلیہ حکومت کے روپے اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کے نانک شاہی اور گووند شاہی روپے شامل تھے۔ لداخ کا اپنا سکّہ تھا، جو جنؤ کہلاتا تھا۔

نویں صدی کی ایک تاریخی دستاویز 'حدود عالم' میں لکھا ہے کہ تجارت نے لداخ کی مالیات پر اچھا اثر ڈالا ہے۔

پشمینہ

لداخ پشمینہ کے لیے مشہور ہے۔ مقامی پشمینہ کی پیداوار کے علاوہ مغربی تبت کے پشمینہ پر لداخ کو اجارہ داری حاصل تھی۔ لداخ سے پشمینہ کشمیر برآمد ہوتا تھا جہاں اس کی عمدہ شالیں بنتی تھیں۔ مغل حکومت لداخ کے پشمینہ کی قدر و قیمت جانتی تھی۔ مغل بیگمات کشمیر میں بنائی ہوئی شالیں زیب تن کرتی تھیں۔

مغلیہ حکومت کے زوال کے بعد ہند میں انگریز حکومت پشمینہ پر اپنی اجارہ داری قائم کرنا چاہتی تھی۔ انگریز ڈاکٹر مور کرافٹ نے لیہہ میں ۲۱-۱۸۲۰ء میں اپنے قیام کے دوران ایسٹ انڈیا کمپنی کو لداخی پشمینہ فروخت کرنے کے لیے سفارتی طور کوشش کی اور زیادہ داموں کی پیش کش کی۔ کمپنی نے اس سلسلے میں ایک ایجنسی بھی قائم کی تاہم مور کرافٹ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوا۔

۱۸۳۴ء میں وزیر زورآور سنگھ کی لداخ پر فوج کشی کا ایک بڑا سبب پشمینہ پر ڈوگرہ حکومت کی اجارہ داری حاصل کرنا تھی۔

لداخ کی سردی

لداخ کی سردی سب پر عیاں ہے۔ کبھی کبھی سخت سردی کی وجہ سے ڈربے میں مرغ مرغیاں اور گاؤ خانے میں گائیں مری ہیں۔ گرمیوں میں گرمی ہوتی ہے تاہم رات ٹھنڈی ہوتی ہے۔ دن اور رات کے درجہ حرارت میں بڑا فرق ہے۔ اس کی وجہ لداخ کی ریتیلی زمین ہے۔ ریت جلدی گرم اور جلدی ٹھنڈی ہوتی ہے۔ دھوپ کی بڑی اہمیت ہے۔ سورج چند لمحوں کے لیے بادلوں کی اوٹ میں چلا جائے تو سردی لگتی ہے اور اوٹ سے نکلے تو خوش گوار گرمی کا احساس ہوتا ہے۔ سورج کی تعریف میں گیت لکھے گئے ہیں۔ دھوپ چھاؤں کے اس تجربے کو ایک یوروپی نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

Heat there is but it is no hot and cold

there is but it is not cold. One perspires
and shivers at the same time.

یہاں گرمی ہے لیکن گرم موسم نہیں۔ یہاں سردی بھی ہے اور نہیں بھی۔ ایک آدمی یہاں بیک وقت پسینے سے شرابور ہوتا ہے اور سردی سے ٹھٹھرتا ہے۔

آگے وہ لکھتا ہے 'موسم سخت اور ناسازگار ہو بھی لیکن لوگ اچھے ہیں۔ سفر کٹھن ہو لیکن زمین مہمان نواز ہے۔'

لیہہ

لیہہ لداخ کی جان ہے۔ ماضی میں لیہہ آنے والے اکثر سیاحوں نے قصبہ اور اس کے محل کا ضرور ذکر کیا ہے اور کتابوں میں ان کی تصویریں شائع کی ہیں۔

ایک خاتون سیاح جین ڈنکن کے الفاظ میں "لیہہ اونچے سلسلہ کوہ کے دامن میں صحرا میں ایک سبز رنگ کے فیتے کی طرح لگتا ہے۔"

گزیٹر آف کشمیر اینڈ لداخ کہتا ہے: 'دلکش اور جاذب نظر مناظر کے شائقین کے لیے لیہہ میں دلکشی کا وافر سامان ہے۔'

۱۹۳۰ء میں لداخ آنے والی ایک امریکی خاتون ہنیر تا سینڈ اپنا مشاہدہ یوں بیان کرتی ہے 'لیہہ کے لوگوں کی آنکھوں میں خوشی جھلکتی ہے جنھیں دیکھ کر ناچ اور قہقہے کا گمان ہوتا ہے۔'

میجر بروس کے مطابق۔ "گرمیوں میں ہندوستان میں لیہہ جیسے دل خوش کن مقام معدودے چند ہیں۔'

ایک اطالوی محقق ڈاکٹر فلپی نے پچھلی صدی کے شروع میں لیہہ سے متعلق اپنا تاثر یوں دیا ہے۔ 'سردیوں میں بھی خوابیدہ اور اُداس اداس سکردو کے مقابلے میں لیہہ میں زیادہ ہماہمی اور گہما گہمی رہتی ہے۔'

دوسری جگہ فلپی رقم طراز ہے: 'لیہہ ایک اصلی دارالخلافہ ہے اور چھوٹا سا Cosmopolitan (عالمی شہر) لیہہ دُنیا کے مرکز میں ہے۔'

ارتھر نیوے ۱۸۸۲ء لکھتا ہے: 'لیہہ ایک نمایاں شہر ہے۔ یہ آریاؤں اور منگولوں کی ملن کی جگہ ہے۔'

ایک اور مشاہد کو لیہہ کی خاموش، دُھلی دُھلی فضا دیکھ کر شیکسپیئر کے اشعار یاد آئے۔'

لیہہ کی سبزیوں کی بھی بڑی تعریف کی گئی ہے مسز کرمپ نے یہاں تک لکھا ہے کہ لیہہ کی سبزیاں مشرقی ملکوں میں سب سے اچھی ہیں۔'

۱۸۲۰ء میں مور کرافٹ جب لیہہ آیا تو فصیل کے باہر چند مکانات بن چکے تھے البتہ فصیل کی حالت ٹھیک تھی۔

لیہہ محل

پہاڑی پر واقع محل لیہہ قصبہ کی شان ہے اور اس کے حسن کو دوبالا کرتا ہے۔ مور کرافٹ کا ساتھی ٹربیک پہلا آدمی تھا، جس نے محل کا خاکہ بنایا۔ اس خاکے میں محل کے بائیں طرف دو بلند عمارتیں نظر آتی ہیں۔ یہ عمارتیں کلون (وزیر اعظم) کی رہائش گاہ، یونیورسٹی اور روپشو کے نمبردار کا محل بتائی جاتی ہیں۔ موخر الذکر کی بہن کی شادی راجہ سینگے نمگیل سے ہوئی تھی جس نے محل تعمیر کیا تھا۔ روایت کے مطابق محل ۱۶۲۰ء میں تعمیر ہوا تھا اور تین سال میں مکمل ہوا تھا۔ لہاسہ کا پوتالا محل اس کے بعد تعمیر ہوا۔

۱۸۹۴ء میں ایک انگریز ایڈر نے لکھا ہے: 'لیہہ محل قدیم مصر کا مندر Pylon کے مشابہ ہے۔'

ایک روسی سیاح فلپ یافرے موف محل کو چھوٹا پوتالا کہتا ہے۔ وہ ۱۷۷۴ء میں لداخ آیا تھا۔

لداخ کے محلات اور قلعوں کے ایک مصنف اور ماہر نیل ہاورڈ نے محل کے فن تعمیر پر ان الفاظ میں تبصرہ کیا ہے: 'محل کی متناسب دل آویز سادگی، نہایت ہی کاریگرانہ عمدگی، اس کی دیواروں کا متوازن اُبھراؤ اسے ایک دل نشین وقار بخشتا ہے، جس کی مثال پوتالا سمیت تبت کی کسی اور عمارت میں نہیں ملتی۔'

نیل ہاورڈ کے مطابق محل کی شان اس کی بیرونی ڈیوڑھی سے ہے جو لداخی آرٹ کا شاہ کار ہے اور اب تک موجود ہے۔ ڈیوڑھی کے اوپر لکڑی کا ایک شیر بنا ہے، جس کو ماضی میں اندر اور باہر کیا جاسکتا تھا۔ دو اور شیر تھے۔ تیسرے شیر کا سر نہیں ہے جسے محل کے اندر اور باہر کیا جاسکتا ہے۔ حال میں محکمہ آثار قدیمہ نے، جس نے محل کو ایک تاریخی یادگار کے طور پر اپنی تحویل میں لیا ہے، دو چوبی شیروں کی تجدید کی ہے۔ بقول نیل ہاورڈ ڈیوڑھی کا سائبان سترہویں صدی کی تبتی کاریگری کا نمونہ ہے۔

نیل ہاورڈ لکھتا ہے: 'محل کی دیوار بالائی سمت بتدریج اندر کی طرف چلی گئی ہے۔ بنیاد پر اس کی موٹائی دو میٹر اور اوپر آدھا میٹر ہے۔ ایسے میں محل کا کوئی حصہ منہدم ہونے کی صورت میں اس کے دامن میں واقع مکانات کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔'

محل کے گرد دوہری دفاعی دیوار تھی۔ انگریز سیاح وین نے یہ دیواریں دیکھی تھیں۔ ڈوگروں کے حملے میں دفاعی ڈھانچہ تباہ ہوا تھا۔

یہ محل سماجی اور ثقافتی سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ ڈوگرہ دور حکومت میں روایات کم و بیش قائم رہیں۔ پادری سمائل ریباک ۱۸۹۴ء سے ۱۹۱۳ء تک تقریباً اُنیس سال لداخ میں رہے۔ وہ اپنی کتاب Broghpa Nomgyal, the life of a Villager میں اپنے مشاہدے کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں: 'لوسر (سال نو) پر گیالپو (لداخی راجہ) اونچے خاندانوں کے افراد کو محل میں مدعو کرتے ہیں۔ کلون[1] (وزیر اعظم)، لونپو[2] (گورنر) اور معززین راجہ کی پیشوائی کے لیے شقوق گاؤں جاتے ہیں اور وہاں سے جلوس کی صورت میں گھوڑوں پر لیہہ آتے ہیں۔ لیہہ اور گاؤں سے آنے والے لوگ لیہہ بازار میں انتظار کرتے ہیں۔ جلوس بازار میں پہنچتا ہے اور لوگ بڑے احترام سے راجہ کو سلام کرتے ہیں اور سواریوں کے ساتھ راجہ محل میں جاتا ہے۔ ان چند دنوں کے دوران گیالپو لداخیوں کے لیے سچ مچ ماضی کا حکمراں ہوتا ہے، جب اس کے پاس اختیارات اور حکومت تھی۔' ایک برٹش جوائنٹ کمشنر نے راجہ کی اس نمائشی شان و شوکت پر اعتراض کیا تھا۔

---

[1] اور [2] سابق کلون اور لونپو کی اولاد کو آج بھی کلون اور لونپو کہا جاتا ہے۔

سال کا زیادہ حصہ محل خالی اور ویران رہتا تھا۔ بقول ریباک۔ تب محل میں الو چمگادڑیں اور چوہے ڈیرہ جماتے ہیں۔

لداخی آرٹ

مغربی آرٹ ماہرین کا خیال ہے کہ لداخ کی دیواری مصوری اور نقاشی پر مختلف ملکوں، خطوں اور آرٹ اسکولوں کا اثر پڑا ہے۔ ان میں وسط ایشیا، نیپال، ایران، تبت، کشمیر، چین اور آرٹ اسکولوں میں گندھارا، بنگال اور بہار کے پالا، سینا اور مغل آرٹ کے اثرات ہیں۔ لداخ نے بالواسطہ یا بلاواسطہ یہ اثرات قبول کیے ہیں۔ خاص کر تبت اور کشمیر کا اثر نمایاں ہے۔ ان دو خطوں نے بھی مختلف ممالک اور آرٹ کے مکاتیب سے استفادہ کیا تھا۔

چارلس گینوڈ نے اپنی کتاب Budhist wall painting of Laddakh میں لکھا ہے:
'لداخ کی مصوری کے اسٹائل کو لداخی کہنے کی گنجائش نہیں ہے۔ یہاں کی مصوری پر بالواسطہ اور بلاواسطہ اثر پڑا ہے۔ کئی دفعہ دور دراز خطوں سے لداخ کی مصوری متاثر ہوئی ہے،۔ تاہم چارلس گینوڈ یہ بھی لکھتا ہے کہ لداخ میں آرٹ کا ارتقا بالکل تبت کے طرز پر ہوا اور علاقائی اثر کی وجہ سے لداخ کا آرٹ تبت سے کچھ جداگانہ لگتا ہے۔ اس لیے اس میں اپنی انفرادیت ہے۔ گینوڈ کا خیال ہے کہ لداخی مصوری کی اسٹائل نہایت ہی پیچیدہ ہے۔ خاص کر تبت کے آرٹ کا اثر لینے سے پہلے اس میں بڑی پیچیدگی تھی۔

گینوڈ نے یہ بھی لکھا ہے کہ لداخ کی چند دیواری تصاویر پر مغلوں کا گہرا اثر نظر آتا ہے۔ خاص کرا لچی وہار میں اویلوکیتشورا کے چوغا اور تارا کے ہم جلیسوں میں یہ اثر نمایاں ہے۔

ڈیوڈ ایل سنیل گرو اور Tedeusz Skorupski اپنی مشترکہ تصنیف Cultural Heritage of Laddakh میں لکھتے ہیں۔ 'کشمیر میں اسلام آنے کے بعد لداخ اور اس کے آرٹ پر مغل آرٹ کا اثر رہا۔ لداخ کے راجاؤں نے مغلیہ طرز کا لباس زیب تن کیا۔'

ای کلیم بورگ سالٹر رقم طراز ہے۔ 'صحرائے گوبی کے شہر کاراکھوٹو اور لداخ کے ایک گپنہ کی دیواری مصوری میں دونوں خطوں کے مابین ایک ہزار میل کا فاصلہ ہونے کے باوجود گہری یکسانیت ہے۔ دونوں خطوں کے درمیان بلند پہاڑ اور صحرا حائل ہیں، تاہم ثقافتی رشتے میں مماثلت کی وجہ ٹرانس ہمالیائی شاہراہیں ہیں۔ ان کی ثقافت یکساں نظریہ اور معاشی نظام کی تابع ہے۔'

گونا گوں اثرات کے باوجود لداخی آرٹ میں اپنی انفرادیت ہے۔ لداخ کے نامور مصور زوپا پلے کے فن میں یہ ندرت اور جدت نظر آتی ہے جس کا اعتراف لداخ کے موجودہ سرکردہ آرٹسٹ کرتے ہیں۔

صرف آرٹ ہی نہیں بلکہ زندگی کے مختلف شعبوں میں لداخ نے اپنی شناخت قائم کی ہے۔ اس ضمن میں ایک سیاح مارکو پالیس نے گزشتہ صدی کی تیس کی دہائی میں لکھا تھا: 'لداخ کو اگرچہ کلچر کے اہم گہواروں میں شمار نہیں کیا جاتا لیکن یہاں کے دیہات اور لیہہ میں سفر کرتے ہوئے ایک خالص اور کھری تہذیب کے وجود کا احساس ہوتا ہے جو ہم یوروپ کے بڑے حصے میں نہیں پاتے۔'

پھولوں سے لداخیوں کا لگاؤ

ڈریو (۱۸۶۲ء) نازاروف (۱۹۳۵ء) اور ہیبر (۱۹۰۲ء) سمیت متعدد سیاحوں اور مشاہدوں نے لکھا ہے کہ لداخی پھولوں کے بڑے شوقین ہیں۔ ہیبر لکھتے ہیں۔ 'لداخی صندوقوں، چھتوں اور جھروکوں پر پھول رکھتے ہیں۔ کپڑے پر بٹن ہول نہ ہونے کی وجہ سے کان کی لو سے پھول لگاتے ہیں۔' ٹوپی کو پھولوں سے سجانا بھی عام دستور تھا، لیکن آج کل لداخ کے درد قبیلے کے بغیر کوئی اس طرح پھول استعمال نہیں کرتا البتہ باغیچوں اور گملوں میں پھول اُگانے کا ذوق لوگوں میں بڑھا ہے۔

ایک غیر لداخی مشاہد نے لکھا ہے کہ لداخی رنگ برنگے پھولوں کی معرفت حسب ضرورت پیغام دیتے ہیں۔ کوئی کسی کو پیلے رنگ کے پھولوں کا گلدستہ بھیجے تو اس کا مطلب یہ لیا جاتا ہے کہ اس کو وہ سنہرے سونے کی طرح عزیز یا محبوب سمجھتا ہے۔ اگر سرخ رنگ کے پھول بھیجیں تو یہ لینے والے کو اس

کے ظلم وستم کی یاد دہانی کرانے کی علامت ہیں۔ نیلے رنگ کا پھول محبت کا مظہر ہے۔ اگر پھولوں کے ساتھ ایک جلی لکڑی ہو تو یہ وصول کنندہ کی بے وفائی کو اُجاگر کرتی ہے۔ ایک دل جلا لڑکا یا لڑکی پتا بھیجے تو یہ بھیجنے والے کے دُکھی دل کی عکاسی کرتا ہے۔

شخصی حکومت کے مظالم

متعدد مخلص اور دیانت دار اہلکاروں اور سیلانیوں نے شخصی دورِ حکومت میں لداخیوں کے مصائب کا ذکر کیا ہے۔ انڈریلیتھ آدمز ۱۸۵۲ء میں لداخ آیا تھا۔ وہ اپنا مشاہدہ یوں بیان کرتا ہے۔ 'جب سے لداخ میں اس کے جائز حکمراں نہیں رہے، ظلم اور بے اعتنائی کی وجہ سے خطے کی حالت افسوس ناک حد تک خراب ہوگئی ہے۔'

۱۸۵۵ء میں پادری ولیہلم ہیڈے اور ایڈورڈ پاگیل نے لداخ کا سفر کیا۔ ان کو یہ معلوم ہوا کہ بہت سارے لوگ گلاب سنگھ کے کارندوں کے ٹیکسوں سے نالاں ہو کر لداخ سے برطانوی ہند کے علاقوں میں فرار ہوئے تھے۔

کسانوں کے علاوہ تاجروں سے بھی عجب عجب نام سے ٹیکس لیے جاتے تھے۔ یہ پیسہ بٹورنے کا حد سے گرا ہوا چٹور پن تھا۔ کسان زمینداروں اور سود خوروں کے رحم وکرم پر تھے۔ مارٹین بیک نے لکھا ہے۔ کسان خادقس (ریشمی رومال) اور صراحی میں چھنگ لے کر سود پر ادھار اناج مانگنے زمیندار کے پاس جاتے تھے۔ تین چار ماہ بعد ادا نہ کر پائے تو سود ۵۰ فی صد بڑھ جاتا تھا۔ نئ فصل پانے سے پہلے غریب کسان اَن پکے اناج کے خوشے کاٹ کر کھاتے تھے۔ وہ کہتے میں پچھلے نو دس روز سے فاقہ کشی کر رہا ہوں۔' غریب لوگ امیروں کے لیے غلام مزدور Bonded Labour کی طرح کام کرتے تھے۔

بیگار کا نظام بہت سخت تھا۔ سرکار کسانوں سے مفت میں نقل وحمل کا کام لیتی تھی۔ حتی کہ لیہہ ۔ سری نگر کے درمیان ڈاک رسانی بھی بیگار میں شامل کی تھی اور ہرکاروں کو مشاہرہ نہیں دیا جاتا تھا۔

مور کرافٹ نے لکھا ہے کہ راجاؤں کے دورِ حکومت میں غریب کسانوں کو مزدوری کے لیے

سرکار اجرت نہیں دیتی تھی۔ کیننگھم نے بھی لکھا ہے کہ راجہ حکام، سرکاری تاجران اور گنپوں کو بار بردار جانور مفت فراہم کرنا پڑتا تھا۔

دو برٹش جوائنٹ کمشنر کپتان ایچ ایل رمزے (۹۱-۱۸۸۵ء) اور آر ایل کے نیون (۱۸۹۹ء) نے بیگار ختم کرنے کے لیے مہاراجہ کو لکھا لیکن مہاراجہ کی سرکار ٹال مٹول سے کام لینے لگی۔ آخر کار کشمیر کے ریزیڈنٹ سر ایڈلبرٹ تلبوٹ نے حکومت ہند کو لکھا کہ قلیوں کو ان کی محنت کا کچھ معاوضہ ملنا چاہیے۔ تلبوٹ اور دو برٹش جوائنٹ کمشنروں کی کوششوں سے لوپچق مشن کے لیے بار بردار جانوروں کی فراہمی کی اُجرت دینے پر مہاراجہ کی حکومت مجبور ہوگئی۔ اس سفارتی اور تجارتی مشن کے لیے ۲۶۰ بار بردار جانوروں کی ضرورت پڑتی تھی۔

ایک کشمیری شری دھر کول ڈولو ۱۹۳۳ء اور ۱۹۴۸ء کے درمیان لداخ میں بارہ سال تعلیمی افسر رہے۔ اُنھوں نے اپنی کتاب Ladakh Through the Ages میں لکھا ہے کہ لداخ کے زنسکار علاقے میں برا یا اچھا سال علاقے میں دورے پر آنے والے ملازموں کی تعداد پر پرکھا جاتا تھا۔ جس سال ملازم کم آتے، وہ سال اچھا مانا جاتا تھا۔ ملازم لوگوں کو ہراساں کرتے اور پیسہ بٹورتے تھے۔ کسی کا باپ مرجاتا تو بیوی کے خلاف الزام لگایا جاتا کہ زہر دے کر اس نے شوہر کو مار دیا ہے اور ہتھکڑی پہنا کر گرفتار لائی جاتی تھی۔ رشتہ داروں کو بھی جرم میں ملوث کیا جاتا تھا۔ جب رشوت کی رقم سے ان کی مٹھی بھر جاتی تو ان کو رہا کیا جاتا تھا۔

رشوت ستانی اور بد عنوانی کے حوالے سے ایک وزیر (منتظم اعلیٰ) سے متعلق اُنھوں نے لکھا ہے۔ ’سری نگر سے جب تبدیل ہو کر وہ لیہہ آیا تو اپنے خاندان سمیت ۱۲ گھوڑے درکار تھے۔ چند ماہ بعد جب وہ لداخ کے سرمائی صدر مقام سکردو گیا تو ۲۴ گھوڑوں پر صرف اس کا ذاتی سامان تھا۔ دفتری ریکارڈ اور سواری کے لیے بارہ گھوڑے لیے۔ خاندان کے افراد کی نقل و حمل کے لیے سات پالکیاں بروئے کار لائی گئیں جن کے لیے ۱۰۰ سے ۳۰۰ قلی درکار تھے۔‘

لیہہ میں تعینات ایک تحصیلدار ایل سپرو نے لداخ کے سوخوروں کو شیکسپیئر کے ایک ڈرامہ

کے بدنام زمانہ کیریکٹر شائیلاک اور چارلس ڈکنز کے ناول ڈیوڈ کوپر فیلڈ کے ایک کردار میکابر سے تشبیہ دی ہے۔ سپرو لکھتا ہے کہ حکومت اناج پر ۲۵ فیصد سود لیتی تھی۔اس کے زمانے میں یہ گھٹا کر ۱۲ فیصد اور بعد میں ۶ فی صد کیا گیا۔ سپرو ۱۹۴۰ء میں لیہہ میں تحصیلدار رہا۔ اُنھوں نے معاشی سروے کیا۔ سپرو رقم طراز ہے: 'لوگ ہمیشہ قرضوں میں دبے رہتے تھے اور حکومت اور سود خوروں کے قرضوں کے بوجھ سے ان کی زندگی اجیرن بن گئی تھی'۔

بیگار اور سود خوری کا سسٹم ملک کو آزادی ملنے تک جاری رہا۔

لہالہامو (Oracles) اور ''لو''

لہالہامو یا (Oracles) سے غیر لداخیوں خاص کر مغربی سیاحوں کو گہری دلچسپی ہے۔ روایت کے مطابق کسی کسی مرد یا عورت کے دل و دماغ پر کوئی دیوتا یا دیوی قابض ہوتی ہے اور وہ مرد اور عورت دیوتا یا دیوی کی پراسرار اور غیبی طاقت حاصل کرتے ہیں۔ایسے میں ان پر وجدانی کیفیت طاری ہوتی ہے اور اسی عالم میں فرمائش پر وہ انفرادی اور اجتماعی معاملات میں پیشین گوئی کرتے ہیں۔ عقیدت مندوں کے مطابق اس کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ اس کے نہیں بلکہ دیوی یا دیوتا کے ہوتے ہیں۔کئی یوروپیوں نے لہالہامو پر تحقیقی کام کیا ہے۔ایک انگریز خاتون صوفی ڈے نے ان پر اپنا تھیس لکھا ہے۔ ۱۹۸۱ء اور ۱۹۸۳ء میں سولہ ماہ کے دوران صوفی ڈے نے لداخ میں ۲۱ لہالہامو یا oracles کی نشاندہی کی ہے۔ان میں ۱۲ مرد اور نو عورتیں تھیں۔ دو تہائی لہالہامو نے اپنے ماں باپ یا آبا و اجداد سے یہ ''غیبی'' طاقت ورثہ میں پائی تھی۔ایک لہا مسلم، ایک ہندو سپاہی اور ایک بھکاری تھا۔ ایک نوآموز لہا کو ایک کہنہ مشق لہا تربیت دیتا ہے۔ گاؤں کے حقیقی لہالہامو کی شناخت اور تصدیق بودھ خانقاہ کرتی ہے۔اس ضمن میں کئی لوازمات پورے کرنے ہوتے ہیں۔صوفی ڈے نے ایک عیسائی عورت لہامو کا ذکر کیا ہے۔اس کا دعویٰ تھا کہ جبرئیل امین فرشتہ اس پر قابض ہوتا ہے۔ایک مرتبہ اس نے مدہوشی اور وجد کے عالم میں اپنے شوہر سے کہا تھا کہ اُنھیں کوئی

بچہ نصیب نہیں ہوگا۔ تب میاں بیوی نے ایک بچے کو گود لیا۔ ایک سال بعد وہ عورت حاملہ ہوگئی۔ تب سے وہ وجد میں نہیں جاتی۔ لوگ باگ کہتے ہیں فرشتہ جبرئیل نہیں بلکہ ایک شیطان اس کے بدن میں حلول ہوا تھا۔

کئی دفعہ لہالہاموا ایک پتلی نلکی سے مریض کی بیماری کو چوس لیتے ہیں یا کسی مویشی نے سوئی یا میخ نگل لی ہو تو منہ سے چوس کر نکالتے ہیں۔ تاہم لہا کی کرامات سے متعلق لوگوں میں دورائیں ہیں۔

کئی گپنوں کے اپنے لہا ہیں، جو گپنہ کے تیوہار پر ظاہر ہوتے ہیں۔ ماٹھو گپنہ کے لہا کی جوڑی آنکھوں پر پٹی باندھ کر گپنہ کی بلند چھت کے چھجے پر دوڑتی ہے۔ یہ مقامی، قومی بلکہ بین الاقوامی سطح کے مسائل سے متعلق پیشین گوئیاں کرتے ہیں۔ وجد میں آنے سے پہلے کچھ مدت کے لیے مراقبہ اور گیان دھیان کرتے ہیں۔

'لُو' پر بھی لداخیوں کو اعتقاد رہا ہے، 'لو' ایک تخیلی (Spirit) ہمزاد ہے۔ یہ چشمہ اور زمین دونوں میں رہتا ہے۔ رمزے، ہیبر وغیرہ نے اپنی کتابوں میں 'لو' کا ذکر کیا ہے۔ ہیبر لکھتے ہیں کہ لداخی 'لو' سے خوف زدہ ہیں۔ تاریخ بتاتی ہے کہ 'لو' کا نظریہ یون دھرم کی دین ہے۔ نئی روشنی کے ساتھ یہ نظریہ فرسودہ ہوا ہے۔ ماضی میں لداخ میں جن، بھوت پریت، آسیب، بدرُوح وغیرہ کا بڑا چرچا تھا جن کو اکّا دُکّا غیر لداخی ریسرچ اسکالروں نے نوٹ کیا ہے۔

لداخ اور سیاح

ڈروتھی ووڈمین نے Himaliyan Frontiers میں لکھا ہے:

''ایسٹ انڈیا کمپنی لداخ کو ایک قسم کا Eldorado سمجھتی تھی۔ Eldorado ایک ایسا تخیلی دیش ہے جہاں بکثرت سونا ملتا ہے یا جہاں دولت آسانی سے پیدا کی جاسکتی ہے۔'

لداخ سونا اور دولت پیدا کرنے والا دیش تو نہیں ہے۔ غالباً روس کی توسیع پسند پالیسی اور وسط ایشیا سے تجارت کی وجہ سے برطانوی ہند کو لداخ کی جغرافیائی افادیت کا احساس ہوا ہوگا۔ اس کے

ساتھ بطور ایک پسندیدہ سیاحتی منزل اور پراسرار ٹرانس ہمالیائی خطے کی حیثیت سے لداخ کو اہمیت ملی اور ایک پہلو سے مہم جو اور متجسس (Explorers) اور محققوں کو خطے سے ذوق نظارہ ملا اور دعوت فکر بھی ملی۔

آج بھی لداخ سے دلچسپی دکھانے والوں کی کمی نہیں ہے۔ انٹرنیشنل ایسوسی ایشن فار لداخ اسٹڈیز (IALS) لداخ کی مقبولیت کی علامت ہے۔ پروفیسر ہنری اوسمسٹن IALS کے بانی ہیں۔ ان کی لداخ روانگی قدرے اتفاق سے ہوئی۔ وہ برسٹل یونیورسٹی میں پڑھاتے تھے۔ ایک دن اُنھوں نے اپنے ایک رفیق کار پروفیسر جان کروک کو تبتی لپی میں کچھ لکھتے دیکھا۔ ہنری اوسمسٹن کو تجسس ہوا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ جان نے ۱۹۷۷ء میں لداخ کے زنسکار علاقے کا سفر کیا تھا اور وہ برسٹل کے کثیر الجہات اسکالروں اور ہندوستان کے رفقا کی ایک ٹیم کے ہمراہ دوبارہ زنسکار جانا چاہتا تھا۔ ہنری اس ٹیم میں بطور زرعی ماہر شامل ہوا۔ ہنری اور اس کے رفقا نے ۱۹۸۰ء اور ۱۹۸۱ء کے موسم زنسکار کے سروے میں گزارے۔ ۱۹۹۶ء میں ہنری اور جون نے اپنی تحقیق کی اساس پر Himaliyan Buddhist Villages کے نام سے ایک ضخیم کتاب تصنیف کی۔ اس کتاب میں ہنری نے خاص کر geology (ارضیات)، زراعت، تبتی کلینڈر (جنتری) اوزان، پیمائشی پیمانے اور ماحولیات سے پر مضامین لکھے ہیں۔

۱۹۸۱ء میں لداخ سے دلچسپی رکھنے والے دو جرمن اسکالروں نے جرمنی کے شہر Konstanz میں لداخ پر پہلا سمینار منعقد کیا۔ اس کے تین سال بعد ۱۹۸۵ء میں فرانس کے شہر پاؤ میں سمینار ہوا جہاں ہنری نے زنسکار میں کھیتی باڑی کے موضوع پر ایک مقالہ پیش کیا۔ تیسری کانفرنس تب مشرقی جرمنی کے شہر Herrnhut میں ہوئی جہاں ایک میوزیم میں لداخ کے نوادرات اور آرٹ کے نمونے رکھے گئے ہیں۔ اس کانفرنس میں ہنری اوسمسٹن نے IALS کے قیام کی تجویز پیش کی جسے بالاتفاق رائے خوشی خوشی منظور کرلیا گیا۔ تب سے ہر تیسرے سال لداخ سمیت یورپ کے مختلف شہروں میں سمینار / کانفرنسیں منعقد ہوتی رہی ہیں۔ ہنری نے ۲۰۰۳ء میں لیہہ میں آخری مرتبہ کانفرنس میں شمولیت کی جب وہ ۸۰ سال کے تھے۔ ۲۷ جون ۲۰۰۶ء کو ہنری اوسمسٹن کا ۸۵ سال کی عمر میں انتقال ہوا۔ ہنری نے جو شمع جلائی، اس کو جان بیرے، مارٹین اور فرانچیسکا نے روشن رکھا ہے۔

مختلف زمانے میں لداخ آنے والے سیاحوں اور محققوں میں کئیوں نے سفرنامے، یادداشتیں اور کتابیں لکھی ہیں۔ ہر سیاح کو کہنے کے لیے کوئی نہ کوئی نئی بات ہے۔ہم ذیل میں ان کے اقتباسات پیش کرتے ہیں جن سے اس مخصوص دور کے سماجی، سیاسی، تاریخی اور تمدنی حالات کا پتہ چلتا ہے۔ جہاں ایک ریسرچ اسکالر کے لیے ان میں قیمتی تاریخی مواد ہے، وہاں عام قارئین کے لیے ان میں دلچسپی اور تفریح طبع کا سامان ہے۔

روایت اور تاریخی ریکارڈ کے مطابق شروع میں لداخ آنے والے اکثر مبلغین اور پرچارک تھے۔

ارہٹ نیما گوں

پہلے پہل لداخ آنے والوں میں ایک نام ارہٹ نیما گوں کالیا جاتا ہے۔وہ بدھ کے سرکردہ ارہٹ انندا کے شاگرد تھے۔وہ لیہہ سے ۱۲۶ کلومیٹر دور ایک مقام پر آئے تھے جہاں اُنھوں نے پیشین گوئی کی تھی کہ اس جگہ ایک گنپہ بنے گا۔چنانچہ بعد میں اس جگہ ایک گنپہ تعمیر ہوا جو لداخ میں لامایورو گنپہ کے نام سے مشہور ہے۔ایک ہزار سال سے زیادہ پرانا لامایورو گنپہ لداخ کا ایک قدیم اور بڑا گنپہ ہے۔

گروپدما سمبھاوا

۷۲۷ء میں ایک چینی یاتری لداخ سے گزرا تھا، جس کا ذکر اوپر آیا ہے۔آٹھویں صدی میں گروپدما سمبھاوا لداخ آئے۔وہ بدھ مت کے بڑے عالم اور تانترک کے استاد تھے۔سوات ان کا وطن تھا۔لداخ اور تبت میں ان کو بدھ ثانی کہا جاتا ہے اور گرورینگبو چھے کے لقب سے یاد کیے جاتے ہیں۔ان کی مورتیاں اور تصویریں لداخ اور تبت کے اکثر گنپوں میں بنی ہیں۔وہ تبت بھی گئے تھے جہاں ان کے پرچار سے بدھ مت کو فروغ ملا۔لداخ میں وہ گھپائیں آج بھی موجود ہیں، جہاں اُنھوں نے گیان دھیان کیا تھا۔

اُنھوں نے ننگما پا فرقہ کی بنیاد ڈالی تھی۔لداخ کا ٹق تق گنپہ اسی فرقہ سے تعلق رکھتا ہے۔کئی دفعہ ان کو فوق البشر قرار دیا گیا ہے اور مابعد الطبعیاتی کرامات ان سے منسوب کی گئی ہیں۔

ایک تبتی کتاب پق سم جوزنگ کے مطابق دسویں صدی سے پہلے بہت سارے کشمیری پنڈت لداخ آئے اور سنسکرت سے بدھ مت کی کتابوں کا کلاسیکل لداخی میں ترجمہ کیا۔

کنشک نے پہلی صدی میں پانچ سو کشمیری عالم بدھ دھرم کے پرچار کے لیے تبت اور لداخ بھیجے۔

رنچن زنگپو

لوڑاوا رنچن زنگپو کی لداخ آمد سے خطے میں بدھ مت کو فروغ ملا۔وہ مغربی تبت کے کوگے کے رہنے والے تھے۔۹۷۵ء یا ۹۷۶ء میں مغربی تبت کے راجہ ایشے اود نے ان کو مذہبی تعلیم کے حصول کے لیے ۲۱ طلبا کے ہمراہ کشمیر بھیجا۔اپنی غیر معمولی ذہانت سے رنچن زنگپو نے سنسکرت میں مہارت حاصل کی اور مذہب، فلسفہ، نجوم، طب، یوگا وغیرہ میں ید طولیٰ حاصل کیا۔اُنھوں نے سنسکرت سے سینکڑوں کتابوں کا کلاسیکل تبتی یا لداخی میں ترجمہ کیا۔

وہ تین مرتبہ کشمیر گئے اور روایت کے مطابق تین مرتبہ لداخ آئے۔وہ کشمیر سے اپنے ہمراہ کاریگر، معمار اور مصور لداخ لائے اور لداخ سے مغربی تبت تک ۱۰۸ وہار اور متعدد استوپا تعمیر کیے جن میں لداخ میں الچی وہار، سپتی میں تابو وہار اور مغربی تبت میں تھولنگ وہار اب تک لگ بھگ بہتر حالت میں ہیں۔یہ تینوں وہار عالمی سطح پر بطور ثقافتی ورثہ اور تاریخی یادگار مشہور ہیں۔ہر سال ہزاروں سیاح ملک اور بیرون ملک سے اُنھیں دیکھنے آتے ہیں۔

رنچن زنگپو لداخ میں نیر ما یونیورسٹی میں پرنسپل رہے۔اس میں ایک ہزار طلبا تھے۔اس یونیورسٹی کو ۹۹۶ء میں راجہ ایشے اود نے قائم کیا تھا۔رنچن زنگپو نے لداخ کو اچھی نظام علاج اور جیوتش سے روشناس کیا۔ان کی طب کی کتابیں لداخی حکیموں کے نصاب میں ہیں۔

ابودولف

ابودولف عربی تھا اور دسویں صدی میں مدینہ کے پاس رہتا تھا۔ وہ بخارا گیا جہاں سے تبت کے راستے کشمیر پہنچا۔ لداخ کو ماضی میں مورخوں نے تبت سے موسوم کیا ہے۔

کشمیر سے وہ افغانستان پہنچا جہاں سے وہ وطن لوٹا۔ ابودولف کا سفرنامہ ''عجائب البلدان'' کے نام سے شائع ہوا ہے۔

ناروپا

معروف رشی ناروپا گیارہویں صدی میں لداخ آئے اور لامایورو میں ایک گپھا میں اُنھوں نے مراقبہ کیا۔ یہ گپھا آج بھی موجود ہے۔ ایک روایت یہ ہے کہ اُنھوں نے لامایورو گنپہ کی بنیاد ڈالی تھی اور ڈیگونگ کرگیوتپا فرقہ مروج کیا۔ ناروپا، رینچن زنگپو، تیلوپا اور تبتی جوگی میلاریپا سبھی ہم عصر تھے۔ ناروپا ۱۱۰۰ء میں فوت ہوئے۔

خسروپ اور گیان پا

خسروپ ارگیان پا تبت کے ایک بڑے مذہبی عالم تھے۔ تیرہویں صدی کے دوسرے نصف کے دوران وہ لداخ آئے اور راج گرو بنے۔ ان دنوں لداخ کا حکمران لھاچھن ونگھیم تھا۔ وہ درد قبیلہ سے تعلق رکھتا تھا۔ تب لداخ عارضی طور پر تبتی نژاد کے نمگیل خاندان کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔

اُرگیان پا کا اصلی نام رینچن سینگے پال تھا تاہم وادی سوات کے ایک مقام اُودی یانا کی نسبت سے، جس کو تبتیوں اور لداخیوں نے اُرگیان نام رکھا تھا، ان کا نام بھی اُرگیان پا پڑا تھا۔ پا کا مطلب رہنے والا ہے یعنی اُرگیان کا باشندہ۔ مہایان بدھ مت میں دو مقامات اُودیینا اور شمبھالا دو اہم مقامات ہیں۔ اول الذکر کی تاریخی طور پر شناخت ہوئی ہے لیکن شمبھالا کی حیثیت دیومالائی نوعیت کی ہے۔ سوات میں گرو پدما سمبھاوا کا جنم ہوا تھا۔ گرو کی نسبت سے بھی سوات کو ایک تیرتھ کی حیثیت ملی

ہے۔اس لیے بہت سارے تبتی غالباً لداخی بھی سوات یاترا پر جاتے تھے۔ارگیان پا نے ۱۲۶۰ء میں سوات کا سفر کیا تھا اور سوات سے لداخ آئے تھے۔اپنے سفرنامہ میں اُنھوں نے ہزارہ، کشمیر، امرتسر، جالندھر اور مالیرکوٹلہ وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ان دنوں ہندوستان میں بدھ مت تنزل کی راہ پر تھا۔

اُرگیان پا کا جنم ۱۲۳۰ء میں ہوا تھا۔تبت میں وہ ایک سدھار گوت ستن پا کے شاگرد تھے جو کرگیوت ڈوگپا مکتبہ خیال کے بڑے عالم تھے۔سولھویں صدی کے اس فرقہ کے ایک عالم پدما قرپو نے ان کی مختصر سوانح حیات لکھی ہے۔

میر سید علی ہمدانیؒ

میر سید علی ہمدانی ۱۳۸۱ یا ۱۳۸۲ء میں لداخ آئے۔روایت کے مطابق لیہہ کے پاس شے میں اُنھوں نے ایک مسجد تعمیر کی جسے آج ایک آستانہ کا درجہ حاصل ہے۔لیہہ میں جہاں جامع مسجد ہے، روایات کے مطابق اُنھوں نے اس جگہ قیام کیا تھا اور عبادت کی تھی۔ان کی یاد میں اس جگہ ایک حجرہ نما ڈھانچہ بنا ہے۔ان کی لکھی ہوئی اوراد فاتحہ کا ورد آج بھی لداخ کی بہت سی مساجد میں کیا جاتا ہے۔

اُنھوں نے لداخ میں اپنے قیام کے دوران پشمینہ کا ایک جوڑا مع موزہ بنایا اور کشمیر کے بادشاہ سلطان قطب الدین کو بطور تحفہ ارسال کیا۔خام پشمینہ بھی اپنے ساتھ کشمیر لیا۔کہتے ہیں کہ ان کی تحریک سے کشمیر میں پشمینہ کی شال بافی کو فروغ ملا۔

بلتستان کے ایک محقق سید عباس کاظمی کے مطابق سید شریف الدین بلبل شاہ کشمیر کے آخری ہندو راجہ سہدیو (۱۳۰۰–۱۳۲۰) کے عہد میں وسط ایشیا سے لداخ کے راستے کشمیر آئے تھے۔بلبل شاہ کے ہاتھوں لداخی شہزادہ رینچن نے اسلام قبول کیا تھا۔

شیرپ زنگپو

گیلوگپا فرقہ کے بانی ژونکھاپا کے ایک اہم مقلد شیرپ زنگپو نے ٹھکسے گنپہ کی بنیاد ڈالی

اور بھکشوسنگھا قائم کیا۔ وہ پندرہویں صدی کے شروع میں لداخ آئے۔ ۱۴۲۰ء میں اُنھوں نے وادی نوبراہ میں دیسکیت میں ایک اور گنپہ کی بنیاد رکھی۔

اسی صدی کے دوران یا اس کے آس پاس تین مکاتیب خیال کے بڑے لاما لداخ آئے اور گنپے تعمیر کیے یا جگہ منتخب کی۔ لاما ڈونگپا دورجے نے لگ بھگ پانچ سو سال پہلے ماٹھو گنپہ تعمیر کیا۔ یہ گنپہ سسکیا اسکول سے تعلق رکھتا ہے۔ چھورجے ڈنما کونگا نے پھیانگ گنپہ کی جگہ منتخب کی۔ ڈیگونگ فرقہ کا یہ گنپہ پونے پانچ سو سال پرانا ہے۔ ستقنا گنپہ کی تعمیر کا سہرا تبت کے ایک عالم اور رِشی چھوسنجے جمیانگ پالکھر کے سر باندھا جاتا ہے۔ اُنھیں ۱۵۸۰ء میں لداخ کے راجہ جمیانگ نمگیل نے مدعو کیا تھا۔ یہ گنپہ بروگپا کرگیوت جنوبی اسکول کی نمائندگی کرتا ہے۔

شیخ زین شاہ ولیؒ

شیخ زین شاہ ولیؒ کو سلطان زین العابدین (۱۴۲۳–۱۴۷۵) نے کسی بات پر بگڑ کر کشمیر سے لداخ جلاوطن کیا تھا۔ شیخ اپنے عقیدت مندوں کے ہمراہ لداخ آئے اور تبلیغ دین میں لگے۔ بعد میں جب سلطان سخت بیمار ہوا تو ان کو فوت ہوئی کہ یہ ہو نہ ہو زین شاہ ولیؒ کی دل آزاری اور بددعا کا اثر ہے۔ چنانچہ اپنے بیٹے کو شیخ کو منانے اور کشمیر واپس لانے کے لیے بھیجا۔ زین شاہ ولیؒ کشمیر واپس آئے۔ شیخ زین شاہ ولی کا مزار کشمیر میں عیش مقام میں ہے۔ ان کے ایک لداخی عقیدت مند کا مقبرہ بھی یہاں ہے۔

میر شمس الدین ایراکی (ایراک ایران میں ایک شہر ہے)

۱۵۰۵ء میں ایک نور بخشی عالم میر شمس الدین ایراکی ۵۰ علما اور دوسرے ساتھیوں کے ہمراہ کشمیر سے پوریگ، لداخ وارد ہوئے جہاں سے وہ بلتستان گئے۔ ان کی تبلیغ سے پوریگ اور بلتستان میں اکثر لوگوں نے نور بخشی مسلک اختیار کیا۔ ان کے بعد خدا رسیدہ بزرگ بابا نصیر الدین غازی آئے اور پیغام حق دیا۔

مرزا حیدر گورکان

ترک جرنیل مرزا حیدر گورکان (دوغلت) نے ۱۵۳۱ء میں لداخ پر حملہ کیا اور جلد ہی عارضی طور پر اپنے زیر قبضہ کرلیا وہ ۳۲۔۱۵۳۳ء میں کشمیر پر قابض ہوا۔ ۱۵۳۳ء سے ۱۵۳۸ء کے درمیان بلتستان اور تبت میں فتوحات حاصل کیں۔ مرزا حیدر کی تصنیف 'تاریخ رشیدی' اس دور کے لداخ، کشمیر اور تبت پر روشنی ڈالتی ہے تاہم ان کے بہت سارے بیانات حقائق سے میل نہیں کھاتے۔ کم سے کم لداخ کے معاملے میں اختلاف کی گنجائش ہے۔

اسی دوران ترک حکمران سلطان سعید خان لداخ پر حملہ کرتا ہے۔ مرزا حیدر نوبراہ سے آگے اس کا استقبال کرتا ہے۔ سلطان سعید خان اس مہم کے دوران دم گیری سے فوت ہو جاتا ہے۔

مرزا حیدر نے لداخ کی بلندی اور دم چڑھنے کا ذکر کیا ہے جس سے انسان کی طبیعت بہت خراب ہوتی ہے۔ انسان خواہ چلتا ہو، بیٹھا ہو یا آرام سے لیٹا ہو، ہر حال میں اس کا دم اس طرح گھٹ جاتا ہے، گویا ایک بھاری بوجھ اُٹھائے دوڑ رہا ہو۔ اس وجہ سے آرام سے سو نہیں سکتا..........
گھوڑوں کے لیے بھی بلندی کا ایسا ہی اثر ہوتا ہے۔ مرزا کے مطابق ایک ہی رات میں دم گیری سے ۲۰۰۰ سے زیادہ گھوڑے مر گئے۔ مرزا نے لکھا ہے: 'بہت سارے گاؤں میں سبزی صرف شلغم پیدا ہوتی ہے۔

مرزا نے لکھا ہے۔ اُن دنوں لداخ میں پکپا نام کا ایک طبقہ تھا جس کا پیشہ سونا نکالنا تھا۔ اس طبقہ کے لوگ اپنی حفاظت کے لیے خیموں کے بجائے غاروں میں رہتے تھے۔

وہ رقم طراز ہے۔ 'خانہ بدوش چنگیا کچا گوشت کھاتے ہیں۔ گھوڑوں کو بھی گوشت کھلاتے ہیں۔ بھیڑوں سے باربرداری کا کام لیتے ہیں۔'

جنگلی یاک کا ذکر کرتے ہوئے مرزا نے لکھا ہے کہ اگر یہ کسی پر حملہ کرے تو موت کے سوا کچھ چارہ نہیں ہے، خواہ سینگ یا لات مارے۔ اگر اس کا موقع نہ ملے تو اپنے شکار کو زبان سے کوئی بیس گز

کے قریب ہوا میں اُچھال دیتا ہے۔ وہاں سے جب گرتا ہے تو زندہ نہیں رہ سکتا۔ ایک یاک بارہ گھوڑوں کا بوجھ اُٹھاتا ہے۔

لداخ کے وسائل کا ذکر کرتے ہوئے مرزا لکھتا ہے کہ حدود تبت میں ایک ہزار سے زیادہ فالتو آدمی گزارہ نہیں کر سکتے۔ اس سے زائد لشکر کے لیے کشمیر کے سوا اور کوئی جگہ نہیں ہے۔

ڈئی گوڈ المیڈا

ڈئی گوڈ المیڈ الداخ آنے والا پہلا مغربی تھا، جس نے لداخ سے متعلق لکھا ہے۔ تاہم اس سے متعلق ہمیں زیادہ معلومات حاصل نہیں ہیں۔ وہ پرتگال کا باشندہ تھا اور ۱۶۰۰ء کے آس پاس لداخ آیا تھا۔ اس سے پہلے نسطوری عیسائی لداخ سے گزرے تھے۔ چٹان پر لکھی ایک تحریر سے زیادہ ان سے متعلق اور کوئی ریکارڈ دستیاب نہیں ہے۔

المیڈا نے لداخ کو ٹھیک طرح سے نہیں پہچانا۔ وہ لکھتا ہے۔ 'اس ملک کو انوکھے عیسائی چلاتے ہیں، جن کے راہب پرتگال کی یاد دلاتے ہیں۔' المیڈا نے گنپوں کو گرجا گھر بتایا ہے اور ان کی دیواروں کی شبیہوں کو حضرت عیسیٰ اور حضرت مریم کی تصویروں سے تعبیر کی ہے۔ وہ پادریوں اور پجاریوں کے لباس میں یکسانیت پاتا ہے۔ البتہ وہ لکھتا ہے کہ ان پجاریوں کے سر پورے مونڈے ہوئے ہیں۔ بہت سارے پجاری ہیں جو ان کے پجاریوں کی طرح پاکیزہ زندگی بسر کرنے کا حلف اُٹھاتے ہیں۔

وہ لکھتا ہے: 'ان کا ایک بشپ ہے، جن کو وہ لاما کہتے ہیں۔ ان کو وہ ایک سنت مانتے ہیں اور ان کی بہت ساری کرامات کا ذکر کرتے ہیں۔' پھر وہ بڑے لاما کی تپسیا اور گیان دھیان کا حوالہ دیتا ہے جو وہ دریا پار ایک بنجر صحرا میں اپنی قیام گاہ پر کرتے ہیں۔ جہاں سے وہ اہم موقعوں پر روحانی فرائض سرانجام دینے کے لیے راجدھانی آتے ہیں۔ دریا پار کرنے کے لیے وہ کشتی استعمال نہیں کرتے بلکہ اپنے لبادہ یا بکری کی کھال پر بیٹھ کر دریا پار کر لیتے ہیں۔'

لداخ کو اس نے سونا اور قیمتی پتھروں سے مالامال ایک سلطنت قرار دیا ہے۔ جن کو عورتیں اچھے

دام دے کر اپنی آرائش اور زیبائش کے لیے استعمال میں لاتی ہیں۔ مقامی لوگوں کی رنگت Javanese کی طرح سپید ہے اور لوگ نیک طبع ہیں۔

المیڈا کے بعد لداخ آنے والے مغربی سیاحوں نے بدھ مت اور رومن کیتھولک کی بہت ساری مذہبی رسومات میں یکسانیت پائی لیکن ڈئی گوڈ المیڈا پہلا آدمی تھا جس نے لداخیوں کو عیسائی سمجھا۔

انٹونیوڈے اندرادے

لداخ آنے والے دوسرے پرتگالی پادری فادر انٹونیوڈے اندرادے تھے۔ ان کا مقصد ایک تبلیغی مشن کا قیام تھا۔ ۱۶ مئی ۱۶۲۴ء کے روز وہ لداخ پہنچے۔ تب گیالپو سینگے نمگیل کی حکومت تھی۔ کیئوں نے گیالپو جمیانگ نمگیل کا دور حکومت بتایا ہے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ اندرادے نے لداخیوں کو مادّی طور پر خوش حال پایا۔ گیالپو کے ساتھ اندرادے کی اچھی دوستی تھی۔

بعد میں اندرادے مغربی تبت کی راجدھانی ژھپرانگ گئے جہاں راجہ نے فادر اندرادے کو عیسائیت کی اشاعت کے لیے تعاون کا یقین دلایا۔ ۱۲ اپریل ۱۶۲۶ء کو ژھپرانگ میں ایک گرجا کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ لاموں نے فادر اندرادے کے مشن کی سخت مخالفت کی جس کی حمایت لداخی راجہ نے بھی کی۔ مغربی تبت کے حکمراں کو معزول کر کے لیہہ لا کر قید کیا گیا۔ اس طرح اندرادے کا مشن ناکام ہوا۔

ستق سنگ راسپا نوانگ گیاژو

ستق سنگ راسپا نوانگ گیالپو سینگے نمگیل ۱۶۲۴ – ۱۶۴۲ء کے عہد میں تبت کے ایک اور عالم ستق سنگ راسپا اول نوانگ گیاژو گیالپو کی دعوت پر لداخ آئے۔ ان کو راج گرو بنایا گیا۔ گیالپو اور ستق سنگ راسپا کی دوستی ضرب المثل تھی۔ وہ سنسکرت اور تبّتی زبانوں کے عالم تھے۔ نوانگ گیاژو نے بودھ دھرم اور اس سے وابستہ علوم ہندوستان میں حاصل کیے تھے۔ ان کا سفرنامہ بڑا دلچسپ اور معلوماتی ہے۔ لداخ میں انھوں نے ہمس اور چیمرے گنپے تعمیر کیے۔ ان کو شمبوناتھ کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔

فادر ڈی آزے ویڈو

اکتوبر ۱۶۳۱ء میں دو پرتگالی پادری فادر فرانسسکو ڈی آزے ویڈو اور فادر گیووانی ڈی اویسور ومغربی تبت کی راجدھانی ژھپرانگ سے لیہہ کے لیے روانہ ہوئے۔ اس راستے سے سفر کرنے والے وہ پہلے یورپی تھے۔ دشوار گزار راستے اور سردی کی وجہ سے ان کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ جس پہلی بستی میں وہ پہنچے، وہ لداخ کا گاؤں گیا تھا جسے فادر آزے ویڈو نے Guiar لکھا ہے۔ آگے اُنھیں اور گاؤں نظر آئے اور جو کے کھیت دیکھے۔

۲۱ روز بعد ۲۵ اکتوبر کو وہ لیہہ پہنچے۔ تب لداخ میں گیالپو سینگے نمگیل کی حکومت تھی۔ دستور کے مطابق وہ شہر کے پھاٹک پر اپنے گھوڑوں سے اُترے اور شہر میں داخلہ کے لیے اجازت لی۔ ان دنوں لیہہ کے گرد فصیل تھی۔ گیالپو نے اُنھیں رہنے کے لیے کمرہ دلایا اور جو اور ایندھن فراہم کیے۔

فادر آزے ویڈو لیہہ کا تذکرہ یوں کرتے ہیں: 'لیہہ قصبہ پہاڑی کی ایک ڈھلان پر واقع ہے۔ یہاں ۸۰۰ کنبے ہیں۔ آدھا میل دور نشیب میں دریا بہتا نظر آتا ہے جو لاہور جاتا ہے۔ (یہ دریائے سندھ ہے جو قصبہ سے چار میل دور ہے) قصبہ میں پہاڑ سے بہتا ہوا ایک نالہ گزرتا ہے، جس پر بہت ساری پن چکیاں چلتی ہیں۔ یہاں کچھ پیڑ بھی ہیں۔'

دونوں پادریوں کو گیالپو سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا اور تحفے پیش کیے جن میں کچھ کپڑے، ہتھیار اور ارزاں قسم کے زیورات تھے، جو بقول آزے ویڈو راجہ کو پسند آئے۔ فادر سینگے نمگیل کی شخصیت سے متعلق لکھتے ہیں: 'راجہ لمبے قد و قامت کا ہے۔ بھورا رنگ ہے اور نین نقش میں کچھ Javanese پرتو ہے۔ شکل و شباہت سخت گیرانہ ہے۔ بال کندھوں تک گرتے ہیں۔ دونوں کانوں میں فیروزے اور ایک بڑا مونگا پہنا ہے۔ زندگی کی بے ثباتی یاد دلانے کے لیے گلے میں کھوپڑی کی ہڈیوں کی مالا پہنی ہے۔ راجہ ایک منقش قالین پر آلتی پالتی مارے بیٹھا ہے۔ رانی چھوٹے قد کی ایک خوبصورت عورت ہے۔ آنکھیں دکھتی ہوئی لگتی ہیں۔ اُنھوں نے اپنے شوہر جیسا لباس پہنا ہے لیکن اس کی شخصیت اپنے شوہر کے مقابلے میں کم متاثر کن ہے۔'

دونوں پادریوں کو چائے پلائی گئی۔ بعد میں اُنھیں کچے گوشت کا ایک ٹکڑا اور جو کا ایک گولا دیا گیا۔ فادر نے جو کو مقوی اور لذت بخش غذا اور چائے کو اپنا مرغوب مشروب بتایا۔

چار روز بعد دونوں پادری دوبارہ گیا لپو سے ملے اور ان کی قلمرو میں عیسائیت کا ایک مرکز قائم کرنے کی اجازت مانگی۔ گیا لپو نے کہا کہ وہ اس درخواست پر اپنے مشیروں سے صلاح ومشورہ کے بعد جواب دیں گے۔ ایک ہفتہ بعد گیا لپو نے ایک فرمان کے ذریعے اجازت دے دی اور بقول اذے ویڈو گیا لپو نے کہا کہ وہ کوگے رودوق حتی کہ لیہہ میں بھی مشن چلا سکتے ہیں۔ اب سردی بڑھ گئی تھی۔ فادر آذے ویڈو اور فادر آویسو روے نومبر کو لیہہ سے لوٹے اور لاہور، کلو سے ہوتے ہوئے آگرہ پہنچے، جہاں اُنھوں نے اپنی رپورٹ پیش کی۔

فرانکوئیس برنیئر

راجہ دے لیکس نمگیل کے عہد میں تبت اور بھوٹان کے تنازعے میں مداخلت کرنے پر پانچویں دلائی لاما کے حکم پر منگول اور تبتی فوج لداخ کے بڑے حصے پر قابض ہوئی تھی۔ راجہ لیہہ سے ۳۰ کلومیٹر دور بز گو گاؤں پسپا ہوا تھا۔ تین سال تک چھٹ پٹ لڑائیاں جاری رہیں۔ لداخی فوج حملہ آوروں کو پسپا نہیں کر سکی۔ آخر کار راجہ نے مغل حکومت سے امداد حاصل کرنے کے لیے سری نگر ایک وفد بھیجا۔ ان دنوں مغل شہنشاہ اورنگ زیب سری نگر آیا ہوا تھا۔ ایک فرانسیسی سیاح فرانکوئیس برنیئر بھی سری نگر میں موجود تھا۔ برنیئر نے لداخی وفد کے ارکان کو دیکھا۔ اپنے سفرنامے میں وہ اس کا یوں ذکر کرتا ہے: 'لداخی راجہ نے سری نگر میں اورنگ زیب کی آمد کی خبر سنی تو اپنے سفارت کار بھیجے۔ وفد نے مشک نافہ، ایک بڑا قیمتی پتھر، یاک کی دُمیں وغیرہ پیش کیں۔ سفیروں کے ساتھ تین یا چار گھوڑ سوار اور دس یا بارہ لمبے قد و قامت کے سوتے ہوئے سوکھے چہرے والے دبلے پتلے آدمی تھے۔ چینیوں کی طرح ان کے چہرے پر کم داڑھی تھی۔ ہمارے بحریہ کے آدمی جیسی سرخ رنگ کی ٹوپی پہنی تھی...... میرا خیال ہے کہ ان میں چار یا پانچ آدمی تلواروں سے لیس تھے...... سفارت کار نے

اورنگ زیب کے ساتھ ایک معاہدہ کیا اور اپنے مالک کی طرف سے راجدھانی میں ایک مسجد تعمیر کرانے، اورنگ زیب کی شبیہ والا سکہ ڈھالنے اور سالانہ خراج دینے کا وعدہ کیا لیکن ہر شخص کو شبہ تھا کہ اورنگ زیب کے کشمیر سے لوٹتے ہی معاملہ کھٹائی میں پڑ جائے گا!......وفد میں ایک طبیب لاما بھی تھا جس نے برنیئر کو ایک قریب المرگ بڑے لاما سے متعلق بتایا کہ آواگون کے عقیدے کے مطابق ان کے مرنے کے بعد ان کا جانشین جلدی پیدا ہوگا'۔

برنیئر لداخ سے متعلق زیادہ معلومات چاہتا تھا۔اس لیے لداخی زبان سے واقف ایک کشمیری تاجر کے ہمراہ لاما سے ملا۔ برنیئر نے لکھا ہے کہ کشمیر سے تاجر لداخ کے راستے چین جاتے اور مشک نافہ، صندل میرہ (Jade) وغیرہ لاتے تھے، لیکن شاہجہاں کی فوج کشی کے بعد لداخ کے راجہ نے نہ صرف سری نگر۔لیہہ کا تجارتی راستہ بند کیا تھا بلکہ کشمیر سے آنے والے تاجروں کی آمد پر بھی پابندی لگائی تھی۔

اورنگ زیب اور لداخی وفد کے درمیان ہوئے معاہدہ پر عمل آوری سے متعلق برنیئر نے سری نگر میں جو شبہات پائے، وہ غلط ثابت ہوئے۔اورنگزیب کے حکم پر کشمیر کے گورنر نے نواب فدائی خان کی سرکردگی میں لداخ فوج بھیجی اور بزگو کے پاس تبت اور منگول کی مشترکہ فوج کو شکست دی۔لداخ کی پرانی سرحد بحال ہوئی تاہم مغربی تبت کا مقبوضہ علاقہ چھوڑنا پڑا۔تبت نے خلاف توقع لداخ پر جو جارحیت کی تھی، اس سے پیدا زخم لداخ میں پوری طرح مندمل نہیں ہوا تھا۔مغل اور لداخ ایک دوسرے کے زیادہ قریب آئے تھے۔مغل گورنر اپنی خط و کتابت میں لداخی راجہ کو عاقبت محمود خان کے نام سے یاد کرتا تھا۔اس صورت حال پر چھٹے دلائی لاما سنگیس گیاژو کو تشویش تھی۔وہ چاہتے تھے کہ لداخ کے بودھ حکمراں کشمیر اور اسلام کے زیر اثر نہ رہیں۔اُنھوں نے کرگیوت پاڈوگپا فرقہ کے سب سے بڑے لاما چھٹواں ڈوگچین رینگبو چھے میپھم وانگبو کو راجہ دے لیگس نمگیل سے ملاقات کرنے اور اعتماد بحال کرنے کے لیے ۱۶۸۳ء میں لداخ بھیجا۔ڈوگچین رینگبو چھے کا لداخ میں بڑا اثر و رسوخ تھا۔۸۴-۱۶۸۳ء کی سردیوں میں بڑے لاما نے لداخ کے

ایک گاؤں تنگ موگانگ میں راجہ سے ملاقات کی۔دلائی لاما کا پیغام پہنچایا اور اپنی طرف سے سمجھایا بجھایا۔ڈوگچین رینگبو چھے اپنے مشن میں کامیاب ہوئے۔

اس سے پہلے اور بعد میں وقتاً فوقتاً تبت سے سرکردہ مذہبی رہنما لداخ آئے اور تبت اور لداخ کے مابین مذہبی، سیاسی اور ثقافتی تعلقات کو استوار کرنے میں اہم رول ادا کیا۔

منگولیا کی حکومت نے لداخ کی حکومت سے تعلقات قائم کرنے کے لیے اٹھارہویں صدی کے پہلے نصف کے دوران کئی وفود لداخ بھیجے۔چین کی حکومت نہیں چاہتی تھی کہ لداخ منگولوں کے زیراثر آئے۔منگولوں سے تبت کی سلامتی اور خطے میں چین کی حاکمیت کو خطرہ تھا۔چین نے بھی لداخی حکومت کی خیرسگالی حاصل کرنے کے لیے سفارتی مشن اور راجہ کو قیمتی تحفے تحائف بھیجے۔لداخ کی حکومت نے منگولوں کے مقابلے میں چین سے دوستانہ تعلقات قائم کرنے کو ترجیح دی۔

لامانوانگ گیالچن

اٹھارہویں صدی کے شروع میں بھوٹان کے ایک بڑے لاما اور عالم نوانگ گیالچن لداخ آئے۔گیالپو نیما نمگیل (۱۶۹۴-۱۷۲۹ء) نے دربار میں ان کا سواگت کیا اور اپنے تخت کے پاس بٹھایا۔گیالپو، کلون وزرا، درباری اور مذہبی علما نوانگ گیالچن کی عالمانہ باتوں سے بڑے متاثر ہوئے۔

لامانوانگ گیالچن نے راجہ کی طرف سے ان کے اعزاز میں دی گئی پہلی ضیافت کا ذکر کیا ہے۔'کھانے کی پلیٹیں آنے لگیں اور سویں پلیٹ تک یہ سلسلہ چلا۔گوشت کا کوئی آئیٹم نہیں تھا۔کھانے کی ساری قسمیں پھلوں وغیرہ سے تیار کی گئی تھیں۔

لامانوانگ گیالچن پانچ سال لداخ میں رہے اور ان کی علمیت اور تدبر سے سبھی استفادہ کرتے تھے تب بھوٹان کی حکومت نے ان کی خدمات واپس لیں۔لداخی حکومت ان کی روانگی نہیں چاہتی تھی لیکن اُنھیں لداخ کو خیرباد کہنا پڑا۔

فادر ڈیزی ڈیری

فادر آذے ویڈو کی آمد کے ۸۴ سال بعد دو اطالوی پادری فادر سیپو لیٹے ڈیزی ڈیری اور فادر مینوئل فریرے لداخ آئے۔ ۲۸ اگست ۱۷۱۲ء کو وہ روم سے نکلے اور ہندوستان میں گوا کی تبلیغی مشنری میں شامل ہوئے۔ پھر لداخ روانگی کے لیے کشمیر پہنچے جہاں سے ۱۷ مئی ۱۷۱۵ء کو لیہہ کے لیے روانہ ہوئے اور ۴۰ روز کی مشقت خیز مسافت کے بعد ۲۶ جون ۱۷۱۵ء کو لیہہ پہنچے۔ ان دنوں لیہہ سری نگر راستہ بڑا خراب تھا۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''کشمیر سے لہاتا (لیہہ) ۴۰ دن کا سفر ہے جو ماسوائے پیدل طے نہیں ہوسکتا۔ راستے کا زیادہ حصہ بلند ترین اور نہایت ہی خطرناک پہاڑوں کے ساتھ ہے، جس پر بیک وقت ایک سے زیادہ آدمی سفر نہیں کر سکتا۔ کچھ مقامات پر پہاڑ برف کی پسیوں اور موسلا دھار بارش سے ٹوٹ پھوٹ گئے تھے اور راستہ بالکل نظر نہیں آتا تھا۔ مسافر جانتا نہیں تھا کہ کہاں پیر رکھے۔ ایسی حالت میں ہمارے رہبروں میں ایک رہبر ایک کلہاڑی لے کر آگے آگے چلتا تھا اور پیر رکھنے کے لیے جگہ بناتا تھا۔ وہ میرا ہاتھ اپنے بائیں ہاتھ سے تھام کر پیر برابر نشان پر میرا پیر رکھوانے میں مدد دیتا تھا۔ یہاں تک کہ ایک تنگ راستہ آیا۔ کئی مقامات پر پہاڑ پر برف جمی ہوئی تھی اور پھسلنے کا خدشہ رہتا۔ پھر بیچ میں تنگ راستہ مسدود ہو جاتا......... تھوڑی سی لاپروائی سے ڈھلوان راستے سے نیچے گرنے کا ڈر رہتا تھا اور دو پہاڑوں کے تنگنائے میں بہنے والے نشیبی نالے سے ٹکرا کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا۔

بہت سارے کشمیری جو پشمینہ خریدنے لداخ آتے تھے، راستے میں ہلاک یا معذور ہو جاتے تھے۔

فادر ڈیزی ڈیری نے بلتستان کو پہلا چھوٹا تبت اور لیہہ کو دوسرا تبت کہا ہے۔ لیہہ آکر ان کو معلوم ہوا کہ تیسرا تبت بھی ہے جسے مورخوں نے اصلی تبت یا تبت بزرگ کہا ہے۔ لیہہ کو وہ لہاتا کہتے ہیں اور قصبے کا نقشہ یوں کھینچا ہے: 'لیہہ قصبہ ایک بڑے میدان میں ہر طرف پہاڑوں سے گھرا گاؤں سے بھرا پرا ایک پہاڑ کی ڈھلان پر واقع ہے، جو بڑے لاما کی رہائش گاہ اور بڑے محل تک پھیلا ہوا ہے۔

یہ بڑی اور عمدہ عمارتیں ہیں۔ان کے اوپر چوٹی کے پاس واقع ایک بڑے قلعے کا سائبان ہے۔ساتھ ہی دوسرا قلعہ ہے۔نشیب اور دونوں کناروں پر قصبہ فصیل اور دفاعی پھاٹکوں کے ہالے میں ہے۔

لداخ سے متعلق وہ لکھتے ہیں: 'سارا ملک پہاڑی ہے۔ پیداوار بہت کم ہوتی ہے۔آبادی کم ہے۔یہاں جو پیدا ہوتا ہے اور تھوڑی سی گیہوں بھی اُگتی ہے۔پھلوں میں زیادہ خوبانیاں ہیں۔دوسرے ملکوں سے تجارت کم ہے۔تجارت سے ایک عمدہ قسم کی اون، معمولی سا سونا پیدا کرنے والی ریت اور مشک نافہ تک محدود ہے۔(مصنف وسط ایشیا سے کارواں آنے سے پہلے لہاسہ گئے تھے اور لداخ کی تجارت سے متعلق ان کی علمیت محدود لگتی ہے) درخت اور ایندھن بہت کم ہیں۔ مویشی بہت ہیں۔لوگوں کی خاص خوراک بھنا ہوا جو کا کھانا اور گوشت ہے۔پسندیدہ مشروب چھنگ ہے۔چائے دن میں کئی دفعہ پی جاتی ہے۔ان کا لباس اُون کا بنا ہوا ہے۔'

ڈیزی ڈیری نے قصبے میں بہت سارے کشمیری تاجروں کو دیکھا، جو اون پشمینہ کا کاروبار کرتے تھے۔اُنھیں مسجدیں بنانے اور مذہبی آزادی حاصل تھی۔

لوگوں کے چال چلن سے متعلق لکھتے ہیں کہ لوگ طبعاً مغرور نہیں ہیں بلکہ نرم طبع، خوش اخلاق، ہشاش بشاش اور نیک ہیں۔البتہ اُنھوں نے خلسے کے پل پر تعینات چنگی کے ملازمین کو لالچی اور ظالم بتایا ہے۔وہ نقد روپیہ کے علاوہ بڑے کٹھور پن سے تمباکو، کھانڈ اور کپڑے بھی بٹورتے تھے۔

فادر ڈیزی ڈیری نے بتایا ہے کہ علاقے میں متعدد گنپے ہیں، جن میں بڑی تعداد میں لامے مقیم ہیں، جو ایک بڑے لاما کے تحت رہتے ہیں..........لداخ میں بڑا قصبہ نہیں ہے۔صرف گاؤں ہیں۔اُن دنوں لداخ کا حکمراں نیما نمگیل (۱۶۹۴-۱۷۲۹) تھا۔

۱۷ اگست کو وہ لیہہ سے تبت کے لیے روانہ ہوئے اور سات ماہ بعد ۱۸ مارچ ۱۷۱۶ء کو لہاسہ پہنچے۔

لاما کاتھوق رگزین چھوانگ نربو

۱۷۵۲ء میں دلائی لاما نے لہاسہ سے ایک بڑے لاما کاتھوق رگزین چھوانگ نربو کو لداخی راجہ

کے خاندان میں پیدا ہوئی ناچاقی کو ختم کرنے کے لیے لداخ بھیجا۔ یہ ناچاقی ۱۷۳۴ء میں لداخی راجہ نیما نمگیل کے دو بیٹوں میں پیدا ہوئی اور لداخی سلطنت دو حصوں میں بٹ گئی۔ دیسکیونگ نمگیل کو علاقہ لیہہ اور ٹشی نمگیل کو مسلم علاقہ پوریگ ورثہ میں ملا۔ دیسکیونگ نمگیل کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا پنچگ نمگیل تخت نشیں ہوا۔ تاہم دونوں خاندانوں میں تعلقات کشیدہ رہے۔ کاتھوق رگزین نے فریقین کی ثالثی کے لیے سرحدی گانوں ہنلے کا انتخاب کیا اور ۷ ماہ کی بات چیت کے بعد دونوں خاندانوں میں سمجھوتہ ہوا اور بڑے لاما کی کوششوں سے ایک تحریری معاہدہ عمل میں آیا۔

فلپ یافرے موف (Filip Yefremov)

۱۷۸۱ء کے اختتام یا ۱۷۸۲ء کے شروع میں ایک روسی فلپ یافرے موف لداخ کے راستے ہندوستان گیا۔ وہ مشرقی ترکستان سے آیا تھا۔ اس سے پہلے بخارا میں اس کو کرغیزیوں نے بطور غلام فروخت کیا تھا۔ وہاں سے فرار ہو کر یارقند سے ہوتا ہوا لداخ آیا۔ لیہہ قصبہ سے متعلق اس کے تاثرات:

'لیہہ ایک دریا کے پاس ایک پہاڑی کے ڈھلوان پر واقع ہے۔ کافی بڑا ہے اور اس کا رقبہ بخارا کا نصف ہے۔ مکانات خالص پتھر کے بنے ہوئے ہیں۔'

لیہہ سے متعلق وہ مزید لکھتا ہے کہ قصبے میں بہت سارے کشمیری ہیں۔ ان کی مسجدیں ہیں اور تجارت کرتے ہیں۔

لیہہ۔سری نگر راستے سے متعلق رقم طراز ہے: 'لداخ سے کشمیر جانے والا راستہ بہت تنگ اور بڑا خطرناک ہے اس لیے اس پر گھوڑے نہیں گزر سکتے اس لیے ہم نے اپنا سامان پیٹھ پر اُٹھایا' اس کے ساتھ ایک نوکر بھی تھا جو اس نے یارقند میں ۳۰ روبل میں خرید اتھا۔

ہندوستان سے یاف وے موف لندن گیا۔ بعد میں اس نے روسی حکومت کو اپنے سفر کے احوال بتائے۔

رافیل ڈین بیگوف (Rafiul Danbegov)

فلپ یافرے موف کے تیرہ یا چودہ سال بعد ۱۷۹۵ء میں روس کے صوبہ جارجیا کا ایک سیاح رافیل ڈین بیگوف لیہہ سے گزرا۔ وہ ترکی کے راستے ہندوستان آیا اور مدراس، کلکتہ ہوتا ہوا کشمیر پہنچا جہاں سے لداخ آیا۔ سری نگر سے لیہہ پہنچنے میں بیس روز لگے۔ لیہہ سے متعلق وہ اپنے سفرنامہ میں لکھتا ہے: "لیہہ اونچے پہاڑوں کے ہالے میں پہاڑیوں پر آباد ہے۔ یہاں تھوڑی جئی کے سوا کچھ نہیں اُگتا۔ لوگ غریبی کی وجہ سے جئی کو پیستے ہیں۔ اس کو دودھ میں بھگو کر گائے کا کچھ مکھن ڈال کر اُبالتے ہیں اور یہی ملغوبہ ان کی واحد خوراک ہے۔ یہاں ایک بدترین رسم پولینڈری ہے۔ ان سے پیدا ہونے والے بچے کا نام سب سے بڑے بھائی کے نام پر رکھا جاتا ہے۔

سفرنامہ میں لکھا ہے کہ رافیل ڈینی بیگوف کو شاہ جارجیا نے کسی کام پر بھیجا تھا۔ تاہم کسی اور کتاب میں لکھا ہے کہ وہ روسی حکومت کا بھیجا ہوا جاسوس تھا۔

ساتواں اور آٹھواں ڈوگچین رینگبو چھے لداخ میں

ڈوگچین رینگبو چھے جیسی بڑی ہستی کا لداخ آنا تب لداخیوں کے لیے بڑا اعزاز تھا۔ ڈوگپا کرگیوت کے (Superme head) سربراہ اعلیٰ ہونے کے پیش نظر لداخ میں ان کی بڑی قدرومنزلت تھی۔ ان کو مدعو کرنے کے لیے راجہ کا خصوصی نمائندہ لہاسہ جاتا تھا۔ لداخ کے راجاؤں اور بودھوں کی بڑی تمناؤں کے باوجود ماسوائے ڈوگچین رینگبو چھے کوئی دلائی لاما، پنچن لاما، گیالو اسکرماپا اسکیا گونگما اور دوسرے فرقوں کے سربراہان اعلیٰ لداخ نہیں آسکے۔

ساتواں ڈوگچین رینگبو چھے گیالپو پنچگ نمگیل (۱۷۳۹-۱۷۵۳) کے عہد میں لداخ آئے۔ اُن دنوں سسکیونگ نمگیل گنپہ کے کوشوق تھے۔ ان کو گیالرس ٹولکو میسم جمپل دورجے کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ ۱۷۴۵ء میں وہ لہاسہ گئے جہاں سے تشی لومبوٗ پہنچے۔ غالباً اُنھوں نے ڈوگچین رینگبو چھے کو تب لداخ آنے کی دعوت دی۔ ہمس گنپہ میں ان کی آمد کا تذکرہ ایک کتبہ میں کیا گیا ہے۔

آٹھواں ڈوگچین رینکبو چھے کا ۱۰ اکتوبر ۱۸۰۱ء کو راجہ چھیتن نمگیل اور دوسروں نے ہمس میں خیر مقدم کیا جہاں سے وہ لیہہ گئے۔ لیہہ میں اُن کا والہانہ استقبال ہوا۔ راجہ، امرا اور رؤسا ایک سے ایک بڑھ کر ان کو بیش قیمت تحفے تحائف پیش کرنے لگے۔ جس کی تفصیل لداخ گیالربس میں دی گئی ہے، لیکن اسی اثنا میں چیچک پھوٹ پڑی۔ نوجوان راجہ چھیتن نمگیل بھی چیچک کا شکار ہوا اور چل بسا۔ ڈوگچین رینکبو چھے نے آخری رسومات سرانجام دیں۔ تب ۱۸۰۲ء کا پہلا یا دوسرا مہینہ تھا۔ اس کے بعد ڈوگچین رینکبو چھے تبت لوٹے۔

میر عزت اللہ

۱۸۱۲ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا ایک اہلکار میر عزت اللہ لداخ کے راستے بخارا روانہ ہوا۔ کمپنی کو نسل کشی کے لیے اعلیٰ نسل کے گھوڑے مطلوب تھے۔ اس سلسلے میں ایک ماہر ولیم مورکرافٹ کو بخارا بھیجنا چاہتی تھی۔ میر عزت اللہ کو مورکرافٹ کے سفر کی راہ ہموار کرنے کے لیے بھیجا گیا۔ میر نے اپنا سفر نامہ لکھا ہے۔ اکثر ملکی سیاحوں نے اپنے سفر کی روداد نہیں لکھی ہے۔ میر عزت اللہ پہلا ملکی ہے، جس نے لداخ اور وسط ایشیا کے اپنے سفر کے احوال لکھے ہیں۔ وہ سونمرگ تا لیہہ اور لیہہ تا مشرقی ترکستان ہر پڑاؤ اور بستی کا ذکر کرتا ہے۔ اس کے سفر نامے کو Jaurnal of the Royal Asiatic Society of Great Britain and Ireland نے Travels Beyond the Himalaya کے عنوان سے شائع کیا ہے۔

میر لکھتا ہے، زوجی لا سے آگے مٹائن سے ہی مکانات کھنڈرات میں بدل گئے ہیں اور ویران نظر آتے ہیں۔ پشتو بولنے والے دردیوں نے دراس پر حملہ کیا تھا۔ حملہ آوروں کی تعداد تین سو تھی۔ وہ ۲۵۰ افراد کو اغوا کر کے اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ اس واقعہ کے بعد کشمیر کے حکمراں نے چند بندوق بردار دراس میں رکھے تھے۔ دراس کے قلعہ دار کو خرپون کہا جاتا ہے جو لیہہ سے آتا ہے۔'

میر نے لیہہ، لداخ کو تبت کہا ہے۔ لیہہ سے متعلق وہ رقم طراز ہے: 'لیہہ تبت کی راجدھانی

ہے۔میوہ دار درخت کم ہیں۔ بید کے درخت کثرت سے ہیں۔لیہہ میں بڑا اچھا شلغم اگایا جاتا ہے۔ستو عام خوراک ہے۔ بڑے لوگ چاول کھاتے ہیں۔لوگ پٹو پہنتے ہیں۔مردوں کے بال بھی عورتوں کی طرح گوندھے جاتے ہیں اور چٹیا پیچھے گرتی ہے۔کثیرالازدواج (پولینڈری) مروج ہے..........مکانات پتھروں اور کچی اینٹوں سے بنائے گئے ہیں۔چھتوں پر سفیدہ کی لکڑی کی کڑیاں لگائی گئی ہیں۔مکانات تین یا چار منزلہ اونچے ہیں۔آبادی تبتیوں اور مسلمانوں پر مشتمل ہے۔مسلمانوں میں شیعہ اور سنی دونوں ہیں۔لیہہ میں ایک مسجد ہے۔امام کو ہر تاجر مال کی آمد پر ایک جئو دیتا ہے۔۲۴ جئو کا ایک روپیہ بنتا ہے۔جئو پر مغل بادشاہ محمود شاہ کا نام ہے۔مغلوں نے لداخی راجہ کو عاقبت محمود خاں خطاب دیا ہے۔کشمیر کے حکام راجہ کو اسی نام سے یاد کرتے ہیں۔راجہ بدھ مت کا پیرو کار ہے..........پولو مقبول کھیل ہے۔'

میر نے لوگوں کی تعریف کی ہے۔'لیہہ میں قیام کے دوران میں نے ایک آدمی کو بھی مسلح نہیں دیکھا اگر چہ ان کے گھروں میں بندوقیں اور دوسرے ہتھیار رکھے گئے ہیں۔قتل، ڈاکہ زنی، تشدد، اور خوں ریزی بالکل نہیں ہوتی..........لوگ بہت شریف ہیں۔کسی کو زک نہیں پہنچاتے اور مذہبی تعصب سے بالاتر ہیں۔بودھ اپنی بیٹیوں کی شادیاں مسلمانوں سے کراتے ہیں اور اپنے شوہر کا مذہب اختیار کرنے پر اعتراض نہیں کرتے۔اگر عورتیں چاہیں، کسی بھی وقت اپنا (آبائی) مذہب دوبارہ اختیار کر سکتی ہیں۔'

تزک جہاں گیری میں بھی لکھا ہے کہ لداخ بلتستان اور راجوری میں دو فرقوں کے درمیان شادی بیاہ ہوتا تھا۔

دفاعی نقطہ نظر سے لداخ کی فوجی کمزوری پر تبصرہ کرتا ہوا میر عزت اللہ لکھتا ہے۔'چار سو یا پانچ سو گھوڑ سوار سارے ملک میں لوٹ مار مچا سکتے ہیں۔'

میر کے مطابق لداخ میں بنایا ہوا بارود مشہور ہے۔لیہہ سے تقریباً تین پڑاؤ پر گندھک کی کانیں ہیں۔

مصنف نے لداخ کی بہت ساری چیزوں کا ذکر کیا ہے۔تاہم بہت سارے بیانات سطحی مشاہدہ اور تحقیق پر مبنی لگتے ہیں۔ بدھ مت سے متعلق وہ اپنی لاعلمی کا ذکر کرتا ہے۔اس ضمن میں خواجہ شاہ نیاز نے میر سے کہا تھا کہ مذہب سے متعلق وہ کسی سے کوئی سوال نہ کرے، کیونکہ حکام کو یہ برا لگے گا۔خواجہ شاہ نیاز کی جاگیر کشمیر میں سکھوں نے ضبط کی تھی اور وہ شے میں قیام کرتے تھے۔خواجہ ایک صوفی منش بزرگ تھے۔

میر عزت اللہ ۱۶ ستمبر ۱۸۱۲ء کو سری نگر سے لیہہ روانہ ہوا اور ۲۰ روز کے سفر کے بعد لیہہ پہنچا۔۲۶ اکتوبر کو وہ مشرقی ترکستان روانہ ہوا جہاں سے وہ بخارا گیا اور کابل سے ہوتا ہوا ہندوستان لوٹا۔

جیمز بیلائی فریزر

۱۸۱۴ء میں ایک یوروپی جیمز بیلائی فریزر کشمیر سے لیہہ آیا۔اس کے مطابق لیہہ بازار میں تب کشمیری مسلمانوں کی بارہ یا تیرہ دُکانیں تھیں تاہم کوئی ہندو بنیا نہیں تھا۔گاؤں کے لوگ آٹا، گھی، اناج اور کھانے پینے کی اشیا بازار میں بیچنے لاتے تھے۔

فریزر نے تین میلوں کا ذکر کیا ہے۔ پہلا چنگ دوس کہلاتا ہے یعنی تبتیوں کے اجتماع کا میلہ، جو کاتک بمطابق اکتوبر میں منایا جاتا تھا۔اس میلے کی تجارتی افادیت تھی۔دوسرا میلہ دسمو چھے ہے، جو آج بھی منایا جاتا ہے۔ وہ اسے تینوں میں سب سے بڑا میلہ بتاتا ہے اور پھاگن بمطابق فروری میں منایا جاتا تھا۔ تیسرا روپہلا یا فصل کٹائی کا میلہ، جو بھادوں مطابق اگست میں منایا جاتا تھا۔آج کل روپہلا میلہ شے اور کئی گاؤں میں منایا جاتا ہے۔شاید مصنف کی سیاحت کے دنوں لیہہ میں بھی منایا جاتا ہو۔

جیمز فریزر لکھتا ہے:'ان میلوں میں یارقند سے آئے ہوئے مسلمان، لہاسہ کے لاما، امرتسر اور پنجاب کے ہندو، کشمیر اور دوسرے مقامات کے تاجر بڑی تعداد میں اپنا مال بیچنے لاتے ہیں۔ یہاں سے وہ مغربی تبت کے سرمائی صدر مقام گرتوق جاتے ہیں۔'

یونگزین رینگبو چھے

۱۸۱۴ء میں ڈوگیا یونگزین رینگبو چھے لداخی راجہ کی دعوت پر لیہہ آئے۔ دلائی لامانے ان کو اور لداخی قاصد کو خوشگوار سفر کے لیے نیک خواہشات کا اظہار کیا۔ یونگزین رینگبو چھے کا لیہہ میں گیالپو چھیپل تنڈوپ نمگیل، وزرا اور رعایا نے گرم جوشی سے استقبال کیا۔ سبھوں نے ان کو روایت کے مطابق حسب حیثیت قیمتی تحفے اور نذرانے پیش کیے۔ تقریباً تین ماہ بعد وہ تبت لوٹے۔ لداخی شاہی خاندان کا یونگزین رینگبو چھے سے مذہبی رشتہ تھا۔

زورآور سنگھ کے لداخ پر حملے سے پہلے لیہہ میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کی طرف سے خطے میں فوج کشی کا خطرہ محسوس کیا جارہا تھا۔ کلون (وزیر اعظم) نے چھوانگ تنڈوپ نے یونگزین رینگبو چھے کو اپنے قیمتی مشورے سے نوازنے کے لیے لہاسہ خط بھیجا کہ بیرونی حملے کی صورت میں اس سے نپٹنے کے لیے کیا اقدام کیے جائیں۔ کلون چھوانگ تنڈوپ مدبر مانا جاتا تھا۔ یونگزین رینگبو چھے نے جواب میں حسب ذیل مشورے دیئے۔

۱۔ حملہ آور کو پیشگی رقم دے کر واپس لوٹنے دو۔
۲۔ اگر اس پیش کش کو قبول نہ کریں، تو ان سے لڑو۔
۳۔ سکوریم (مخصوص پوجا) کرو تا کہ جنگ کی آفت ٹل جائے۔
۴۔ شے میں کاہن دورجے چھنمو سے پوچھو اور ان کی پیش گوئی پر عمل کرو۔

بقول لداخی اسکالر ٹشی ربگیں ان ہدایات پر عمل کیا نہیں لگتا۔ یونگزین رینگبو چھے کا ۱۸۴۵ء میں انتقال ہوا۔

ولیم مور کرافٹ اور جارج ٹریبک

ولیم مور کرافٹ پہلا یوروپی تھا، جس نے انیسویں صدی کے پہلے ربع کے دوران راجگان لداخ کے دور میں لداخ مین دو سال گزارے۔ اس دوران اس نے زنسکار کے سوا تقریباً سارا لداخ

دیکھا اور لداخ کے رسم و رواج، وسائل، پیداوار، معدنیات، چرند و پرند وغیرہ کے علاوہ خطے کے سیاسی، سماجی، معاشی او علمی احوال وکوائف پر سیر حاصل تبصرے کیے۔ اس ضمن میں اس کا سفر نامہ، یادداشتیں اور دو سو خطوط اس دور کے لداخ کے سب سے اہم اور دلچسپ ریکارڈ ہیں۔ مور کرافٹ کے ساتھی جارج ٹربیک نے بھی خطوط وغیرہ لکھے۔ ان نگارشات کو جمع کیا جائے تو دس ہزار صفحات بنتے ہیں۔ اُنھیں مور کرافٹ کلیکشن (Collection) کے نام سے لندن میں انڈیا آفس لائبریری کے محافظ خانہ میں محفوظ رکھا گیا ہے۔ سفرنامہ کو ایچ ایچ ولسن نے ۱۸۴۱ء میں شائع کیا۔ لمبے سفر کے دوران مور کرافٹ اور ٹربیک کے فوت ہونے کے بعد ڈاکٹر پی جی لارڈ نے افغانستان میں مور کرافٹ کے لکھے ہوئے بہت سارے کاغذات کو بچایا۔ وہ رقم طراز ہے: 'یہ کہنا قرین انصاف ہوگا کہ اس حوصلہ مند لیکن بدنصیب ٹیم نے ہر جگہ جو تاثرات چھوڑے ہیں، وہ قومی کردار کے لیے بڑے سازگار ہیں'

ٹیم کے ارکان میر عزت اللہ، حاجی نجف علی ٹربیک اور غلام حیدر خان کے مشاہدات پر مبنی نگارشات ایشیاٹک جرنل وغیرہ میں چھپیں۔ میر عزت اللہ کا پہلے ذکر آیا ہے۔ مور کرافٹ کو اعلیٰ نسل کے گھوڑے خریدنے کے لیے بخارا جانا تھا جن کی نسل کشی اور لڑائیوں میں استعمال کے لیے ضرورت تھی، لیکن چین کی حکومت نے اپنے علاقے سے اُنھیں بخارا جانے کی اجازت نہیں دی۔ اسی بنا پر مور کرافٹ اور مہم کے ارکان دو سال تک چین سے اجازت حاصل کرنے کے چکر میں لداخ میں پڑے رہے۔ بعد میں وہ افغانستان کے راستے بخارا پہنچے لیکن مور کرافٹ اپنے مقصد میں جزوی طور پر کامیاب رہا۔ واپسی کے بعد میں وہ اور اس کے اکثر ساتھی کسمپرسی اور بے کسی کے عالم میں فوت ہوئے۔

مور کرافٹ پونہ میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے مویشیوں کی نسل کشی کے ادارہ میں سپرنٹنڈنٹ تھا۔ برطانوی ہند کے گورنر جنرل لارڈ ہسٹنگز کو مور کرافٹ کے منصوبے سے پوری دلچسپی تھی اور سرکاری طور پر تعاون دیا۔ مور کرافٹ کا ایک مشن ایشیائے کوچک میں انگریزوں کی صنعتی مصنوعات اور اونی سوتی کپڑوں کے لیے منڈی اور خریدار تلاش کرنا تھا۔

مور کرافٹ کی پارٹی میں چودہ مسلح گورکھا سپاہی اور آٹھ افغان سمیت ۵۰ مستقل ملازمین

تھے۔ایک پاؤنڈر کی دو پہاڑی توپیں بھی مہم میں ساتھ لیں۔دس دوسرے کارکن تھے۔مورکرافٹ نے گھسیارے، خاکروب، نان بائی، نقشہ ساز وغیرہ بھرتی کیے۔

مورکرافٹ کا نومربع فٹ کا نیلے رنگ کا خیمہ ضروری ساز وسامان سے آراستہ تھا اور اس کی قناتیں مرزاپوری قالین سے سجائی گئی تھیں۔فرنیچر میں فولڈنگ میزیں، کرسیاں، اور مہاگنی کی بنی ایک ڈیسک بھی تھی۔سفری لائبریری میں سو سے زیادہ حوالہ جاتی کتابیں تھیں۔بعد میں دوران سفر مورکرافٹ اور ٹربیک کو گھوڑے کے زین کو سرہانا اور زین کے کپڑے کو بطور بستر استعمال کرنا پڑا۔وہ ہر ماحول میں پنپنے اور جینے کی صلاحیت رکھتے تھے۔لداخ میں اُنھوں نے چائے، روٹی اور شلغم کے سالن پر مہینوں گزارہ کیا۔

مورکرافٹ تب ۵۲ سال کا تھا جب کہ ٹربیک ۱۹ سال کا تھا۔لیہہ میں یہ بڑا صاحب اور چھوٹا صاحب کے نام سے مشہور ہوئے۔لداخ کی تاریخ میں مورکرافٹ کو ماکارافٹ لکھا گیا ہے۔ٹربیک جرمن تھا۔

مورکرافٹ کی ٹیم میں کئی ہندوستانی اہلکار اور منشی تھے۔میر عزت اللہ مترجم اور سیاست کار تھا۔حافظہ محمد فضل ایک اہم رکن تھا۔۱۸۱۲ء میں وہ مورکرافٹ کے ساتھ تبت گیا تھا۔حاجی نجف علی منشی تھا۔اس سفر میں وہ مورکرافٹ کے ساتھ صرف آٹھ ماہ رہا۔اس نے سفر کے دلچسپ احوال لکھے ہیں۔ایک اہلکار وزیر احمد نے مشکل حالات میں بطور سیاست کار اچھا کام کیا اور میر عزت اللہ کے اعصابی طور پر بیمار ہونے پر اُن کی جگہ لی۔جارج گوتھرائی اینگلو انڈین ڈاکٹر تھا۔غلام حیدر خان افغان تھا۔وہ بڑا حوصلہ مند اور کارآمد انسان تھا۔وہ اور وزیر احمد اُن گنے چنے لوگوں میں تھے، جو اس تباہ کن مہم کے تقریباً آٹھ سال بعد ہندوستان صحیح سلامت لوٹے۔

لاہور میں مورکرافٹ نے مہاراجہ رنجیت سنگھ سے ملاقات کی، جس نے پارٹی کو کشمیر سے لداخ جانے کی اجازت دی تاہم مورکرافٹ پروگرام کے مطابق ہماچل پردیش سے لداخ روانہ ہوا۔راستے میں اُنھوں نے سامان سے لدے ٹٹو دیکھے، جو لداخ سے آرہے تھے۔آخر کار ۱۷ ستمبر ۱۸۲۰ء

کی صبح پارٹی گیا پہنچی، جوکلومنالی کی طرف سے لداخ کا پہلا گاؤں ہے۔۱۵دنوں کے بعد انھوں نے پہلی بستی دیکھی تھی۔ مورکرافٹ کے سفرنامے کے مطابق تب گیامیں ۲۰ کے قریب مکانات تھے۔ چھ سے آٹھ کے درمیان سفیدہ کے پیڑ تھے۔ لداخ آنے کے لیے مورکرافٹ کولداخ سرکار کی طرف سے کوئی اجازت نامہ نہیں تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے کئی زبانوں میں اجراکردہ سندات اوررنجیت سنگھ سمیت کانگڑہ کے راجہ،کلو کے وزیروغیرہ کی لداخی حکومت کے نام سفارشی چٹھیاں تھیں۔ لداخی راجہ کے ایک ملازم عبدالطیف نے مورکرافٹ سے لداخ آمد کی وجہ دریافت کی۔ بالائی لداخ کا گورنر کاغاستنزین تھا۔ وہ وزیراعظم کا داماد بھی تھا۔ سابقہ سفر کی وجہ سے میر عزت اللہ عبدالطیف کو اچھی طرح جانتا تھا۔ خواجہ شاہ نیاز نے بھی مورکرافٹ کے حق میں سفارش کی۔ مورکرافٹ نے کاغاستنزین کو کئی چیزیں تحفے میں دیں۔ ان تمام عوامل کی وجہ سے کاغاستنزین نے مورکرافٹ اور پارٹی کولیہہ جانے کے لیے راجہ اورلداخی حکومت کوسفارش کرنا مان لیا۔

مورکرافٹ اور پارٹی کوگیامیں چھوڑ کر کاغاستنزین، عبدالطیف اورمیر عزت اللہ لیہہ روانہ ہوئے۔ عمر رسیدہ کلون اوروزیراعظم نے مورکرافٹ کی آمد کوشک کی نظر سے دیکھا۔ میرعزت اللہ کے مطابق کلون کوہندوستان میں انگریزی حکومت سے متعلق اچھی خاصی معلومات تھیں اورانگریزوں کی نیت پرشک تھا۔ وہ بولا' یہ پہلے تاجروں کے بھیس میں آتے ہیں۔ قدم جمانے کے بعداس ملک پرقبضہ جماتے ہیں، خواجہ شاہ نیاز نے، جن کی رائے اور مشورے کوکلون اوردوسرے زعما اہمیت دیتے تھے، اپنے دلائل سے قائل کیا کہ مورکرافٹ کولداخ آنے کی جازت دینے سے لداخ کو فائدہ ہوگا۔ کلون کو بڑے اختیارات تھے۔ راجہ چھپیل تنڈوپ نمگیل ذہنی طور پر قدرے مریض تھااورسرکاری امور میں بہت کم دخل دیتا تھا۔ کلون نے مورکرافٹ کولیہہ آنے کی اجازت دے دی تاہم یہ کہا کہ وہ نوبراہ کے راستے لیہہ آئے کیونکہ لیہہ اورگیا کے درمیان کئی گاؤں میں چیچک کی بیماری پھوٹ پڑی تھی۔ کاغاستنزین یہاں بھی آڑے آیااورنوبراہ کا چکرلگانا نہیں پڑا۔ مورکرافٹ گیا سے روانہ ہوا۔ عورتیں چھتوں پر سے پارٹی کے افراد کی روانگی کودیکھنے لگیں۔ راستے میں مورکرافٹ کی

ملاقات خواجہ شاہ نیاز سے ہوئی۔ مورکرافٹ کی سفارش پر بعد میں رنجیت سنگھ نے خواجہ کی جاگیر بحال کی۔ لیہہ کے پاس لمبی مانے دیواریں دیکھ کر مورکرافٹ کو حیرت ہوئی۔

۲۴ ستمبر کو مورکرافٹ کی پارٹی لیہہ پہنچی۔ لیہہ کی ساری آبادی اُنھیں دیکھنے چھتوں، دیواروں، گلیوں اور بازار میں اُمڈ پڑی۔ مورکرافٹ نے لوگوں کی بھیڑ میں ننگے سرلامے، یارقندی اور پگڑی لگائے کشمیری دیکھے۔ ستمبر کے مہینے میں لیہہ میں تاجروں کی ریل پیل اور چہل پہل رہتی تھی۔ ان دنوں لیہہ قصبہ فصیل کے حصار میں تھا۔ فصیل کی حالت اچھی تھی۔ فصیل سے باہر چند مکانات بنے تھے۔ مورکرافٹ اور اس کی پارٹی کے ارکان کو رہائش کے لیے فصیل کے اندر ایک بڑا مکان دیا گیا، جو کلون کی ملکیت تھا۔ اس کے ساتھ ایک باغ بھی تھا۔ غالباً یہ مکان موجودہ لوبدینگ محلّہ میں تھا، جہاں گیالپو کا باغ تھا۔ خزاں میں پتّوں کے گرنے سے جگہ کا نام لوبدینگ یا ''بھرمار پتوں والی جگہ'' پڑا تھا۔ مورکرافٹ کے مطابق تب لیہہ میں ۱۵۰۰ مکانات تھے جن میں دو تہائی آبادی بودھ اور ایک تہائی مسلمان تھی۔

مورکرافٹ کے رہنے کا انتظام ایک کشمیری تاجر رسول جو کے ذمہ ڈالا۔ ایک اور کشمیری تاجر میر محسن علی مورکرافٹ، کلون اور راجہ کے مابین میٹنگوں کا اہتمام کرتا تھا۔ یہ دونوں تاجر آرغون ہوسکتے ہیں۔ کئی دفعہ سفرناموں وغیرہ میں آرغون کو کشمیری کہا گیا ہے۔ مورکرافٹ کی آمد سے چار روز پہلے ۲۰ ستمبر کو میر عزت اللہ اور حاجی سید نجف علی نے کلون چھوانگ تنڈوپ سے ملاقات کی تھی۔ میر نے مورکرافٹ کی طرف سے کلون کو لکھ کر دیا کہ اس کا دورہ محض تجارتی ہے ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے جاسوسی کرنا یا لداخ پر حملہ کرنا نہیں ہے۔

سید نجف علی کے مطابق وزرا سنجیدہ اور سمجھ دار تھے۔ میر عزت اللہ نے ان سے کہا کہ اگر آپ صاحب بہادر (مورکرافٹ) سے دوستی کا ہاتھ بڑھائیں گے اور ان کی بات مانیں گے تو وہ اپنے سے بڑوں کو لکھے گا کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ لداخ کے راجہ کو کوئی گزند نہ پہنچائے اور وہ یقیناً ضرر رساں مطالبات نہیں کرے گا۔ نجف علی نے لکھا ہے: 'میر عزت اللہ نے گورنر کاغاستزین کو کہا کہ لداخ آپ کے ہاتھ سے نکل جائے گا اور رنجیت سنگھ اس کو اپنے زیرنگیں لائے گا۔'

نجف علی کے مطابق عزت اللہ کی باتیں اور مشورے سینئر وزیر سنتے تھے۔ خواجہ شاہ نیاز میر پر مہربان تھے۔ جامع مسجد کے امام سمیت دوسرے مسلمانوں نے مورکرافٹ کی حمایت کی۔ تاہم زیادہ تر کشمیری تاجر مورکرافٹ کے مخالف تھے۔

سید نجف علی رقم طراز ہیں: 'ان دنوں لیہہ میں ۳۰۰ کشمیری مسلمان تھے۔ ان میں ۲۰ تاجر تھے۔ وہ پشمینہ اور چائے اینٹوں کی خرید وفروخت کرتے تھے۔ (تبتی چائے چھوٹی اینٹ کے روپ میں ہوتی ہے) یارقند، کشمیر اور لہاسہ میں ان کے ایجنٹ تھے۔ حکومت نے سارے تجارتی امور آرغون مسلمانوں کو سونپے تھے۔'

سیاسی صورت حال پر تبصرہ کرتا ہوا وہ لکھتا ہے: 'کلون کو بڑے اختیارات ہیں.......... وزرا بیرون دُنیا سے لداخ کے تعلقات سے اور ثالثی کے لیے آرغون مسلم یا کشمیریوں کو بروئے کار لاتے ہیں.......... آرغون سترہویں صدی سے یہاں آباد ہیں۔' لداخی راجہ سے متعلق نجف علی کا تاثر ہے کہ وہ اجنبیوں سے ملنے میں جھجکتا ہے۔،

ایک جگہ وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ کشمیری مسلمانوں کے علاوہ سفارتی معاملات میں وسط ایشیا کے یارقندیوں کی خدمات بھی حاصل کی جاتی تھیں۔ تمبا کونوشی کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے کہ اکبر اعظم کے دربار میں تمبا کو پہنچنے کے بعد لداخی راجہ تمبا کو استعمال کرنے لگے تھے۔

نجف علی نے لوگوں کے رسم ورواج، لباس، خوراک، تفریحات اور بودھ مسلم تعلقات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

ایسا لگتا ہے کہ گیا سے مورکرافٹ اور دوسرے افراد لیہہ پہنچنے سے پہلے کلون نے میر عزت اللہ کو بلایا اور متعدد سوالات کیے۔ اس میٹنگ میں نجف علی بھی موجود تھا۔

کلون نے پوچھا۔ 'انگریز صاحب کا ملک اور راجدھانی کہاں ہیں۔' میر نے جواب دیا کہ یہ ساتویں (clime) میں شمال اور جنوب کے درمیان ہے۔

کلون: صاحب کا ملک سرد ہے یا گرم؟

میر: سرد ہے۔

کلون: اس سرد ملک میں کون سے پھل پیدا ہوتے ہیں؟

میر: اُنھوں نے پودوں کو شیشوں والے حمام میں ڈھانپ کر رکھا تھا۔ میوہ دار درختوں کی ضرورت کے مطابق وہ اُنھیں گرم کرتے ہیں۔ اسی طرح گرمیوں میں سرد ملکوں کے میوے پیدا ہوتے ہیں اور سردیوں میں گرم ملکوں کے میوے پیدا ہوتے ہیں۔'

میر کے بیان کے مطابق انگریز انیسویں صدی کے شروع میں گرین ہاؤس سے واقف تھے۔

پھر کلون نے پوچھا: 'کیا انگریزوں کی ملازمت میں گورکھے بھی ہیں؟'

میر نے جواب دیا: 'ہندوستان میں انگریزوں کی ملازمت میں بہت لوگ ہیں۔ یہاں صاحب بہادر کے ساتھ چودہ گورکھے ہیں .... اور الموڑہ سے آئے ہیں۔

کلون: کیا سارے انگریز آرٹ اور سائنس میں ماہر ہوتے ہیں یا ان میں چند ہی ماہر ہوتے ہیں؟'

میر: 'تمام انگریز سائنس اور آرٹ میں ماہر ہوتے ہیں۔'

کلون: 'یہ صاحب جو یہاں آیا ہے' کون سا ہنر جانتا ہے؟'

میر: یہ سچ مچ علم والے ہیں۔ خاص طور پر جراحی میں ماہر ہیں۔

اس زمانے میں ایک لداخی کے لیے گھڑی عجوبہ تھی۔ کلون نے پوچھا۔ فرنگی گھڑی سازی خوب جانتے ہیں۔ کیا ان کے علاوہ دوسرے بھی یہ ہنر جانتے ہیں یا نہیں جانتے؟

میر: ترکی اور دوسرے ملکوں میں بھی گھڑی بنائی جاتی ہے اور مرمت کی جاتی ہے، لیکن انگریز زیادہ ماہر ہیں۔ گھڑی بنانے میں ان کا کوئی ثانی نہیں۔

کلون: میں نے سنا ہے کہ انگریزوں کا بادشاہ ایک عورت ہے۔ کیا یہ سچ ہے یا جھوٹ؟

میر: اگر انگریز بادشاہ کو صرف بیٹے ہوں، تو ایک بیٹا تخت کا حق دار ہوتا ہے۔ اگر کوئی بیٹا نہیں، صرف بیٹی ہے تو بیٹی تخت نشین ہوتی ہے۔ مرد اور عورت دونوں تخت و تاج کے وارث ہو سکتے ہیں۔

پھر کلون نے میر عزت اللہ کی فہم و فراست کی تعریف کی۔

یکم اکتوبر کو کلون نے مور کرافٹ کو اپنے ہاں بلایا۔ لیہہ کے لوگ ایک دفعہ پھر قصبے کی گلیوں،

دیواروں، چھتوں وغیرہ پر مورکرافٹ اور اس کے چند ساتھیوں کو دیکھنے کے لیے جمع ہوئے۔ ان لداخیوں نے اس سے پہلے انگریز کو نہیں دیکھا تھا۔ عام لوگوں نے اتنا سنا تھا کہ تقریباً ایک سو سال پہلے دو یوروپی لیہہ میں آئے تھے۔ یہ دو اطالوی پادری فادر ڈیزی ڈیری اور فادر فریرے تھے جو ۱۷۱۵ء میں لیہہ آئے تھے۔ ۱۸۱۲ء میں ایک یوروپی فریزر لیہہ آیا تھا۔ اس سے متعلق عام لوگوں کو علم نہیں تھا اور گمنام تھا۔

کلون نے مورکرافٹ سے مصافحہ کیا۔ صحت کا حال پوچھا اور عمر دریافت کی۔ موسم کا تذکرہ کیا۔ مورکرافٹ کو کرسی پیش کی۔ کلون کی نشست کے اوپر ایک شامیانہ تھا، جس پر ٹانگے ہوئے ایک کپڑے پر اژدھا کی شبیہ بنی تھی۔ کلون کا لباس سادہ تھا اور سر پر مخملیں ٹوپی تھی۔ وہ ساٹھ سال کی عمر کا لگتا تھا۔ زیادہ تر دانت گر گئے تھے۔ چہرے سے زیرک لگتا تھا۔

کلون نے انگلستان کے بادشاہ کا نام پوچھا اور سوال کیا کہ ان کے روس، چین اور رنجیت سنگھ سے کیسے تعلقات ہیں۔ پھر متجسس کلون نے مورکرافٹ کی لداخ آمد پر ہمسایوں کی تشویش کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔ 'لہاسہ سے آیا ہوا ایک افسر پوچھتا ہے کہ یہ یوروپی کیوں آئے ہیں؟ کشمیر کے سکھ گورنر نے دھمکی دی ہے کہ ان انگریزوں کو زیادہ شہ دینے سے رنجیت سنگھ ناراض ہوگا۔ سکردو کے راجہ احمد شاہ ان کی آمد کا سبب جاننا چاہتا ہے۔ ہماچل کے بشاہیر کے راجہ نے اپنی جگہ صلاح ومشورے دیئے ہیں۔

تب خواجہ شاہ نیاز نے کہا۔ 'لداخ ایک آزاد ملک ہے۔ یہ کشمیر اور دوسروں کے ماتحت نہیں ہیں۔

مورکرافٹ نے لداخ سے تجارت کے لیے ذیل کی چار نکاتی تجویزیں رکھیں۔

لداخ اور دوسرے ملکوں کی آزادانہ تجارت، انگریزوں کی مصنوعات کے محصولات میں کچھ رعایتیں، لیہہ میں تاجروں کے لیے ایک مکان کی فراہمی اور مغربی تبت کے گرمائی صدر مقام گرتوق میں انگریز تاجروں کے لیے نیتی گھاٹ کا درّہ واگزار۔ کلون نے تین نکات مان لیے۔ نیتی درہ کھولنے سے متعلق کلون نے کہا کہ اس کے لیے تبتی حکومت سے مشورہ کرنے اور اس کی منظوری کی ضرورت ہے۔

بات چیت کے دوران کلون ایک چھوٹا سا حقہ پینے لگا۔ حقے پر زیبائشی کام کیا ہوا تھا۔ میٹنگ خوش گوار رہی۔

کشمیری تاجروں نے فرنگیوں کے ساتھ تجارتی معاہدے کی مخالفت کی۔ ان کو اندیشہ تھا کہ اس سے ان کے پشمینہ کے کاروبار کو نقصان پہنچے گا جس پر صدیوں سے ان کو اجارہ داری حاصل تھی۔ کشمیری تاجران کلون سے مایوس ہوئے اور اُنھوں نے لیہہ کے لونپو (گورنر) کو اپنی عرضداشت پیش کی۔ خواجہ شاہ نیاز نے لونپو کو بھی اپنا ہمنوا بنا لیا۔ مختلف حلقوں سے دباؤ کی وجہ سے کلون کے موقف میں تبدیلی آتی رہی تاہم مورکرافٹ نے بھی اپنا حلقہ اثر بنالیا تھا۔ لیہہ کی جامع مسجد کے اسی سالہ امام رسول شاہ اور اکثر مقامی لوگوں نے اس کی حمایت کی۔ امام کا مکان جامع مسجد کے ساتھ تھا جس کی کھڑکی سے مورکرافٹ نے پولو، گھوڑ دوڑ اور کوشین ناچ دیکھے۔

مورکرافٹ بڑا ملنسار اور روادار تھا۔ ہر ایک سے گھل مل جاتا تھا۔ مذہب کے معاملے میں وہ آزاد خیال تھا۔ اس کا نظریہ تھا کہ ہر آدمی سے کچھ نہ کچھ سیکھا جا سکتا ہے۔

تجارت سے متعلق تبتی حکومت کی منظوری کے لیے سردی کا موسم اس کو لیہہ میں گزارنا تھا لیکن تبت انگریزوں سے تجارت کے خلاف تھا۔

کلون کے بعد راجہ چھیپل تنڈوپ نمگیل نے مورکرافٹ کو ملاقات کا شرف بخشا۔ تخت کے بجائے وہ ایک کرسی پر بیٹھا تھا۔ بالائی لداخ کا گورنر کاغاستزین بھی اس میٹنگ میں موجود تھا۔ راجہ نے مورکرافٹ سے خیر خیریت اور سفر کے احوال پوچھے۔ بات چیت کو عبداللطیف نے میر عزت اللہ کے لیے فارسی میں ترجمہ کیا اور میر نے مورکرافٹ کو انگریزی میں بتایا۔ مورکرافٹ اور مہمانوں کو لداخی چائے سے تواضع کی۔ راجہ نے اپنے لیے اپنی جیب سے پیلے رنگ کی چینی پیالی نکالی۔ گورنر کاغاستزین نے شاہ بلوط کی لکڑی کی بنی پیالی نکالی جس کے کناروں پر چاندی کا پترا جڑا تھا۔

مورکرافٹ نے مریضوں کا علاج و معالجہ کرنا شروع کیا۔ وٹرنری سائنس کے علاوہ اس نے ڈاکٹری کا امتحان بھی دیا تھا۔ لداخیوں کے لیے ایلوپیتھک کا نظام علاج بالکل نیا تھا۔ لداخ میں

صدیوں سے واحد اچی نظام علاج مروج تھا۔ مور کرافٹ چھوٹا موٹا آپریشن بھی کرنے لگا۔ اس کے پاس بہت سے مریض آنے لگے۔ لداخ میں کوڑھ کا مرض عام تھا۔ شروع میں مور کرافٹ نے سوچا کہ یہ زیادہ چائے پینے سے ہوگا۔ لیہہ کے پاس آبادی سے دور ایک عمارت میں کوڑھ کے مریضوں کو منتقل کیا جاتا تھا جسے ''زے کھنگ'' یا کوڑھ خانہ کہا جاتا تھا۔ یہاں علاج کا کوئی انتظام نہیں تھا۔

مور کرافٹ لیہہ سے باہر دیہات میں مریضوں کو دیکھنے لگا اور بہت سے مریض آنے لگے۔ وہ مریضوں کے درمیان ایک قالین پر بیٹھتا تھا۔ مریض کھانے پینے کی اشیا جیسے روٹیاں، ستو، مکھن، دودھ، دہی اور اکا دُکا بھیڑ بکریاں لاتے۔ چائے دانیوں میں چائے اور صراحیوں میں جو کی شراب چھنگ پہنچتی۔ اس کے ملازم ان اشیائے خوردنی کو استعمال کرنے لگے۔ لیہہ کا گورنر اس کے علاج سے صحت یاب ہوا۔ راجہ بھی اپنی صحت سے متعلق اس سے مشورہ لینے لگا۔ وہ گھروں، گنپوں اور محلات میں پہنچتا تھا اور اس کی شہرت لداخ کی سرحدوں سے نکل کر بلتستان، تبت اور مشرقی ترکستان تک پہنچی۔ لداخ میں وہ ''گو بافیئنگ'' یا انگریز نمبردار کے نام سے مشہور ہوا۔ اس زمانے میں لداخ میں نمبردار کی بڑی قدر و منزلت ہوگی۔ خود مور کرافٹ کو محسوس ہوا کہ اس کا نام لداخ کے لوک ادب میں ہوگا۔ اس کے دوستوں میں بہت سے سرکردہ لوگ تھے۔

اپنے مسلح پلاٹون کو چاق و چوبند رکھنے کے لیے وہ اپنی رہائش گاہ کے احاطہ میں ڈرل اور پریڈ کراتا تھا۔ بچے بالے ڈیوڑھی اور دیوار سے اُنھیں دیکھتے تھے۔ بچے جب مور کرافٹ کو دیکھتے تو کندھے سے بید کے ڈنڈے لگائے اس کے سپاہیوں کی نقل کرتے تھے۔

لداخی کچن کے دھوئیں سے مور کرافٹ سخت پریشان تھا جو گوبر جلانے سے ہوتا تھا۔ اس سے آنکھوں کی بیماریاں ہوتی تھیں۔ اس نے اس کا حل سوچا اور ایک چمنی کا خاکہ بنایا۔ اس نے کلون کے سامنے چمنی کی تجویز رکھی لیکن قدامت پرست کلون متاثر نہیں ہوا۔ چیچک کے انسداد کے لیے ٹیکہ کرانے میں بھی کلون نے دلچسپی نہیں دکھائی۔

مور کرافٹ لداخ کی جغرافیائی اہمیت سے بخوبی واقف تھا اور روس کی توسیع پسند پالیسی پر نہ صرف اس کی نظر تھی بلکہ اس کو گہری تشویش تھی۔ پروفیسر ایچ ڈبلیو سی ڈیلے ویس لکھتا ہے:

'مور کرافٹ حقیقی طور پر گریٹ گیم کا اولین انگریز کھلاڑی تھا، جو برطانیہ اور روس نے وسط ایشیا میں اپنی برتری حاصل کرنے کے لیے اُنیسویں صدی اور اس کے بعد کھیلا تھا۔'

لیہہ میں مور کرافٹ کو ایک روسی جاسوس میکھتی رافے لوف کی سرگرمیوں کا علم ہوا۔ اس نے اپنا نام آغا مہدی رکھا تھا۔ وہ یہودی تھا۔ پہلے پہل وہ ۱۸۰۸ء میں ایک تاجر کے بھیس میں آیا تھا اور یہاں سے کشمیر گیا تھا۔ زار روس کی طرف سے لداخ کے راجہ کے نام ایک خط بھی لایا تھا۔ مور کرافٹ نے یہ خط لیہہ میں دیکھا۔ تب سے وہ کئی مرتبہ لداخ آیا تھا۔ مور کرافٹ نے سنا کہ وہ دوبارہ لداخ آرہا ہے لیکن وہ لیہہ نہیں پہنچ سکا۔

قراقرم پر پراسرار طریقے سے اس کی موت ہوئی۔ اس کا ساتھی محمد ظہور لیہہ پہنچا۔ اس کے پاس روس کے شہنشاہ الیگزنڈر زار کی طرف سے مہاراجہ رنجیت سنگھ کے نام ایک خط تھا جس پر روس کے وزیر خاجہ Nesselrode نے دستخط کیا تھا۔ یہ خط لداخی حکومت اور مور کرافٹ نے مہاراجہ تک پہنچنے نہیں دیا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد مور کرافٹ نے لیہہ میں سوماڈی کوروسو سے اس کا لاطینی میں ترجمہ کرایا اور کلکتہ بھیجا لیکن ستم ظریفی ہے کہ برطانوی ہند نے سوماڈی کورو کو ایک جاسوس سمجھا۔ سوما ہنگری کا ایک اسکالر تھا، جس نے زنسکار میں تحقیقی کام کیا۔ اس کا ذکر آگے آئے گا۔

رنجیت سنگھ کو مور کرافٹ کی سرگرمیوں کی برابر خبر ملتی تھی۔ اس نے ایک قاصد کے ہاتھ مور کرافٹ کو خط بھیجا کہ وہ لداخ میں کیا کر رہا ہے۔ مور کرافٹ نے جواب میں لداخی حکومت سے ہوئے تجارتی معاہدے کا ذکر کیا۔

مور کرافٹ کی اماں گیا مو (رانی) سے جان پہچان ہوئی جن کو اس نے سونا اور مونگے تحفے میں دیئے اور رعایتی دام پر موتی فروخت کیا۔ رانی کی سفارش پر مور کرافٹ کو نوبراہ جانے کی اجازت ملی۔

نوبراہ کے ننکسو کا غاسترزین کے اہل خاندان سے وہ کئی بار ملا۔ مورکرافٹ لکھتا ہے: کاغا سترزین کی بہولگ بھگ بیس سال کی ایک دراز قد، خوبرو، سپید رنگ اور بھورے بالوں والی لڑکی تھی۔ چہرہ بیضوی، رخسار گلابی اور دانت عمدہ تھے۔ گلے میں سونا چاندی کے گہنے تھے۔ وہ لیہہ جا رہی تھی۔ اس کے ساتھ اس کا بھائی اور پچاس ملازم عورتیں تجارت اور نظم و نسق میں شریک کار تھیں۔ مورکرافٹ بڑا حسن پرست تھا۔ خوبصورت عورتوں کا وہ ذکر کرتا ہے۔ مولبیک کے نونوکلون کی بیوی سے متعلق وہ رقم طراز ہے: 'بارہ بچوں کی ماں ہونے کے باوجود وہ خوبصورت اور عین شباب میں نظر آ رہی تھی'۔

لیہہ میں وہ ایک خوب صورت لڑکی پر فریفتہ ہوا تھا۔ اس فریفتگی نے کیا رخ اختیار کیا اور کیا رنگ دکھایا وہ خاموش ہے۔

نوبراہ میں وہ پنامیک گیا جہاں گرم پانی کے چشمے دیکھے۔ وہ دگر گاؤں گیا، جہاں تب بیس مکانات تھے۔ خزاں میں وہ نوبراہ سے لیہہ لوٹا۔ اس سال رنجیت سنگھ کا نمائندہ دوسری مرتبہ لیہہ آیا تھا اور خراج جاری رکھنے کے لیے رنجیت سنگھ کا حکم نامہ لایا تھا، بصورت دیگر سخت اقدام کرنے کی دھمکی دی تھی۔

مورکرافٹ کو یہ جان کر بڑی حیرت ہوئی کہ لداخ دہلی کی حکومت کا باج گزار رہا ہے۔ کلون اور کاغاسترزین نے اس کو بتایا کہ لداخ کی حکومت اورنگ زیب کی فوجی مدد سے لداخ سے قلمق حملہ آوروں کو پسپا کرنے کے عوض دربار دہلی کو محمد شاہ کے عہد تک تھوڑا سا خراج دیتی تھی۔ اس کے بعد احمد شاہ ابدالی کی حکومت کو یہ خراج دیا گیا۔ مورکرافٹ کے نوآبادیاتی دماغ نے معاملے کی نوعیت کو فوراً سمجھ لیا اور کلون سے اورنگ زیب کے خطوط حاصل کیے۔ اپنے دوست Metcalfe کو جو خفیہ اور سیاسی شعبے کا سکریٹری تھا، ۱۲۴ صفحات کا ایک لمبا خط لکھا، جس میں یہ اُجاگر کیا کہ لداخ دہلی کا باج گزار رہا ہے اور اس کی وفاداری دہلی کے ساتھ ہے اس لیے اس کو برطانوی ہند کے تحفظ (Protectorate) میں لیا جائے۔ اس نے یہ بھی لکھا کہ اگر پروٹکٹوریٹ کی تجویز مسترد کی جاتی ہے تو وہ اس فیصلے کو تب تک عمل آوری سے باز رکھے، جب تک وہ اپنی دلیل دینے کلکتہ نہ پہنچے۔ خط کے

ساتھ اس نے اورنگ زیب کے خطوط اور حکم نامے منسلک بھی کیے۔اس نے جذبات میں آکر رنجیت سنگھ کو بھی خط لکھا کہ لداخ ماضی قریب تک دہلی کے ساتھ تھا۔ان حقائق سے کلکتہ میں برطانوی ہند سرکار کو آگاہ کیا گیا ہے، جس کے متعلق وہ جلدی سن لے گا۔

رنجیت سنگھ نے مورکرافٹ کا خط دہلی میں انگریز ریزیڈنٹ سر ڈیوڈ Ochterlony کو بھیجا۔ جو مورکرافٹ کی مہم کو پسندیدہ نگاہوں سے نہیں دیکھتا تھا۔اس نے یہ خط گورنر جنرل کو بھیجا۔رنجیت سنگھ کے نام براہ راست خط لکھنے کو گورنر جنرل نے بہت برا مانا اور رنجیت سنگھ کو لکھا کہ مورکرافٹ کے خط سے برطانوی ہند سرکار کا کوئی تعلق نہیں ہے۔شمالی ہند میں انگریز فوج کم تھی اور انگریز حکومت رنجیت سنگھ سے جھگڑا کر کے کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتی تھی۔مورکرافٹ نے اپنے دوست Metcalfe کو جو طویل خط لکھا تھا، وہ گورنر جنرل کو نہیں ملا تھا۔دراصل میٹ کلفے خفیہ اور سیاسی شعبے کا سکریٹری نہیں رہا تھا اور کسی اور شعبے میں اس کی تبدیلی ہوئی تھی۔

مئی ۱۸۲۱ء میں لداخی حکومت اور مورکرافٹ کے درمیان ایک تجارتی معاہدے پر دستخط ہوئے، جس سے پشمینہ کے تاجر بڑے مایوس ہوئے۔

مورکرافٹ لداخ کو برطانوی ہند کی چھتر چھایا میں دیکھنا چاہتا تھا اور وسط ایشیا کو انگریزوں کے حلقہ اثر ورسوخ میں لانے کا حامی تھا۔

مورکرافٹ کے پاس کشمیر کے آخری افغان گورنر سردار محمد عظیم خان کے خطوط کی کاپیاں تھیں۔ محمد عظیم خان کو رنجیت سنگھ کی فوج نے ۱۸۱۹ء میں نکال دیا تھا۔ان خطوط میں محمد عظیم خان نے کمپنی پر زور دیا تھا کہ وہ اپنا دائرۂ اختیار کشمیر تک بڑھائے۔کمپنی نے افغان گورنر کی بات نہیں مانی۔مورکرافٹ نے ان خطوط کی کاپیاں کلون کو پیش کیں۔

لیہہ میں مورکرافٹ کے جہاں بہت سارے دوست تھے، وہاں دشمن پیدا ہو گئے تھے۔۲۷ جون ۱۸۲۱ء کی رات جارج ٹریبک کھڑکی کے ساتھ، جس پر کاغذ کا پردہ چسپاں تھا، دیر گئے تک کام کرتا رہا۔تھوڑی دیر پہلے جب اس نے اپنی نشست چھوڑی تو باہر سے ایک گولی آئی۔اگر وہ اپنی

نشست پر ہوتا تو غالباً مر گیا ہوتا۔ مورکرافٹ اور ٹریبیک کو خدشہ ہوا کہ کوئی ان کی جان لینے کے درپے ہے۔ ایک رات مورکرافٹ خیمے میں سو رہا تھا۔ اس نے خیمے کے باہر انسانی پیروں کی چاپ سنی۔ مورکرافٹ کی آنکھیں کھلیں۔ مورکرافٹ نے باغ کے مالک سے پوچھا تو اس نے کہا کہ باغ میں بھوت پریت آتے ہیں۔ چاندنی رات تھی، مورکرافٹ نے تین آدمیوں کو دور سے ان کے خیمے کو گھورتے دیکھا۔ مورکرافٹ کو ان آدمیوں کی نیت پر شک ہوا۔ وہ خیمے میں واپس آیا۔ پھر کسی نے خیمے کے اندر مٹھی بڑھائی اور جلدی سے واپس لے لی۔ مورکرافٹ پستول لے کر فوراً باہر آیا۔ ایک آدمی درختوں کے جھنڈ کی طرف جا رہا تھا۔ مورکرافٹ نے اس کی طرف پستول چلایا اور اپنی تلوار لے کر اس کا پیچھا کیا۔ دوسری صبح اس نے صرف دو آدمی دیکھے۔ یہ پتہ چلا کہ تیسرا آدمی اچانک بیماری سے مر گیا اور اس کی لاش دریا برد کی گئی۔ مورکرافٹ نے سوچا کہ وہ اس کی گولی سے مر گیا ہوگا۔

ایک رات کسی نے اس کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ اس نے دروازہ کھولا۔ دو آدمی سر سے کمبل لپیٹے کھڑے تھے۔ ایک آدمی نے اپنے کپڑے میں سے تھوڑا سا مکھن، کچھ سوکھے پھل اور کھانے کی کچھ ہلکی چیزیں نکالیں اور ہر ایک میں سے تھوڑا تھوڑا لے کر اس کے منہ میں ٹھونس دیا اور سلام کر کے جلدی چل پڑے۔ مورکرافٹ نے ان کو اپنا دشمن نہیں سمجھا بلکہ یہ سوچا کہ یہ ان کو دشمن کے زہریلے کھانے سے خبردار کر رہے ہیں۔ وہ اور ٹریبیک محتاط ہوئے۔ ان کو یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اس سازش کے پیچھے کون ہیں البتہ ان کو رنجیت سنگھ پر شک تھا، جس کے ایجنٹ لداخ میں ان کو جان سے مارنا چاہتے ہیں۔ مورکرافٹ کو وہم تھا کہ اس کو زہر دیا جائے گا۔ چنانچہ اس نے اپنے ایک خط میں اپنے ایک دوست جارج سنڈرس کو اس اندیشے سے آگاہ کیا۔

لیہہ میں مورکرافٹ کی موجودگی کے دوران افواہ پھیلی کہ رنجیت سنگھ کی فوج ایک تھانیدار کی سرکردگی میں لداخ آ رہی ہے۔ مورکرافٹ نے رنجیت سنگھ کو لکھا کہ اس کا نتیجہ سنگین ہوگا اور کشمیر میں پشمینہ کی برآمدات ختم ہوں گی، جس سے کشمیر کی معیشت تباہ ہوگی۔

لداخ کی شاہی تاریخ (لداخ کرانیکل) کے مطابق مورکرافٹ نے لداخ کی حفاظت کے

لیے ایک قلعہ کی تعمیر کی پیش کش کی تاہم لداخی حکام نہیں مانے۔ مورکرافٹ نے لکھا ہے کہ لداخ کے فلک بوس پہاڑ، گہری وادیاں اور بہت کم استعمال ہونے والے تنگ راستے حملہ آوروں کی راہ میں حائل ہوں گے۔ برطانوی سرکار کو خطے میں امن رکھنے کے لیے ماہانہ ایک ہزار روپیے سے زیادہ خرچ نہیں کرنے پڑیں گے۔ لیکن مورکرافٹ کی ساری کوششیں بیکار گئیں۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے لداخ کی وفاداری کی پیش کش قبول نہیں کی۔ کمپنی کو گورکھوں، پنڈاروں اور مرہٹوں کے ساتھ لڑائیوں میں بڑا خرچ آیا تھا اور رنجیت سنگھ سے بھڑنا نہیں چاہتی تھی۔ رنجیت سنگھ کے ساتھ ۱۸۰۹ء میں ایک معاہدہ بھی ہوا تھا، جس کے تحت رنجیت سنگھ دریائے ستلج کے اس پار (لداخ کی جانب) پیش قدمی کر کے اپنی سلطنت کو بڑھا سکتا تھا۔

مورکرافٹ نے وسط ایشیا میں سفر کرنے کی اجازت کے حصول کے لیے اپنے قاصد بھیجے تھے لیکن وہ ناکام لوٹے۔ اس نے میر عزت اللہ کی قیادت میں دوبارہ نمائندے بھیجے۔ اس دوران وہ جھیل پنگونگ دیکھنا چاہتا تھا۔ کلون کو تبت سرکار کا دباؤ تھا کہ مورکرافٹ کو چانگ تھنگ جانے کے لیے گھوڑے، رسد وغیرہ فراہم نہ کرے۔ چنانچہ مورکرافٹ نے باربرداری کے لیے سو بھیڑیں خریدیں اور رہبری کے لیے تبتی گائیڈ لیے۔ مورکرافٹ اور ٹریبک چودہ ملازموں کے ساتھ پنگونگ روانہ ہوئے۔ پنگونگ جھیل دیکھنے کے بعد مورکرافٹ کو معلوم ہوا کہ چینی حکومت کی طرف سے تین آدمی اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے لیہہ پہنچے ہیں۔ وہ بڑی تیزی سے لیہہ لوٹے۔ لیہہ پہنچنے پر معلوم ہوا کہ تینوں آدمی واپس یارقند لوٹے ہیں۔ کلون نے ان چینیوں کو اپنی طرف سے ایک خط حوالہ کیا تھا جس میں لکھا تھا کہ مورکرافٹ اور اس کی پارٹی تجارت کے سلسلے میں یارقند جا رہے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کو علاقے سے گزرنے کے لیے پروانہ راہداری اجرا کرنے کے لیے سفارش کی تھی لیکن چین کی حکومت پر اس کا کچھ اثر نہیں ہوا۔ میر عزت اللہ یارقند سے خالی ہاتھ لوٹا۔ میر تین چینیوں کو اپنے ساتھ لیہہ لایا۔ آغا مہدی اور کشمیری تاجروں نے چین کی حکومت کے کان بھر دیئے تھے اور یہ بات پھیلائی تھی کہ مورکرافٹ فوج کے ساتھ آ رہا ہے۔ پھر یہ انکشاف

ہوا کہ کلون نے جو سفارشی خط لکھا تھا، اس کا فارسی میں غلط ترجمہ کیا گیا تھا۔ تاجروں نے الگ سے خطوط بھیجے تھے۔ مورکرافٹ نے تاجروں کو سخت ٹوکا اور نیا خط لکھا۔ چین کے تینوں ملازموں کو واپس آنے اور تاخیر سے واپسی کے لیے معاوضہ دیا۔ راجہ کے ملازم عبداللطیف اور مورکرافٹ کے ایک ایرانی ملازم کو دوبارہ یارقند بھیجا۔ تب دسمبر کا مہینہ تھا اور کڑاکے کی سردی تھی۔

جنوری ۱۸۲۲ء میں چند چینی ملازم مورکرافٹ سے متعلق مزید معلومات حاصل کرنے کے لیے لیہہ پہنچے۔ مورکرافٹ نے ان کے لیے بڑی ضیافت کا انتظام کیا، جس میں سو سے زیادہ لوگ شریک ہوئے۔ مورکرافٹ کو ایسی پارٹیوں کے اہتمام کرنے میں بڑی دلچسپی تھی، البتہ وہ خود ہر قسم کے ماحول میں رہنے کا عادی تھا۔

اس دوران مورکرافٹ کو کئی انوکھے تجربات اور آزمائشوں سے گزرنا پڑا۔ اپریل ۱۸۲۲ء میں جب لداخی راجہ ایک مذہبی تقریب میں شرکت کرنے کے لیے گیا تھا لیہہ کی فصیل کے ایک پھاٹک پر ایک اشتعال انگیز اشتہار چسپاں پایا۔ اس میں راجہ کے خلاف کئی الزامات لگائے گئے تھے اور دھمکی دی تھی کہ غنمی یا لداخی نمائندے راجہ کو معزول کر کے حکومت مورکرافٹ اور ٹریبیک کو حوالہ کریں گے۔ مورکرافٹ کو یہ حرکت اس کے مخالفین کی سازش لگی جو اس کی تجارتی پالیسی کی مخالفت کرتے ہیں اور راجہ کو اس سے بدظن کرنا چاہتے ہیں۔

اس سے پہلے ماتھوگمپہ کے سالانہ تہوار پر لہا (کاہن) نے راجہ چھیپل تنڈوپ نمگیل کو اپنے ولی عہد کے حق میں تخت سے دستبردار ہونے کے لیے کہا تھا۔ راجہ اس کے لیے تیار ہو گیا تھا لیکن رانی نے باز رکھا۔ مورکرافٹ نے سنا تھا کہ لیہہ لونپو (گورنر) راجہ کو معزول کر کے اپنے بیٹے کو لداخ کا حکمراں بنانا چاہتا تھا۔

راجہ لیہہ میں کرزو باغ کے محل میں بھی قیام کرتا تھا جہاں ایک مرتبہ راج کمار چھوانگ رفتن نمگیل سے مورکرافٹ نے ملاقات کی۔ تب وہ دس یا گیارہ سال کا تھا۔ راج کمار کا بدن شال میں چھپا ہوا تھا۔ سر پر سفید پگڑی تھی جس پر ایک ہیرا جڑا تھا۔ وہ ایک مسند پر بیٹھا تھا۔ دائیں بائیں کلون اور گیاپا چو کھڑے تھے۔ سامنے شاہزادے کا بھائی بیٹھا تھا۔ ان کے علاوہ درباری بھی موجود تھے۔

مور کرافٹ کو یہ سننے میں آیا کہ پشکیوم اور سوت کے راجہ دبی زبان میں لیہہ کی حکومت سے قطع تعلق کی باتیں کر رہے تھے۔ سبھی گیا لپو چھپل تنڈوپ نمگیل کی کمزوریوں کا فائدہ اُٹھانا چاہتے تھے۔

لامایورو گنپہ میں مور کرافٹ کو مغل سرکار کے حکم نامے دکھائے گئے جن پر لکھا تھا کہ لاموں کی پوجا پاٹ میں خلل نہ ڈالیں۔ گنپہ کی زمین پر قبضہ نہ کیا جائے۔ ان حکم ناموں پر مغل بادشاہ اورنگ زیب، کشمیر کے مغل گورنر فدائی خان اور مغل افسر شیر خان کی مہریں تھیں۔ سکردو کے راجہ احمد شاہ نے بھی ایسا ہی حکم نامہ جاری کیا تھا، جس کی زبان زیادہ واضح تھی۔

لامایورو میں مور کرافٹ کو معلوم ہوا کہ اس کے ۱۸۲۱ء سے اپریل ۱۸۲۲ء تک کلکتہ میں سیاسی اور خفیہ محکمہ کو بھیجے گئے خطوط مکتوب علیہ کو جولائی ۱۸۲۲ء سے پہلے نہیں ملے تھے۔ میڈکلف کو بھیجے گئے خطوط آدھا ہندوستان گھوم چکے تھے۔

نوبراہ سے آکر مور کرافٹ دراس گیا جہاں ۱۶ جولائی کو ہنگری کے ایک زبان داں اور محقق سوماڈی کوروسو سے اس کی ملاقات ہوئی۔ وہ وسط ایشیا جا رہا تھا اور سکندر بیگ کے نام سے سفر کر رہا تھا۔ مور کرافٹ نے سوما کو مشورہ دیا کہ وہ کلاسیکل تبتی سیکھے اور تبتی بدھ مت اور اسی کے علوم پر تحقیقی کام کرے جو تبت اور لداخ دونوں میں مروج ہیں۔ سوما نے وسط ایشیا جانے کا ارادہ چھوڑ دیا۔ سوماڈی کوروسو تہی دست تھا۔ مور کرافٹ اس کی مدد کی۔ وہ ہنگری سے پاپیادہ ہندوستان آیا تھا اور دو سال لگے تھے۔ دراس سے مور کرافٹ اور سوما لیہہ لوٹے۔ اُنھوں نے اکٹھے پانچ ماہ چھ دن گزارے۔

مور کرافٹ زنسکار جانا چاہتا تھا لیکن نہیں جاسکا۔ عبدالطیف یارقند سے دوبارہ ناکام لوٹا۔ چینی سرکار نے مور کرافٹ کو یارقند آنے اور بخارا جانے کی اجازت نہیں دی تھی۔ مور کرافٹ نے کشمیر جانے کا فیصلہ کیا، جہاں سے افغانستان ہوتے ہوئے بخارا جانے کا پروگرام بنایا۔ امیر بخارا نے اپنے ملک آنے کی تحریری اجازت دی تھی۔ دو سال پہلے ۷ ستمبر کو وہ لداخ کی حدود میں داخل ہوا تھا۔ ۲۰ ستمبر کو وہ لیہہ سے سری نگر کے لیے روانہ ہوا۔ سامان کی نقل و حمل کے لیے ساٹھ ٹٹو کرایہ

پر لیے۔ کلون، بنکا کلون سمیت مورکرافٹ کے تمام دوستوں کو اس کی روانگی پر بڑا دُکھ ہوا۔ بہت سارے لوگ اس کو الوداع کہنے سکراہ تک آئے، جن میں لیہہ کے امام اور دُکان دار شامل تھے۔ کلون نے مورکرافٹ کو ایک گھوڑا، ریشم کا کپڑا اور چائے کی چھوٹی اینٹیں تحفے میں پیش کیں۔ اس کے متعدد دوست دو دن تک اس کے ہم سفر رہے۔ غالباً سسپول تک ساتھ گئے ہوں گے۔ جدا ہوتے وقت دُکھ بھرے دل سے وداع کیا۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مورکرافٹ لداخ میں بڑا مقبول تھا۔ وہ اور پارٹی کے اکثر افراد اس سفر میں اس کے ساتھ تھے۔ ٹریبیک اور سوماڈی کو روسو نومبر کے اختتام پہ زوجی لا پار کر کے سری نگر پہنچے۔ زوجی لا پر مورکرافٹ نے بڑے غور اور باریکی سے دیکھا کہ روسیوں کے حملے کی صورت میں درے کی مدافعت کیسے کی جاسکتی ہے۔ غلام حیدر خان کو کچھ ضروری کام کے لیے سردیوں میں لداخ رُکنا پڑا اور دوسرے سال آغاز بہار میں سری نگر پہنچا۔

مورکرافٹ ۲۷ اگست ۱۸۲۵ء کو وسط ایشیا کے ایک شہر اندکوہی میں بخار اور کمزوری سے چل بسا۔ ٹریبیک اور گوتھرائی اس کے ساتھ نہیں تھے۔ ڈاکٹر جارج گوتھرائی اس کے چند روز بعد فوت ہوا۔ دسمبر میں مزار میں ٹریبیک چل بسا۔ میر عزت اللہ زرد بخار کا شکار ہوا۔ وہ اپنے گھر دہلی نہیں پہنچ سکا اور پشاور میں انتقال کر گیا۔

مورکرافٹ سے متعلق ایک انوکھا قصہ یہ ہے کہ وسط ایشیا سے وہ تبت گیا، جہاں ایک کشمیری کے بھیس میں بارہ سال لہاسہ میں رہا۔ اس کا انکشاف اس وقت ہوا، جب وہ لہاسہ سے ہندوستان جاتا ہوا تبت میں ایک جگہ رہزنوں کے ہاتھوں مارا گیا اور اس کے سامان میں اَن گنت نقشے اور منصوبے پائے گئے۔ یہ روداد اور بعد کے دوسرے واقعات بذات خود ایک لمبی کہانی ہیں، جو ہمارے موضوع سے باہر ہیں۔

مورکرافٹ کو لداخ میں اپنے قیام کے دوران خطے کے نظام حکومت، سیاسیات، تمدن، تجارت، قدرتی وسائل اور زندگی کے مختلف پہلوؤں کا مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔ مورکرافٹ نے لداخ کے اجناس، سبزیاں، میوے، معدنیات، چرندوں، پرندوں، جنگلی جانوروں، لباس، خوراک، رہن سہن، فیشن وغیرہ کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ اس کے مشاہدات اور بیانات معتبر اور مستند لگتے ہیں۔

ان دنوں مشرقی ترکستان سے خربوزہ اور ناشپاتی اور کشمیر سے انگور لداخ درآمد ہوتا تھا۔لداخ سے سالانہ چھ سو من سوکھے پھل لہاسہ برآمد ہوتے تھے۔تب لداخ میں تمباکو کی کاشت ہوتی تھی۔چانگ تھانگ کے دریاؤں اور شایوک کی ریت میں سونا پایا جاتا تھا۔

مور کرافٹ لکھتا ہے:'تمام دریاؤں اور نالیوں میں مچھلیوں کی بھرمار ہے لیکن لوگ بدھ مت کی تعلیم کے مطابق مچھلیاں نہیں پکڑتے.......... خطے میں زیادہ دولت نہیں ہے، لیکن جو بھی ہے، مساوی طور پر بٹی ہوئی ہے۔آبادی کے بڑے حصے کو آرام اور فراغت نصیب ہے۔'

طرز حکومت سے متعلق وہ لکھتا ہے:'راجہ مطلق العنان نہیں ہے۔اسے رؤسا اور زعما آسانی سے معزول کر سکتے ہیں۔تاہم اس کے جانشین کا شاہی خاندان سے ہونا لازمی ہے۔'

لوگوں کے کردار سے متعلق مور کرافٹ کا مشاہدہ ہے کہ لداخی عمومی طور پر شریف، دیانت دار، خوش اخلاق، صاف گو اور ڈرپوک ہیں۔عورتیں خوش مزاج اور طبعاً ہنسی مذاق کرنے والی ہیں۔طعن و تشنیع تقریباً نہیں جانتی ہیں۔

لداخی عورت کے فیشن سے متعلق وہ لکھتا ہے:'ایک لداخی عورت اپنے پورے لباس اور لوازمات میں یورپ کی کسی بھی راجدھانی کی فیشن زدہ عورتوں میں تہلکہ مچا سکتی ہے.......... چہرے کا نکھار اور رنگت کے لیے عورتیں ایک نباتاتی بیج شوقلو استعمال کرتی ہیں۔'

سماجی زندگی میں اونچ نیچ سے متعلق وہ لکھتا ہے:'عام لوگوں کی ٹوپیاں عموماً کالے رنگ کے کپڑے کی بنی ہیں۔یہ ٹوپی چھوٹی ہوتی ہے اور اس کے اوپر کا حصہ لٹکایا جاتا ہے جب کہ رؤسا اسے سیدھا رکھتے ہیں۔'

مور کرافٹ کو لداخ کا بیت الخلا بڑا پسند آیا۔اور اسے لداخ سے باہر بھی مروج کرنے کی تجویز رکھی۔

لداخی فوج کے ہتھیاروں سے متعلق وہ لکھتا ہے:'گھوڑسواروں کے ہتھیار قدرے بہتر ہیں جب کہ پیدل فوج کے دس سپاہیوں کے لیے ایک توڑے دار بندوق اور چھ سپاہیوں کے لیے ایک تلوار ہے۔'

سید نجف علی نے اپنی یادداشت میں لکھا ہے: 'گھوڑ سوار فوجیوں کی تعداد تقریباً دو ہزار ہے۔ کئیوں کے پاس تیشہ دار بندوقیں ہیں۔ باقیوں کو تیر کمان اور تلواریں ہیں۔ ان کو تنخواہ نہیں ملتی بلکہ کسانوں سے جنس میں امداد ملتی ہے۔'

مورکرافٹ کے سفرنامے کے مطابق مسلمان تجارت کے علاوہ قصاب، خاں ساماں اور چھوٹے پرچون فروش تھے۔ قصاب شہر سے باہر ایک جگہ بھیڑ بکریاں ذبح کر کے شہر میں فروخت کرتے تھے۔ چھشوت میں مرغیاں پالی جاتی تھیں۔ امیر لوگ چاول اور گوشت کھاتے تھے۔ لداخیوں کی خوراک عموماً طاقت بخش تھی۔

مورکرافٹ نے پوریگ سے متعلق بھی لکھا ہے جہاں ہر گاؤں میں مکتب تھا اور ایک آخون بچوں کو قرآن ناظرہ اور دینیات پڑھاتا تھا۔ ہر گاؤں میں ایک یا دو آدمی ایسے نکلے جو فارسی اور ہندوستانی میں بات چیت کر سکتے تھے۔ ان دنوں کرگل قصبے سے زیادہ اس کے قریب واقع گاؤں پشکیوم زیادہ اہم تھا۔

لداخیوں کے نزدیک اُن دنوں روم دُنیا کا سب سے بڑا اور طاقتور ملک تھا۔ چنانچہ لداخی میں ایک کہاوت تھی۔ ''روم توچیگ یُول توچیگ'' یعنی آدھی دُنیا روم اور آدھی باقی دُنیا ہے۔ کلون نے مورکرافٹ سے سوال کیا کہ کیا وہ روم گئے ہیں۔ روم رومن امپائر سے زیادہ اوٹومان امپائر سلطنت عثمانیہ لگتا تھا، جب عرب ممالک سمیت مشرقی یوروپ کے بیشتر ممالک ترکی میں شامل تھے اور ترکی خلافت اسلامیہ کا مرکز تھا۔

مورکرافٹ نے بھی روم کا مطلب ترکی کو لیا لیکن ۱۸۲۰ء میں ترکی ایک کمزور ملک تھا اور (Sick Man of the Europe) یوروپ کا مرد بیمار بن رہا تھا۔ اس لحاظ سے لداخیوں کا جغرافیہ کمزور تھا۔ اس زمانے میں لداخ میں رسل و رسائل کی سہولت کا فقدان تھا اور لداخ کا بیرونی دُنیا سے رابطہ کم تھا۔ اس لیے صحیح جانکاری حاصل کرنا مشکل تھا۔

ٹربیک نے لیہہ کا خاکہ بنایا جو ان کے سفرنامے میں دیا گیا ہے۔ اس میں محل اور اس کے سامنے کی عمارتیں نظر آتی ہیں جن میں کلون کی قیام گاہ اور ''خرچونگ'' چھوٹا محل ہیں۔ چھوٹا محل روپشو نمبردار کی ملکیت تھا۔

مورکرافٹ نے لداخی اجناس کے بیج کلکتہ کے بوٹانیکل گرڈنز اور انگلستان میں اپنے دوستوں کو بھیجا۔ لداخی زبان کے حروف تہجی، صرف ونحو اور زبان سے متعلق ایشیاٹک جرنل کو ۲۱ صفحات کا ایک مضمون بھیجا نیز لداخی سکے، خوش خطی کے نمونے، بلاک پر چھپائی کے نقشے اور خاکہ نگاری کے نمونے ارسال کیے۔ متعدی امراض سے مرے جانوروں کی چیر پھاڑ کر کے ان کے اسباب جاننے کی کوشش کی۔

سوما ڈی کوروس (Csoma De Coros)

راستہ کھلنے پر مئی ۱۸۲۳ء میں سوما ڈی کوروس سری نگر سے لداخ آیا۔ مورکرافٹ نے کلون سے سفارش کی تھی کہ بودھی سیکھنے اور تبتی علوم پر ریسرچ کرنے کے لیے سوما کی مدد کی جائے۔ کلون نے سوما کو زنسکار زنگلا گنپہ کے ایک لاما کے پاس بھیجا۔ ۲۰ جون ۱۸۲۳ء سے ۲۲ اکتوبر ۱۸۲۴ء تک سوما نے لاما سے کلاسیکل لداخی سیکھی۔ سوما اور لاما دونوں نو مربع فٹ کمرے میں بیٹھ کر کام کرتے تھے۔ سخت سردی تھی اور اندھیرا چھانے کے بعد روشنی کا انتظام نہیں تھا۔ سوما نے لداخ اور تبت کے علمی خزینے سے استفادہ کرنے میں خاص دلچسپی لی اور مذہبی صحیفے کنگیو راور ان کی تفاسیر ستنگیور پر بصیرت حاصل کی۔ اُنھوں نے بودھی لغت پر بھی کام کیا۔ پھر وہ اپنی رپورٹ لے کر سوباتھو کی انگریز فوجی چھاؤنی پہنچا۔ گورنر جنرل لارڈ ایمہرسٹ نے مزید تحقیقی کام کے لیے ماہانہ ۵۰ روپیے کا الاؤنس منظور کیا۔ جون ۱۸۲۵ء میں وہ دوبارہ زنسکار آیا اور اگلے موسم گرما تک تحقیقی کام میں جٹا رہا۔

۱۸۲۷ء میں وہ زنسکار کے کونم گنپہ پہنچا اور اپنی علمی ریاضت جاری رکھی۔ ایک یوروپی ڈاکٹر گیرارڈ کانم میں موسمیاتی مشاہدہ کے لیے تعینات تھا وہ سوما سے ملا اور اپنے تاثرات یوں بیان کرتا ہے: ’مسٹر سوما ایک قدیم سنت کی طرح لگتے تھے۔ انتہائی کفایت شعاری سے رہ رہے تھے اور اپنی ادبی سرگرمیوں کے علاوہ اپنے گردونواح کی کسی چیز سے دلچسپی نہیں لیتے تھے۔‘ ڈاکٹر گیرارڈ دو سال کانم میں رہا۔

۱۸۳۱ء میں وہ اپنے قیمتی مسودوں کو لے کر کلکتہ آیا۔ گورنر جنرل لارڈ ولیم بینٹنگ نے اس کے حق میں ایک معقول الاؤنس منظور کیا۔ ایشیاٹک سوسائٹی بلڈنگ میں ایک کمرہ دیا جہاں سے وہ بہت کم نکلتا تھا اور اپنے کام میں مگن رہتا تھا۔

۱۸۳۴ء میں سوماڈی کوروس کی مرتب کردہ بودھی انگریزی لغت اور گرامر شائع ہوئی۔ سوما نے کنگیور اور ستنگیور پر تبصرے اور لداخی ادب پر مضامین لکھے۔ اس طرح اس نے سب سے پہلے دُنیا کو تبتی علوم اور مذہب سے روشناس کیا۔

۱۱ اپریل ۱۸۴۲ء کو لہاسہ جاتے ہوئے وہ ۵۸ سال کی عمر میں فوت ہوا۔ ایشیاٹک سوسائٹی نے اس کی قبر پر ایک یادگار تعمیر کی۔

جان ہنڈرسن

لداخ پر ڈوگرہ حملے کے دوران ایسٹ انڈیا کمپنی کا ایک ملازم ڈاکٹر جان ہنڈرسن ایک فقیر کے بھیس میں لیہہ پہنچا۔ اس نے اپنا نام اسمٰعیل خان رکھا تھا۔ لداخیوں نے اس کو انگریزوں کا نمائندہ سمجھا۔ مورکرافٹ کے ساتھ ۱۴ سال پہلے ایک معاہدہ ہوا تھا۔ اس سلسلے میں عین موقعہ پر یہ اس کی توثیق اور ڈوگروں کے حملے کو روکنے کے لیے لداخ آیا ہے۔ اس کو وہ باغ دکھایا، جہاں مورکرافٹ ٹھہرا تھا لیکن ہنڈرسن مورکرافٹ سے متعلق بہت کم جانتا تھا۔ ہنڈرسن نے کہا کہ وہ انگریزوں کا نمائندہ نہیں ہے۔ لداخی حکومت نے مایوس ہو کر اسے قید کر لیا۔ ادھر گلاب سنگھ نے ہنڈرسن کی آمد کو رنجیت سنگھ کی نوٹس میں لایا۔ رنجیت سنگھ نے لدھیانہ میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے سیاسی ایجنٹ سے دریافت کیا جس نے بتایا کہ ہنڈرسن کی کوئی سیاسی حیثیت نہیں ہے۔ وہ اجازت کے بغیر لداخ گیا ہے۔

ہنڈرسن جیل سے فرار ہوا اور بھیک مانگتے ہوئے بلتستان پہنچا جہاں بلتیوں نے اس کو کشمیر جانے میں مدد کی۔

جی ٹی وین (G.T.Vigne)

اگست ۱۸۳۵ء میں ایک انگریز افسر جی ٹی وین سکردو پہنچا جہاں وہ سکردو کے راجہ احمد شاہ کا مہمان رہا۔ وہاں سے وہ لداخ آیا۔ ڈوگرہ جرنیل وزیر زور آور سنگھ نے لداخ پر قبضہ کیا تھا اور اس کی فوج لداخیوں پر نت نئے مظالم ڈھا رہی تھی۔ وین لکھتا ہے: 'سکھ سپاہی (ڈوگرہ کی جگہ سکھ لکھتا ہے) لداخیوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح ہانک رہے ہیں اور ان سے بدسلوکی کر رہے ہیں۔ اُنھوں نے وین سے بھی بُرا برتاؤ کیا۔ کہیں وہ رکنا چاہتا اور کسی لداخی سے گاؤں کا نام پوچھنا چاہتا تو سپاہی جواب دینے نہیں دیتے تھے۔ اس سے پہلے جب وین ایک بلتی کے ہمراہ لداخ کے ایک سرحدی گاؤں سکیور بوچن پہنچا تو بڑے لاما نے ان کا استقبال کیا۔ بڑے لاما کا خیال تھا کہ وہ لداخیوں کو ڈوگروں کی غلامی سے آزادی دینے آئے ہیں۔

راجہ گلاب سنگھ نہیں چاہتا تھا کہ وین لداخ جائے۔ لیہہ میں جی ٹی وین کو مقامی لوگوں سے بالکل ملنے نہیں دیا گیا۔ وین جب بازار جاتا تو لوگوں کو پہلے ہی بازار سے بھگا دیا جاتا تھا۔ ایک پٹھان وین سے ملنا چاہتا تھا۔ اس کو مارا پیٹا۔ وین اپنے خیمے میں دو لاموں سے بدھ مت سے متعلق سوالات پوچھ رہا تھا۔ انھیں خیمہ سے نکال دیا۔ وین کے نوکر کے خیمے میں مستقل طور پر ایک پہرہ دار رکھا اور کھانے پینے کی چیزیں خریدنے میں رُکاوٹ ڈالی۔ وین نے لکھا ہے: 'مجھے یقین ہے ہر لداخی میری مدد کرتا لیکن کسی کو اس کی جرأت نہیں تھی۔' وین کمپنی کا ایک سینئر سول افسر تھا۔

لداخ کا معزول راجہ لیہہ کے پاس ایک گاؤں ستوق میں مقیم تھا۔ وین اس سے ملنا چاہتا تھا لیکن ڈوگرہ فوج اس کی راہ میں مانع تھی۔ ایک روز اس نے راجہ کو گھوڑے پر دیکھا۔ وین نے اپنا گھوڑا اُس کی طرف بڑھایا لیکن سکھ افسر جان سنگھ نے راجہ کو اپنا راستہ لینے کے لیے کہا۔

ایک روز وین اپنے لداخی منشی علی محمد کے ساتھ راجہ کے محل میں زبردستی گھس گیا۔ جب دو ڈوگرہ سپاہیوں نے کچھ مزاحمت کی تو وین میان سے تلوار نکالنے لگا۔ سپاہیوں نے مزید مزاحمت نہیں کی۔

وین نے سلام کیا اور اس کے پاس بیٹھا۔ ابھی اس نے راجہ سے بات کرنی شروع ہی کی تھی کہ جان سنگھ آدھمکا۔ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ راجہ نے وین کو اپنا تعاون دینے پر رضامندی ظاہر کی اور وین باہر نکل آیا۔ دوسری صبح راجہ نے وین کو ایک خلعت بھیجی۔

بعد میں وین کو معلوم ہوا کہ لداخ پر قابض ہونے کے بعد گلاب سنگھ کی ایک بڑی خواہش بلتستان پر قبضہ کرنا تھی۔ وین نے جان سنگھ کے خلاف گلاب سنگھ سے شکایت کی۔ ڈوگرہ حکومت نے جواب میں کہا کہ اس کو عبرت ناک سزا دی جائے گی۔

سکرود میں راجہ احمد شاہ کو گلاب سنگھ کے حملے کا بڑا خوف تھا۔ وین لکھتا ہے۔ 'یہ لوگ صرف سکھوں اور چیچک سے خوفزدہ ہیں اور اپنی قلمرو کو ایسٹ انڈیا کمپنی کی حفاظت میں دینا چاہتے ہیں'۔ وین کے الفاظ میں جب وہ پہلی دفعہ احمد شاہ سے ملا تو احمد شاہ ننگے سر رک رک کر جھکتا ہوا اور اپنے ہاتھ کی پشت زمین پر ڈالتا ہوا پھر ماتھے تک لیتا ہوا اس کو سلام کیا۔ وین نے راجہ کو انگلستان کے بادشاہ ولیم چہارم کی تصویر دکھائی۔ راجہ نے ایک پنسل مانگی اور اس کے حاشیے پر کچھ لکھنے لگا۔ وین نے جب پوچھا تو احمد شاہ نے کہا کہ وہ اپنا مودبانہ سلام شاہ انگلستان کو بھیج رہا ہے۔ وہ اس کا ایک غلام ہے اور اس سے اپنی حفاظت چاہتا ہے۔

وین کے آنے پر احمد شاہ کھڑا ہو جاتا تھا۔ وین لکھتا ہے کہ راجہ کو پکا یقین تھا کہ وہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے سکرود آیا ہے اور اس پر حد سے زیادہ مہربان تھا۔ چنانچہ اس کی مہمان نوازی میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔

ایک روز وین نے سکرود کا قلعہ دیکھا۔ دفاعی نقطہ نظر سے راستے تنگ اور دروازے چھوٹے بنائے گئے تھے۔

گلگت کے راجہ نے وین کی آمد کے ڈر سے ایک پل جلا ڈالا۔ وہ احمد شاہ سے بدگمان تھا تاہم راجہ نے وین کو لکھا کہ اس کی قلمرو کے لوگ غریب ہیں اور جگہ قابل دید نہیں۔ اس کے برعکس ہنزہ کے راجہ کی طرف سے ایک قاصد نے وین کو سکرود میں تحفہ پہنچایا اور ہنزہ آنے کی دعوت دی۔

احمد شاہ ہر یوروپی کو ایسٹ انڈیا کمپنی کا اہل کار سمجھتا تھا۔ ایک فرانسیسی سائنس داں Victor Jaequemont ۱۸۳۱ء میں کشمیر آیا تھا اور پودے اور جانوروں کے نمونے جمع کر رہا تھا۔ احمد شاہ نے اس کو کمپنی کا ایک بڑا افسر سمجھا اور فوراً اپنے وزیر چراغ علی شاہ کو تحفوں کے ساتھ اس کے پاس بھیجا۔ سکھ حکومت کے شک سے بچنے کے لیے چراغ علی شاہ نے پودوں اور جانوروں کے تاجر کا بھیس اختیار کیا تھا اور Jacquemont کے سامنے بطور احمد شاہ کے سفیر حاضر ہوا۔ راجہ کی نمائندگی کرتے ہوئے اس نے کہا کہ احمد شاہ انگریزوں کا سب سے وفادار خادم ہے اور بلتستان انگریزوں کا ملک ہے۔ فرانسیسی سائنس داں نے اپنی اصلیت سے چراغ علی کو آگاہ کیا اور فارغ کیا۔

احمد شاہ نے لدھیانہ میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے پولیٹیکل ایجنٹ ایم واڈے کو کئی خطوط بھیجے۔ واڈے کی فرمائش پر اپنے جاسوسوں کی مدد سے مشرقی ترکستان کے حالات سے آگاہ کیا۔ احمد شاہ کی خیر سگالی اور دوستانہ جذبے کے جواب میں واڈے نے لکھا: 'جس کسی کے ساتھ انگریز سرکار کے دوستانہ تعلقات ہیں انگریز سرکار اس کی قدر کرتی ہے۔'

جب گلاب سنگھ نے احمد شاہ سے دوستی کی پینگیں بڑھائیں تو بلتی حکمراں نے رکھائی سے جواب دیا۔ 'اپنی مستقل مزاجی کی بدولت میں اپنے کو ہما کے زیر سایہ لانے میں کامیاب ہوا ہوں۔' احمد شاہ کو زُعم تھا کہ انگریزوں سے اس کی سفارتی کوشش کامیاب ہوئی ہے۔

کننگھم، تھامس تھامسن اور اسٹریچی

مئی ۱۸۴۷ء میں گورنر جنرل لارڈ ہارڈنگ نے تبتی سرحدی کمیشن قائم کیا اور تین اہل کاروں میجر الیگزنڈر کننگھم، کپتان ہنری اسٹریچی اور ڈاکٹر تھامس تھامسن کو سروے اور تحقیقی کام کے لیے لداخ بھیجا۔ خفیہ طور پر انھیں جاسوسی کا کام بھی سونپا۔ مشن کی تکمیل کے بعد تینوں نے برطانوی ہند سرکار کو اپنی خفیہ رپورٹ دی۔ الیگزنڈر کننگھم نے لداخ کے نام سے ایک تحقیقی اور علمی کتاب لکھی۔ ڈاکٹر تھامس تھامسن نے Western Himalaya and Tibet کے نام سے لداخ

کے پیڑوں، جھاڑیوں اور جڑی بوٹیوں پر ایک کتاب تصنیف کی۔ خطے سے متعلق اسٹر یچی کی رپورٹ بھی شائع ہوئی۔ ۱۸۴۷ء میں گلاب سنگھ کے قبضے کے بعد لداخ اور بلتستان میں حالات معمول پر آئے تھے۔

کنینگھم نے LADAKH میں لداخ کے جغرافیہ، نظام حکومت، تاریخ، مذہب، زبان، تجارت، سماجی زندگی، لداخیوں کی جسمانی ساخت، شکل وشباہت اور رنگ ونسل پر روشنی ڈالی ہے۔

مجرموں کو دی جانے والی سزاؤں کا ذکر کرتا ہوا کینگھم رقم طراز ہے۔ مجرموں کو جرم کی نوعیت کے مطابق قید، درے مارنا، ملک بدر کرنا اور سزائے موت دی جاتی تھی۔ گنپوں کی بے حرمتی یا بے رحمی سے قتل کے لیے مجرم کے ہاتھ پیر رسی سے باندھے گلے میں ایک بھاری پتھر ڈال کر دریا میں پھینکا جاتا تھا یا صلیب پر چڑھایا جاتا تھا۔ ملک بدر کے معتوب مجرم کے ماتھے پر ایک انچ لمبا کتا چھاپ لوہا داغا جاتا تھا۔ ایسے مجرم کو دماموں کی ایک مخصوص تھاپ کے ساتھ سیٹیاں بجاتے، سنگ باری کرتے اور اس پر غلاظت پھینکتے ہوئے جلاوطن کیا جاتا تھا۔

کینگھم نے لکھا ہے کہ آرغون مسلمان گزشتہ چند سال سے مرغیاں پال رہے ہیں، جو شروع میں وہ کشمیر سے لائے ہیں.......... مقامی طور پر پٹو، کمبل اور تنبو بنائے جاتے ہیں۔

مصنف نے شملہ سے ۲۰ لداخی بھیڑیں لیں اور انگلستان بھیجیں۔ اُنھیں شاہزادہ البرٹ کو پیش کیا گیا۔ لندن کے زولوجیکل گارڈن میں ان کی نمائش ہوئی۔ بعد میں اُنھیں شائقین میں تقسیم کیا گیا۔

لداخی بودھوں سے متعلق کینگھم نے لکھا ہے۔ 'بودھ اپنے طور طریقوں میں ملنسار ہیں۔ ہر واقعہ ان کے لیے دعوت دینے کا ایک بہانہ ہوتا ہے جو بڑے ہنگاموں پر ختم ہوتا ہے۔ ایسے میں عموماً مے نوشی کی محفل جمتی ہے.......... مے نوشی کے گیت گائے جاتے ہیں۔ زنانہ رقاصاؤں کی نمائش تفریح کا ایک بڑا حصہ ہے۔' بچے کے جنم، اس کی نام رکھائی اور شادی پر تقریبات ہوتی تھیں۔

کینگھم نے جھیل خومدن میں پانی جمع ہونے سے گاہے گاہے ہونے والے سیلابوں کا ذکر کیا ہے۔ ۱۸۲۶ء، ۱۸۳۳ء اور جون ۱۸۴۱ء میں سیلاب آئے تھے اور نوبراہ میں تباہیاں ہوئی تھیں۔ ایک مرتبہ غالباً ۱۸۴۲ء میں تیریت گاؤں میں ۱۸۳ آدمی، ۱۸ گھوڑے، ۱۱۴ بیل اور ۱۰۴۰

بھیڑ بکریاں مر گئیں۔ چھوربت میں ۱۸ آدمی مر گئے اور ۴۰ امکانات بہہ گئے۔ چار روز تک سیلاب کا پانی بہتا رہا۔

خومدن کے سیلاب کا پانی دریائے سندھ میں جانے سے کراچی تک اس کا اثر پڑتا تھا۔ ۱۸۱۲ء کے سیلاب سے کٹک کے علاقے میں بڑا نقصان ہوا تھا۔ پچھلی صدی کے دوران بھی زیادہ پانی جمع ہونے سے خومدن جھیل کے پشتے ٹوٹنے سے کئی مرتبہ سیلاب آیا۔ اس زمانے میں فون یا وائرلیس کی سہولت نہیں تھی اس لیے آگ جلا کر سگنل دیا جاتا تھا۔ جھیل خومدن سے لیہہ تک پہاڑ کی چوٹیوں پر لکڑی کا انبار جمع کیا جاتا تھا اور آدمی رکھے جاتے تھے۔ ایک مرتبہ ایسے ہی ایک موقع پر نوبراہ میں ایک پہاڑ پر تعینات ناتھن نام کے ایک سرکاری ملازم نے دور آگ دیکھی۔ یہ کاشغر سے لیہہ آنے والا ایک تجارتی قافلہ تھا، جو کھانا پکا رہا تھا۔ اس نے سگنل سمجھ کر فوراً آگ روشن کی۔ پھر کیا تھا، لیہہ تک پہاڑیوں کی چوٹیوں پر آگ روشن ہوئی گئی۔ لیہہ کے تار گھر سے سکھر تار بھیجا گیا جہاں بڑا پل ہٹا دیا گیا۔ اصلی سیلاب اس کے کئی روز بعد آیا۔

اب خومدن کے معمول کے پانی کے دائمی اخراج کے لیے جھیل کے دہانے کو آتش گیر مادہ استعمال کر کے کشادہ بنایا گیا ہے۔ جس سے سیلاب کا خطرہ ٹل گیا ہے۔

تھامس تھامسن ۱۸۴۷ء کے موسم گرما میں کننگھم اور اسٹریچی سے ملا اور تینوں سپیتی سے ہوتے ہوئے لیہہ پہنچے۔ تھامسن نے لداخ کے اکثر مقامات دیکھے اور بلتستان بھی گیا۔ تقریباً نو ماہ خطے میں گزارنے کے بعد وہ کشمیر روانہ ہوا۔ مئی ۱۸۴۸ء میں وہ زنسکار کے راستے لداخ لوٹا۔ لیہہ میں اسٹریچی سے ملاقات ہوئی۔ ایک ہفتہ لیہہ میں ٹھہرنے کے بعد ۱۹ جولائی کو نوبراہ روانہ ہوا۔ تھامسن نے نوبراہ اور اس سے آگے گلیشیروں، جھیلوں اور پہاڑوں کی ساخت سے خطے کی حیاتیات اور معدنیات پر ہونے والے اثرات کا مشاہدہ کیا اور قراقرم درے کی پیمائش کی۔

تھامسن تھامسن نے لداخ کے پیڑوں اور جڑی بوٹیوں کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے۔ 'لداخ کے ہر گاؤں میں سفیدہ اور بید کے درخت ہیں۔'

۱۹ اکتوبر کو لیہہ میں سورج گرہن دیکھا گیا۔ تھامسن لکھتا ہے۔ 'اس موقعے پر دمامے بجائے گئے تاکہ سورج پر قبضہ کرنے والے آسیب کو خوف زدہ کیا جائے۔'

ایک چھوٹے سے گاؤں سسپول میں دو سال میں ۱۳۰ افراد فالج سے مر گئے، جن میں بچے بھی تھے۔ تب لداخ میں اکثر لوگ فالج سے مرتے تھے۔ اس کی ایک بڑی وجہ بلندی تھی۔

تھامسن کے مطابق ماسوائے لیہہ دوسرے مقامات پر زورآور سنگھ کے حملے کا اثر بہت کم تھا۔

رائل جیوگرافیکل سوسائٹی نے تھامسن کو اس کی سائنسی کارکردگی کے لیے طلائی تمغہ دیا۔ ہنری اسٹریچی نے ۱۸۴۵ء میں سیاچن گلیشیر دیکھا۔ اس طویل ترین گلیشیر کو دیکھنے والا وہ پہلا یوروپی محقق (explorer) تھا۔

مسز ہاروے

۱۸۵۰ء کی گرمیوں میں کلو کے راستے ایک خاتون مسز ہاروے لداخ پہنچی۔ اس کے ہمراہ ایک انگریز فوجی کپتان بھی تھا۔ ٹھکسے میں گنپہ کے لاموں نے موسیقی کے آلات بجا کر ان کا سواگت کیا۔ لوگوں نے دمامے بجائے۔ لیہہ کے تھانیدار بستی رام کالڑ کا ان سے ملنے آیا۔ ۲۰ جولائی کو وہ لیہہ پہنچے۔ ایک سرکاری اہل کار نے ان سے دریافت کیا کہ ان کے اعزاز میں توپ کے کتنے گولے داغے جائیں۔ کپتان نے کہا 'اس کی ضرورت نہیں ہے۔' ڈوگرہ مہاراجہ برطانوی ہند سرکار سے بڑا نالاں اور ہراساں تھا۔ انگریز ریزیڈنٹ پس پردہ ریاست جموں وکشمیر میں ایک متوازی حکومت چلا رہا تھا۔ کئی معاملات میں انگریزوں کو بالادستی حاصل تھی۔ لیہہ میں تعینات وزیر وزارت کو یہ ہدایت ہونی چاہیے کہ لداخ آنے والے انگریز افسروں کی دل جوئی میں کوئی کسر نہیں رکھی جائے۔ لداخ روانگی سے پہلے متعلقہ افسر ریزیڈنٹ یا دوسرے ذرائع سے مہاراجہ کی سرکار کو اپنی آمد کی پیشگی اطلاع دیتا تھا تاکہ اس کے لیے گھوڑوں، رہائش وغیرہ کے معقول انتظامات ہوں۔ لیہہ

میں وزیر اور دوسرے سرکاری افسران معمولی انگریز افسروں اور ان کی بیویوں کی خوشنودی ڈھونڈنے کے لیے کوشاں رہتے تھے۔

مسز ہاروے لکھتی ہے: 'لوگ مہاراجہ گلاب سنگھ سے بڑے نالاں نظر آتے تھے۔' تاہم کینگھم کے مطابق صرف رؤسا اور امرا نالاں تھے۔'

مسز ہاروے کے مطابق لیہہ کے قلعہ میں تین سو سپاہی تھے۔لداخی معزول راجہ کا پوتا راج کمار جگمت دیسکیونگ نمگیل ان سے ملنے آیا۔وہ پندرہ سال کی عمر کا تھا۔تھوڑی دیر بعد تھانیدار بستی رام بھی آیا۔کمرے میں ایک ہی کرسی تھی،جس پر راج کمار بیٹھا تھا۔اس نے اپنی کرسی پیش کی۔راج کمار ظالم حکمراں کے سامنے کانپنے لگا۔رانی کی خوش سلیقگی کی مسز ہاروے نے تعریف کی ہے جس نے پرنم آنکھوں سے مسز ہاروے کو اپنی کہانی سنائی۔

مسز ہاروے کا سفرنامہ تین جلدوں پر مشتمل ہے۔مصنفہ رقم طراز ہے۔اُن دنوں لداخ میں صرف چق مق اور پٹو بنائے جاتے تھے۔وہ مصورہ بھی تھی۔ایک روز وہ قصبے کی تصویر بنانے جاتی ہے۔اپنا تجربہ وہ ان الفاظ میں بیان کرتی ہے: '۱۱ اگست کی صبح میں اپنے کیمپ سے ذرا دور محل اور اس کے نیچے کے قصبے کا خاکہ بنانے لگی۔دو منٹوں میں ایک بڑی بھیڑ نے مجھے گھیر لیا اور میری نشست اور زمین پر بچھائی ہوئی شال سے ایک گز کے اندر تک آئی۔آدھا درجن سپاہی اس بڑے اژدہام کو دور رکھنے میں ناکافی تھے۔دھوپ میں بڑی شدت آئی اور مجھے اپنا خاکہ ادھورا چھوڑنا پڑا۔'

لیہہ سے روانگی سے پہلے اُنھیں لوک ناچ دکھایا گیا جس میں سو کے قریب مردوں اور عورتوں نے حصہ لیا۔لاموں نے مکھوٹے پہن کر دھارمک ناچ دکھایا۔

واپسی پر دراس میں سر ہنری لارنس سے ملاقات ہوئی۔وہ لیہہ جا رہا تھا۔

اینڈریو لیتھ آدمز

جولائی ۱۸۵۲ء میں ایک سیاح Andrew Leith Adams اینڈریو لیتھ آدمز لداخ آیا۔وہ لکھتا ہے۔'جب سے لداخ میں اس کے جائز حکمراں نہیں رہے،ظلم اور بے اعتنائی سے لداخ

کی حالت افسوس ناک طور پر بدل گئی ہے۔ لیہہ قصبہ کے بڑے بازار کی چند خستہ دُکانیں اور ان میں رکھا مال دیکھنا چاہیے۔ بازاروں اور گلیوں میں عورتوں کی بڑی تعداد دیکھ کر آدمی حیران رہ جاتا ہے۔ کئیوں نے بھاری بوجھ اُٹھایا ہے۔ باقی بھی کام کے لیے منتظر لگتی ہیں۔ مردوں سے متعلق کہا جاتا ہے کہ بڑی تعداد میں گندھک اور سہاگہ کی کانوں میں کام کرتے ہیں۔ اس لیے کھیتی باڑی اور ہاتھ کی محنت کا زیادہ کام لیہہ اور اس کے آس پاس (کے گاؤں میں) عورتیں ہی کرتی ہیں۔' مقامی طور پر یہ کہا جاتا تھا کہ لڑائیوں کی وجہ سے مردوں کی آبادی کم ہوگئی ہے اس لیے بوجھ عورتوں پر پڑا تھا۔

۱۸۵۳ء میں Roero De Cortanze نامی ایک سیاح لداخ آیا تھا۔ اس نے تین چھوٹی جلدوں میں اپنا سفرنامہ لکھا تھا لیکن یہ سفرنامہ نایاب ہے۔

کرنل فریڈ مارکھم

ایک انگریز فوجی افسر کرنل فریڈ مارکھم ۱۸۵۴ء میں شکار کے لیے لیہہ پہنچا۔ اس کا شاندار استقبال کیا گیا۔ اس سلسلے میں سر ہنری لارنس نے گلاب سنگھ کو پہلے لکھا تھا کہ کرنل کا اچھی طرح سواگت کیا جائے۔ حکام توپوں کی سلامی دینے کے لیے بے تاب نظر آتے تھے۔ تاہم کرنل نے کہا کہ اس کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ ایک شکاری کی حیثیت سے آیا ہے۔

بزگو میں سابق کلون کی بیوی نے کرنل کو دعوت دی۔ زور آور سنگھ کی مہم تبت میں اس کے شوہر کو تبتیوں نے قیدی بنالیا تھا۔ تب سے اس کی خبر نہیں ملی تھی۔ کلون کی بیوی راستے سے ہر آنے جانے والے یوروپیوں سے اپنے شوہر کی رہائی کے لیے درخواست کرتی تھی۔

گیا میں مارکھم کا لداخیوں سے پالا پڑا۔ وہ ان الفاظ میں اس کا ذکر کرتا ہے۔ 'جتنا زیادہ ہمارا لداخیوں سے رابطہ بڑھا، میں ان کو زیادہ پسند کرنے لگا۔ ان کی عادات میں سادگی ہے اور طبعاً احسان کرنے والے ہیں۔'

گیا میں سردی تھی۔ وہ لکھتا ہے۔ 'جب جون میں یہاں (گیا گاؤں) پانی جمتا ہے تو سردیوں میں کیا عالم ہوگا؟' تاہم لیہہ پہنچ کر مارکھم نے سخت گرمی کی شکایت کی ہے۔

ویلہلم ہیڈے

اپریل ۱۸۵۵ء میں پادری ویلہلم ہیڈے (Wilhelm Heyde) اور Eduaorde پاگیل نے لداخ کا سفر کیا۔ اُن کی آمد کا مقصد لیہہ میں مشن کا ایک سینٹر قائم کرنا تھا۔
اُنھیں لداخی مرد عورتیں پسند آتے ہیں۔ لداخی شکل و شباہت سے متعلق وہ لکھتے ہیں: 'مخصوص منگول شکل و شباہت کی طرح چھوٹی آنکھیں، ابھری ہوئی رخسار کی ہڈیاں، سلجھے ہوئے کالے بال اور بھوری چمڑی ہے۔'
اُنھوں نے دیکھا۔ گلاب سنگھ کے ٹیکسوں سے بچنے کے لیے بہت سارے برطانوی ہند کے علاقوں میں فرار ہوئے تھے۔ ہنو پاٹا گاؤں میں لگ بھگ ۲۰ گھرانوں میں ۲ کے بغیر سارے مکانات خالی تھے۔ اُنھوں نے ایک انگریز افسر کا ذکر کیا ہے، جس نے لداخ میں دو سال سے زیادہ سروے کیا تھا۔ وہ انگریز افسر ایک دفعہ بستی رام (ڈوگرہ منتظم اعلیٰ) کو بازار میں آدھمکا اور داڑھی سے پکڑے زور زور سے جھنجوڑتا ہوا اس کی جابر حکومت اور خطے کے لوگوں پر ظلم وستم ڈھانے کی اجازت دینے کے خلاف سخت وسست زبان میں گالیاں دیں۔'

اڈولف شلیے گین وائٹ

اڈولف شلیے گین وائٹ پہلا یوروپی تھا، جو وسط ایشیا کی تحقیقی مہم پر روانہ ہوا۔ وہ ۱۸۵۶ء میں لیہہ پہنچا۔ وہ قومیت کے لحاظ سے جرمن تھا اور ایسٹ انڈیا کمپنی میں ملازم تھا۔ شلیے گین وائٹ وسط ایشیا میں پراسرار طور پر مارا گیا۔ اس کی ڈائری ایک نسوار فروش کو اونے پونے دام ردّی میں بیچی گئی تھی جسے بعد میں ایک شخص مرزا عبدالودود نے ۱۶ مہینوں کی چھان بین کے بعد پتہ کر کے ایک روپیہ میں خریدی۔

شلیے گین وائٹ نے پہلے لداخ کرانیکل کا جزوی طور پر ترجمہ کیا۔ وہ رقم طراز ہے: 'مجموعی طور پر لداخی سارے تبت میں مضبوط ترین اور سب سے محنتی لوگوں میں سے ہیں۔ لداخی لمبی عمر پاتے ہیں۔' ہمس گنپہ میں ایک لاما سے اس کی ملاقات ہوئی، جس کی عمر ایک سو تین سال تھی'۔

شلیے گین وائٹ کے دو بھائی بھی کمپنی کے ملازم تھے۔ ایک بھائی رابرٹ بھیس بدل کر تبت میں گرتوق پہنچا۔ دونوں بھائی پہلے یوروپی تھے، جنھوں نے قراقرم اور کیون لین سلسلہ ہائے کوہ پار کیے۔

نائٹ

ایک انگریز فوجی افسر کپتان نائٹ جولائی ۱۸۶۰ء میں لداخ کی سیاحت پر آتا ہے۔ ۲۷ جولائی کو وہ سری نگر سے اپنا سفر شروع کرتا ہے۔ پن دراس کے پاس کسی مقامی آدمی سے کسی جگہ کا فاصلہ پوچھا جاتا تو جواب میں تھوڑی دور یا نزدیک بتاتا۔ تھوڑی دور کا مطلب عام طور پر چار میل اور نزدیک کم سے کم پانچ میل ہوتا۔ دوسرے یوروپیوں کو بھی اس ضمن میں ایسا ہی تجربہ ہوا ہے۔ پن دراس کے پاس نائٹ نے چار لداخی دیکھے، جن کی ٹوپیوں پر پھول لگے تھے، کمر بند میں بنسریاں، چاقو اور تمباکو کی چھوٹی تھیلیاں وغیرہ باندھے تھے۔ نائٹ لکھتا ہے: 'بیس سال پہلے گلاب سنگھ کے حملوں کے نشانات ہر جگہ نظر آتے ہیں۔ مکانات اور قلعے گرد وغبار اور کوڑا کرکٹ میں بدل گئے ہیں۔ لیہہ City of Dead مردوں کا شہر لگتا تھا۔ حال میں مرے ہوئے اور پہلے مرے ہوئے لوگوں کے بہت سارے شمشان نظر آرہے تھے۔ مختلف اطراف میں ہڈیاں، بال وغیرہ بکھرے تھے۔

کرگل کے سورو گاؤں میں بھی نائٹ کو جنگ کا نفسیاتی اثر دیکھنے میں آیا۔ اس کو دیکھ کر عورتیں گھر سے نکل آئیں اور سامنے کے پہاڑ میں غائب ہوگئیں۔ بہت ساری عورتوں نے اپنے بچے اُٹھائے تھے۔ جلد ہی سارا گاؤں لوگوں سے خالی ہوگیا۔

۱۸۶۰ء میں خلسے میں ۱۵ گھرانے تھے جب کہ اولے ٹوقپو میں صرف ایک عورت رہتی تھی۔

نائٹ نے لیہہ بازار میں بہت سارے کتے، غلاظت اور بیکار لوگوں کو دیکھا۔ بقول نائٹ لداخی

مسلمان نوابوں اور یوروپ کے رئیسوں کی طرح پگڑ باندھے اور لمبے چوغے پہن کر اترا اترا کر چلتے تھے۔ ان کو دیکھ کر نائٹ کو بونڈ اسٹریٹ کا فیشن یاد آیا۔

دراس سے آگے نائٹ نے ایک پیڑ پر مٹی کا بنا ایک حقہ دیکھا جو زمین سے ۵ فٹ کی اونچائی پر تھا۔ تمباکو نوش اپنا تمباکو استعمال کر کے یہاں حقہ پی سکتا تھا۔

آرتھر برنک مین (Arthur Brinckman)

مئی ۱۸۶۰ء میں ایک یوروپی شکاری آرتھر برنک مین لیہہ پہنچا۔ وہ شکار کے لیے آیا تھا۔ تھانیدار بستی رام سخت بیمار تھا۔ اس نے بوڑھے تھانیدار کو کچھ کونین اور برانڈی دی۔

چنگ چھنمو میں ہر سال کئی انگریز افسر جنگلی یاک کے شکار کے لیے آتے تھے۔ اُنھیں مقامی شکاریوں کی بھی ضرورت ہوتی تھی۔ وہ لکھتا ہے: 'جب سے یوروپی کشمیر پہنچے ہر ایک قلی اپنے آپ کو شکاری بتاتا ہے۔ نورلا، لداخ کے ایک شکاری پلچور کی اس نے بڑی تعریف کی ہے۔ پلچور بڑا ہنس مکھ تھا اور گیت گاتا تھا۔ وہ لکھتا ہے: 'جب یورو میں پلچور مجھ سے جدا ہوا تو میں نے بڑا خالی خولی محسوس کیا۔'

دوسرے یوروپیوں کی طرح وہ بھی لکھتا ہے کہ اُن دنوں ڈوگرے لداخیوں کو بہت تنگ کرتے تھے۔

ڈبلیو ولسن

ان ہی دنوں یا ۱۸۶۰ء سے کچھ مدت پہلے ایک انگریز ڈبلیو ولسن لیہہ آیا۔ ذیل کے اقتباسات اس دور کی تصویر کے چند رُخ پیش کرتے ہیں۔ 'ٹانکچے سے جب میں لیہہ پہنچا تو میرے نوکر بیتابی سے انتظار کر رہے تھے۔ حکام میرا بڑا خیال رکھنے لگے۔ گورنر بستی رام میرے سفر کو کامیاب بنانے کے لیے بڑا کوشاں تھا۔ وہ میرے ساتھ چلنے لگا۔ لیہہ قصبہ میری توقع سے چھوٹا تھا۔ اس میں چند دُکان دار تھے۔ یارقند، کلو اور کنور کے چند سوداگر بھی تھے۔ مجھے بتایا گیا کہ ڈوگروں کی حکومت میں

تجارت بہت کم ہوئی ہے۔تجارت کی ایک شے افیون تھی اور یارقند جاتی تھی۔اس کے بدلے میں چرس اور چاندی فراہم ہوتے تھے۔'چرس بھی افیون کی طرح نشیلی ہے۔

مصنف نے کئی اور یوروپیوں کی طرح لداخیوں کو تاتار (Tartar) کہا ہے اور لکھتا ہے:'تمام تاتار قصبوں اور گاؤں کی طرح لداخ (لیہہ) دور سے اچھا دکھائی دیتا ہے لیکن قریب سے اس کا منظر مایوس کرتا ہے..........مکانوں پر سفیدی کی گئی ہے۔دروازوں اور کھڑکیوں پر سرخ، نیلے اور پیلے حاشیے چڑھائے گئے ہیں۔'

ولسن گنپوں کی شان دار عمارت سے متاثر رہے۔وہ لکھتا ہے:'لیہہ قلعہ میں ۶ اور ۹ پاؤنڈر کی ۲۰ توپیں ہیں۔

ولسن لیہہ کے کاردار کے گھر جاتا ہے جہاں اس کی خوب خاطر تواضع ہوتی ہے۔دوسری شام ایک ادھیڑ عمر کی عورت چند خادماؤں کے ہمراہ اس کے پاس آتی ہے اور درخواست کرتی ہے کہ اس کے قیدی شوہر کو تبتیوں سے چھڑا دیں۔ولسن عورت سے ہمدردی کا اظہار کرتا ہے۔تاہم صاف صاف کہتا ہے کہ اس سے چھڑانا اس کا یا کسی یوروپی کے بس میں نہیں ہے۔غالباً وہ عورت بز گوکلون کی بیوی تھی۔

لداخیوں کے چال چلن سے متعلق ولسن لکھتا ہے:'یہ لوگ بھلے مانس اور سچے ہیں۔اپنے کام میں وفادار ہیں۔مہمان نواز، حلیم اور خوش اخلاق ہیں۔'

لیفٹیننٹ کرنل ٹورنز (Torrens)

۱۸۶۰ء میں شملہ سے لیہہ آیا۔اس کے ساتھ ایک انگریز میجر بھی تھا۔لیہہ سے لگ بھگ ۴۰ کلومیٹر دور چنگا مرچے لنگ گاؤں کے پاس کلون ان کی پیشوائی کے لیے آیا۔اس کے ساتھ ایک ڈوگرہ افسر بھی تھا۔عمر رسیدہ بستی رام چند ماہ پہلے ریٹائر ہو کر کشتواڑ واپس گیا تھا اور اس کا جانشین نہیں پہنچا تھا۔آگے ٹورینز رقم طراز ہے:'اندھیرا ہو چکا تھا۔کہیں کہیں روشنی تھی۔کتّے بھونک رہے تھے۔کچھ آوازیں آرہی تھیں۔ظاہر تھا کہ ہم لیہہ پہنچے تھے۔'

لیہہ سے متعلق وہ لکھتا ہے۔ 'لیہہ میں فصیل ہے۔ جس پر بیچ بیچ میں مربع برجیاں بنی ہوئی تھیں۔ اب فصیل بہت ساری جگہوں پر گرائی گئی ہے اور کھنڈارات بنے ہیں۔ ان کے باہر مکانات تعمیر ہو رہے ہیں۔' مورکرافٹ کے زمانے میں فصیل اچھی حالت میں تھی۔

قصبے کے گرداب تمام اطراف میں سفیدہ کے پیڑ لگے ہیں۔

فریڈرک ڈریو

فریڈرک ڈریو پہلے پہل ۱۸۶۲ء میں لداخ آیا۔ بعد میں ڈریو لداخیوں کے لیے ایک جانا پہچانا نام بنا۔ برطانوی انگریز حکومت کے ایما پر مہاراجہ نے ڈریو کو لداخ کا منتظم اعلیٰ بنایا جو ان دنوں وزیر وزارت کہلاتا تھا۔ عام لوگ اس کی کارگزاری سے بڑے مطمئن تھے۔ لداخ اور بلتستان پر اس کی کتاب J and K Territories ایک اچھی تصنیف ہے۔ ڈریو نے سارا علاقہ دیکھا تھا۔

لیہہ قصبہ سے متعلق اس کا تاثر ملاحظہ ہو: 'یہ انوکھا قصبہ سرسبز باغوں اور اناج کے کھیتوں کے پہلو میں چٹانوں سے گھرا ہوا ہے۔ جس کے پس منظر میں اونچے پہاڑ ہیں۔ موسم گرما کی صبح کی دھوپ کی چمک اور روشنی میں نہاتا ہوا منظر جب مجھے یاد آتا ہے تو مجھے بڑی مسرت ہوتی ہے۔' وہ لکھتا ہے: 'لداخی چائے اور چھنگ بہت پیتے ہیں۔ عورتوں کو اچھی سماجی آزادی ہے۔ متمول خاندانوں کے سوا زیادہ تر بودھ کنبوں میں کثرت ازدواج کا رواج ہے۔'

لداخ میں ڈوگرہ نسل کے افراد تھے، جو غلام زادہ کہلاتے تھے۔ ڈریو جب ۱۸۷۱ء میں دوبارہ لداخ آیا تو ان کی تعداد کم تھی اور ان کی حالت خستہ تھی۔

تھامس جارج منٹگمری، محمد حمید اور نین سنگھ

۱۸۶۲ء میں ٹریگنومیٹریکل سروے آف انڈیا کا ایک افسر کپتان تھامس جارج منٹگمری لیہہ آیا۔ وہ خفیہ محکمہ سے بھی وابستہ تھا۔ منٹگمری نے دیکھا کہ ہندوستان کے لوگ لیہہ سے بلا روک ٹوک لہاسہ

اور یارقند آ جاسکتے ہیں۔اس نے سوچا کہ کسی بھی ہندوستانی کو سروے کے ضروری آلات کے ساتھ خفیہ طور پر وسط ایشیا اور تبت بھیجا جائے تو وہ اپنا کام کر کے آسکتا ہے۔منٹگمری نے افسران بالا کے سامنے اپنی تجویز رکھی اور منظوری ملنے پر ایک نوجوان محمد حمید کو ۱۸۶۳ء میں ضروری آلات کے ساتھ یارقند بھیجا۔محمد حمید نے سروے کا بنیادی علم حاصل کیا تھا۔یارقند میں وہ چھ ماہ رہا اور اس دوران یارقند سمیت کئی مقامات کی بلندیاں، عرض بلد اور طول البلد نوٹ کیے۔ایک روز ایک دوست نے محمد حمید کو خبردار کیا کہ چینیوں کو اس کی سرگرمیوں پر شک ہے۔وہ فوراً لداخ لوٹا لیکن سفر کے مصائب کی وجہ سے قراقرم میں فوت ہوا۔منٹگمری نے اس کے کاغذات حاصل کیے۔ان کاغذات میں روس کی سرگرمیوں سے متعلق بھی کچھ معلومات تھیں۔منٹگمری نے رائل جیوگرافیکل سوسائٹی کے ممبروں کے سامنے محمد حمید کی کارکردگی کی سراہنا کی۔

۱۸۷۳ء میں منٹگمری نے تبتی بولنے والا ۳۳ سالہ نین سنگھ کو لیہہ سے ایک یاتری کے بھیس میں تجارتی اور سفارتی مشن لوپچق کے ارکان کے ہمراہ لہاسہ روانہ کیا جو ہر تیسرے سال لداخ سے تبت جاتا تھا۔نین سنگھ الموڑہ کا رہنے والا تھا اور ایک مڈل سکول میں بطور ہیڈ ماسٹر کام کرتا تھا۔اس سے پہلے ۶۶-۱۸۶۵ء میں اس نے کٹھمنڈو سے لہاسہ ۱۲۰۰ میل لمبا سفر کیا تھا جہاں سے جھیل مانسرور سے ہوتا ہوا ہندوستان لوٹا تھا۔نین سنگھ شلیے گین وائٹ کے دو بھائی رابرٹ اور ہرمن کے ہمراہ لداخ میں قراقرم اور اس سے آگے کیون لین سلسلہ ہائے کوہ بھی گیا تھا۔

لوپچق مشن کا سربراہ چھرنگ نورفیل لداخی تھا۔نین سنگھ کے ہاتھ میں پر یروہیل مالا اور ایک عصا تھا۔پر یروہیل کے اندر لپٹے کاغذ پر منتر لکھے ہوتے ہیں۔نین سنگھ نے اس میں کورا کاغذ اور قطب نما چھپا رکھے تھے جس پر وہ مقامات کے نام اور ان کی بلندیاں چوری چھپے نوٹ کرتا تھا۔پر یر وہیل سے ایک بٹن جڑا تھا، جس کے دبانے سے یہ کھل جاتا تھا۔مالا میں ۱۰۸ دانے ہوتے ہیں لیکن نین سنگھ کی مالا میں ۱۰۰ دانے تھے۔ہر ۱۰ دانوں کے بعد ایک بڑا دانہ تھا۔اُنھیں اپنی اُنگلیوں سے گنتا ہوا وہ اپنے قدموں کا حساب رکھتا تھا۔اس کا ہر قدم ۳۳ اِنچ بنتا تھا۔ڈیرہ دون میں برٹش ورک

شاپ نے اس کے لیے ایک مصنوعی صندوق بنایا تھا، جس میں سروے کے آلات محفوظ طور پر چھپائے جاسکتے تھے۔ ڈنڈے کے خول میں ایک آلہ چھپا ہوا تھا۔ اس نے لہاسہ سمیت مختلف مقامات کی بلندیاں، عرض البلد اور طول البلد نوٹ کیے اور مالا جپتا ہوا ۲۵ لاکھ قدم چل کر ۱۲۰۰ میل کا فاصلہ طے کیا۔ لوپچق کے ارکان میں وہ اپنے اچھے سبھاؤ کی وجہ سے مقبول تھا اور اُنھوں نے اس کو اپنے ہمراہ دلائی لاما اور پنچن لاما کا درشن کرایا۔ لداخی نژاد کے لہاسہ کے دو مسلمانوں کو نین سنگھ پر جاسوس ہونے کا شک ہوا اور ان کے دباؤ ڈالنے پر نین سنگھ نے اپنی اصلیت ظاہر کی۔ تاہم تاجروں نے حکام کو نہیں بتایا۔ نین سنگھ نے لہاسہ میں اجازت کے بغیر آنے والے ایک آدمی کا سر قلم ہوتے دیکھا تھا۔ نین سنگھ کو جب معلوم ہوا کہ لوپچق کے ارکان لداخ لوٹ رہے ہیں تو اس نے چھرنگ نورفیل سے درخواست کی کہ اس کو ساتھ سفر کرنے کی اجازت دیں، جسے چھرنگ نورفیل نے خوشی خوشی مان لیا۔

جولائی ۱۸۷۴ء میں نین سنگھ ایک اور مرتبہ لیہہ سے لوپچق کے ہمراہ لہاسہ روانہ ہوا۔ تب لیہہ کے وزیر جانسن نے اس کی روانگی کا انتظام کیا۔ سامان اُٹھانے کے لیے چار قلی اور ۲۶ بھیڑیں دیں۔ ان قلیوں میں زنسکار کا چھومبیل بھی تھا، جس کی کارکردگی اور وفاداری کی انگریز اہلکاروں نے تعریف کی ہے۔ روانگی سے پہلے لیہہ میں افواہ پھیلائی گئی کہ ان کی منزل یارقند ہے۔ ٹانگچے سے آگے نین سنگھ اور اس کے ساتھیوں نے لاموں کا بھیس اختیار کیا۔ یوربیوں کے لیے تبت میں داخلہ بالکل ممنوع قرار دیا گیا تھا۔ تب تبت کے جغرافیہ سے متعلق لوگوں کو بہت کم علم تھا حتیٰ کہ بیسویں صدی کے شروع میں کہا جاتا تھا کہ تبت سے کہیں زیادہ دنیا کو چاند کا علم ہے۔ نین سنگھ اور دوسرے جاسوسوں نے تبت اور وسط ایشیا سے متعلق اہم معلومات فراہم کی ہیں۔

نین سنگھ کو روہیل کھنڈ میں ایک دیہات جاگیر میں دی گئی۔ رائل جیوگرافیکل سوسائٹی اور پیرس جیوگرافیکل سوسائٹی نے اس کی عزت افزائی کی اور انعامات دیئے۔

منٹگمری نے، جس کو بعد میں کرنل کا عہدہ ملا، لداخ کے مختلف مقامات کی بلندیاں اور لیہہ سکردو، لیہہ شملہ، لیہہ سپیتی اور لیہہ — شہیدولہ کے فاصلے کی تفصیلات دی ہیں۔

اس ضمن میں دوسرا بڑا سروے میجر جرنیل Le Marquis De Bourbel نے کیا۔ ان کی کتاب Routes in Jammu and Kashmir میں لیہہ - سری نگر، لیہہ - یارقند، کاشغر، لیہہ - رودوق، غار، جموں تا لیہہ براستہ زنسکار اور جموں تا سکردو براستہ کشتواڑ کے فاصلہ جات دیئے ہیں۔

لیٹز

۱۸۶۶ء میں لیٹز نام کا انگریز سیاح لداخ آیا۔ اس نے لداخی بودھوں کو منے دیوار پر منتر تراشے پتھر رکھتے دیکھا۔ تب لداخ میں نت نئی منتیں اور خواہشیں لے کر منے دیواروں پر منتر اور دھارمک شبیہیں تراشی سلیں رکھنے کی روایت عام تھی اور اس کے لیے پیشہ ور سنگ تراش موجود تھے۔

سید اکبر علی

سید اکبر علی ۱۸۶۶ء سے ۱۸۷۱ء کے درمیان لداخ میں وزیر وزارت تھا۔ اُس نے مسلم عورتوں کو سر پوش بیرق، کنٹوپ پہننا اور سنگھ کے کنگن لگانا غیر شرعی قرار دیا تھا۔

ایک مرتبہ ایک مقدمہ میں اُس نے چند مسلمان گواہان کو بطور قسم کلمہ پڑھنے کے لیے کہا۔ اُنھیں یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ وہ مسلمان کلمہ پڑھنا نہیں جانتے تھے۔ چنانچہ وزیر نے لیہہ کے امام کو بلایا اور ایک مکتب کھولنے کی تجویز رکھی تا کہ دینیات پڑھائی جائے۔ ۱۸۶۹ء میں ایک مکتب کھولا گیا اور بعد میں اسے پرائمری اسکول کا درجہ دیا گیا۔

ان دنوں لداخی مسلمان عمومی طور پر مذہب سے نابلد تھے اور مسلم معاشرے میں بہت ساری غیر اسلامی رسمیں رائج تھیں۔

محمد خان

۱۸۶۰ء کی دہائی میں روس کی توسیع پسند پالیسی کی وجہ سے سبھوں کی نظریں لداخ اور گلگت کی سرحدوں پر لگی تھیں۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے جہاں لداخ سروے ٹیمیں اور وسط ایشیا جاسوس بھیجے وہاں

مہاراجہ رنبیر سنگھ نے انگریزوں کے ایما اور خود اپنی طرف سے جاسوس بھیجے۔ مہاراجہ صورت حال سے فائدہ اُٹھا کر جہاں مشرقی ترکستان کو اپنے زیرِ نگیں لانا چاہتا تھا، وہاں ہندوستان سے انگریزوں کو بھگانے اور روس کو اس کی جگہ لانے کے لیے تاشقند میں روسی حاکم سے نامہ و پیام چلا رہا تھا۔ مہاراجہ نے مشرقی ترکستان کی سرحد کے پاس ایک مقام شہید ولہ پر قبضہ کر کے ایک قلعہ تعمیر کیا اور وہاں کچھ فوج رکھی لیکن انگریزوں کی مداخلت پر مہاراجہ کو یہ جگہ چھوڑنی پڑی۔ مہاراجہ کے بھیجے گئے مخبروں میں محمد خان اور مہتا شیر سنگھ نے اُردو میں اپنے سفرنامے لکھے ہیں۔ یہ مخطوطات میں نے سری نگر کی ریسرچ لائبریری میں دیکھے۔

محمد خان ۶۷-۱۸۶۶ء میں لداخ کے راستے مشرقی ترکستان روانہ ہوا اور اس کے سفرنامے کا نام ''احوال ملک لداخ'' ہے۔ تاہم اس میں لداخ سے متعلق زیادہ مواد نہیں ہے۔ محمد خان رقم طراز ہے: 'زکات خانہ صرف شہرلی میں ہے۔ (وہ لیہہ کو لی لکھتا ہے) دیوی دوارہ ہے جسے وزیر زورآور سنگھ نے بنایا تھا۔ شیعہ اور سنی مسجدیں ہیں۔ شیعہ مسجد مہاراجہ صاحب (رنبیر سنگھ) کے زمانے میں تعمیر کی گئی ہے۔' محمد خان نے گنپوں کا بھی تذکرہ کیا ہے اور پنگونگ جھیل میں بڑی بڑی مچھلیوں کی موجودگی کا ذکر کیا ہے۔ عام خیال یہ ہے کہ اس نمکین پانی کی جھیل میں مچھلیاں نہیں ہو سکتی ہیں۔

وہ لکھتا ہے: 'لداخ میں مہاراجہ کے تعمیر کردہ ہر قلعہ میں چشمہ آب شیریں رہتا ہے۔ .... لیہہ میں ایک سرائے اور دھرم شالہ ہیں۔ علاقے میں مہاراجہ کے بنائے پانچ چھ باغات ہیں۔ ان کے نام گلاب باغ، رنبیر باغ، پرتاپ باغ اور رام باغ ہیں۔ کچھ مدت پہلے حاکم لداخ نے ایک باغ بنام رام باغ میاں رام سنگھ جی کے نام پر بنایا ہے۔'

محمد خان کو رنبیر سنگھ کے زمانے میں جاسوسی کے لیے وسط ایشیا بھیجا گیا تھا۔ تاہم سفرنامہ مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے زمانے میں مکمل کیا ہوا لگتا ہے جیسا کہ باغات کے ذکر سے عیاں ہے۔

سفرنامہ میں یارقند، ختن، توقند وغیرہ کے احوال زیادہ دیئے گئے ہیں۔ نیز جانسن، ہیورڈ، ڈیوس اور نجف شاہ کے سردے کا تذکرہ ہے۔

مہتہ شیر سنگھ

مہتہ شیر سنگھ ۱۶ ساون ۱۹۲۳ء بکرمی مطابق ۲۸ جولائی ۱۸۶۶ء مہاراجہ کے حکم پر مخبری کے لیے کابل سے ہوتا ہوا قوقند، بخارا اور یارقند روانہ ہوا تھا اور لداخ کے راستے کشمیر واپس آیا تھا۔ ایک سال سے زیادہ کچھ مدت کے بعد وہ پنامیک پہنچا۔ لیہہ کو وہ لداکھ لکھتا ہے۔ لیہہ میں وہ صرف ایک روز رُکا۔ اپنے قلمی نسخہ ''سفرنامہ مہتہ شیر سنگھ'' میں وہ لکھتا ہے:

'اچھا مکان' ایک چھوٹا خوبصورت شہر آباد ہے۔ یہاں مہاراجہ نے ایک کوٹھی بنائی ہے۔'

سفرنامہ میں کرگل کا نام نہیں ہے۔ البتہ پشکیوم کا ذکر ہے۔

واپس پہنچنے پر مہاراجہ نے مہتہ شیر سنگھ کو خلعت اور عطیات دیئے۔

ولیم ہنری جانسن

ولیم ہنری جانسن ۱۸۶۶ء میں لداخ آیا۔ شلیے گین کے بعد وہ دوسرا یوروپی تھا جس نے وسط ایشیا کا سروے کیا۔ بعد میں ۱۸۷۳ء سے ۱۸۸۴ء تک لداخ میں وزیر وزارت (منتظم اعلیٰ) رہا۔ اس نے ایک لداخی عورت سے شادی کی۔ وزیر وزارت کے دوران ایک مرتبہ وہ تبدیل ہوگیا تو لداخیوں نے مہاراجہ رنبیر سنگھ کو اس کی تبدیلی منسوخ کرنے کے لیے درخواست دی۔ درخواست بودھی میں لکھی گئی ہے اور اس پر مہریں اور انگوٹھے کے نشانات ہیں۔ درخواست میں لکھا گیا ہے۔ مسٹر ڈریو (سابق وزیر وزارت) اور مسٹر جانسن کا لداخ میں بطور وزیر تعینات کے بعد خطے کے لوگ خوش اور خوش حال ہیں۔ ہمیں معلوم ہوا کہ جانسن صاحب کو کشمیر تبدیل کیا گیا ہے۔ اس لیے ہم یور ہائی نیس کو اپیل کرتے ہیں کہ جانسن کو لداخ میں بطور وزیر رکھا جائے۔ بعد میں جانسن کے خلاف ہمیں گنپہ کے مذہبی تہوار ہمس چھیشو پر چھمز (دھارمک رقص) کے ایک آئٹم کے بعد زبردستی کشمیر بھانڈ ناچ دکھانے پر بودھوں نے سخت غم وغصہ دکھایا۔ اس کی رنگین مزاجی بھی بہتوں کو بری لگتی تھی۔ لیہہ میں اس کے خلاف مظاہرے ہوئے، جن میں ڈوگرہ انتظامیہ کے تقرر کردہ سو لداخی ملیشیا نے بھی حصہ لیا۔ جانسن

نے ۸۱-۱۸۸۰ء کی اپنی سالانہ رپورٹ میں اس کے خلاف مظاہرے کے لیے دو لداخی لیڈر ہیرا مونڈ اور روپ چند کو ذمہ دار ٹھہرایا۔ ہیرا مونڈ ساکٹی اور روپ چند نیموں گاؤں سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ نام ڈوگروں نے رکھے تھے۔ روپ چند کے خلاف جانسن نے وارنٹ نکالا تھا لیکن وہ روپوش ہوا تھا۔ لداخی ملیشیا کو جانسن نے تاتار رجمنٹ کہا ہے۔

۱۸۸۲ء کی سالانہ رپورٹ میں جانسن نے دوبارہ لکھا ہے کہ اس کے خلاف عائد کی گئی شکایتیں جھوٹی ہیں۔ اس رپورٹ میں ایک سرکردہ لداخی ژندن منشی کو ایجی ٹیشن کا سرغنہ قرار دیا ہے اور روپ چند، ہیرا مونڈ، نونو کلون سمیت دو غیر مقامی ملازمین کے خلاف بھی شکایتیں کی گئی ہیں۔ اس نے معتوب ملازموں کو تبدیل کرنے اور دوسروں کو سخت سزائیں دینے کی تجویز رکھی ہے۔ بعد میں ہمس کے گوشوق ستق سنگ راسپا اور روپ چند کی قیادت میں ایک وفد مہاراجہ رنبیر سنگھ سے ملنے کشمیر گیا اور وفد کی درخواست پر مہاراجہ نے جانسن کو تبدیل کیا تاہم فرانکی اور چوہان کے حوالے سے جان بیرے نے لکھا ہے کہ لداخ کے چند بارسوخ لوگوں نے وزیر مہتہ منگل کے ملازموں کو رشوت دے کر اپنا ٹیکس کم کرایا تھا۔ جانسن جب وزیر بنا تو اس نے مالی نظام میں کلی تبدیلی لانے کے لیے اس پر نظر ثانی کی۔ ان بارسوخ لوگوں کے ایما پر مہاراجہ سے ایک وفد ملا اور جانسن کی پیش کردہ رپورٹ واپس لینے کے بدلے فی روپیہ چار آنے کے اضافے کی پیش کش کی جسے مہاراجہ نے قبول کیا اور جانسن لداخ سے چلا گیا۔

عورت جانسن کی کمزوری تھی۔ وہ تماشوں اور پارٹیوں کا شائق تھا۔ تاہم بطور منتظم اعلیٰ اس کا نظم و نسق عمدہ تھا۔ اس نے کھیتی باڑی اور تجارت کو فروغ دینے کے لیے کام کیا۔ وہ مقدمات کا فیصلہ فوری کرتا تھا۔ جس سے لوگ مطمئن تھے۔ رائل جیوگرافیکل سوسائٹی نے تحقیقی خدمات کے لیے جانسن کو ۱۸۷۵ء میں سونے کی ایک گھڑی عطا کی اور اعزازی فیلو بنایا۔

بعد میں وہ کشمیر میں مہاراجہ کی ملازمت میں رہا۔ شک کیا جاتا ہے کہ اس کی موت زہر دینے سے ہوئی۔ اس کی رنگین طبیعت اور عشق مزاجی کی وجہ سے کچھ لوگ اس کے دشمن بن گئے تھے۔

ہنری کیلے

برطانوی ہند نے لداخ میں وسط ایشیا سے تجارت کی نگرانی اور سرحد پر روس اور چین کی سرگرمیوں پر نظر رکھنے کے لیے لیہہ میں ایک انگریز افسر کی تعینات کا فیصلہ کیا۔ ڈوگرہ حکومت اپنی قلمرو میں برطانوی ہند کی مداخلت کے خلاف تھی۔ ۱۳ اپریل ۱۸۶۷ء کو جب ہنری کیلے کو لیہہ میں برٹش جوائنٹ کمشنر نامزد کیا گیا تو مہاراجہ رنبیر سنگھ نے احتجاج کیا اور اپنے ولی عہد پرتاپ سنگھ اور وکیل نہال چند کو وکالت کے لیے لاہور بھیجا۔ اُنھوں نے اس تقرری کو ریاست کے اندرونی معاملات میں دخل اندازی قرار دیا۔ پنجاب کے لیفٹیننٹ گورنر نے جواب دیا کہ برٹش جوائنٹ کمشنر کی تقرری کے ضمن میں وائسرائے کا حکم حتمی ہے، جس میں تبدیلی نہیں ہوسکتی۔

ہنری کیلے ایک ڈاکٹر تھا۔ لداخ آکر اس نے مشرقی ترکستان جانے کے لیے ایک نیا راستہ انتخاب کیا، جو لداخ کے چنگ چھنمو علاقے سے ہوتا ہوا جاتا تھا۔ یہ راستہ برطانوی ہند کے علاقے کلو اور لاہول سے نزدیک پڑتا تھا۔

رابرٹ شا

رابرٹ شا جولائی ۱۸۶۸ء میں لیہہ پہنچا جہاں دو ماہ رہنے کے بعد ۲۰ ستمبر کو سفارتی مشن پر مشرقی ترکستان گیا۔ اُن دنوں یعقوب بیگ مشرقی ترکستان کا حکمراں تھا۔ لیہہ میں قیام کے دوران وہ مشرقی ترکستان کی ثقافت اور لوگوں کے مزاج سے متعلق معلومات جمع کرتا رہا۔ ایک اور انگریز جارج ہیورڈ اُن ہی دنوں الگ سے روانہ ہوا۔ وہ ایک پیشہ ور محقق تھا۔ دونوں کی منزل ایک تھی۔ چند روز بعد دونوں ملے اور ایک ساتھ کھانا کھایا۔ یعقوب بیگ نے رابرٹ شا کی خوب آؤ بھگت کی۔ اس نے شا سے کہا: 'انگلستان کی ملکہ سورج کی طرح ہے۔ جہاں بھی چمکتی ہے، اسے گرمی ملتی ہے۔ میں سردی میں ہوں۔ میری خواہش ہے کہ اس کی کچھ شعاعیں مجھ پر پڑیں۔'

بعد میں رابرٹ شا کی نقل وحرکت پر یعقوب بیگ نے پابندی لگائی۔ ہیورڈ کے ساتھ بھی

ایسا ہی برتاؤ کیا۔ آخر کار وہ رہا کیے گئے، لیکن ہیورڈ پراسرار طور پر مارا گیا۔ اس کی لاش ہندوکش میں درکوت کے مقام پر گلیشیر کے نیچے پتھروں کے ڈھیر میں پائی گئی۔

شا اور ہیورڈ نے دفاعی نقطہ نظر سے قراقرم کی افادیت سے وائسرائے لارڈ میو کو آگاہ کیا۔

۱۸۷۷ء میں رابرٹ شا لیہہ میں برٹش کمشنر بنا۔ وہ ینگ ہاسبنڈ کا چچا تھا۔

لداخ سے متعلق رابرٹ شا کے کچھ تاثرات کا ذکر اوپر بھی آیا ہے۔ شا نے لکھا ہے۔ 'لداخ کے ہر گاؤں سے پہلے منے دیوار نظر آتی ہے۔ ہر بھیڑ میں کوئی نہ کوئی لاما نظر آتا ہے،' شا نے لداخی ٹٹو کو مشکل سے چوہے سے بڑا کہا ہے۔ شا کے مطابق ان دنوں بہت سارے افغان لداخ آتے تھے۔

کشمیر میں انگریزوں کی مداخلت

Kashmir Papers, British Intervention in Kashmir کے نام سے تین انگریزوں کے مقالوں کو ایک کتاب میں یکجا کیا گیا ہے، جس میں مہاراجہ کے حکومت کی بدنظمی اور اس کے حکام کے مظالم کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ یہ مقالے ۱۸۶۸ء، ۱۸۷۰ء اور ۱۸۹۰ء میں مرتب ہوئے۔ اُنھیں لکھنے والے بالترتیب اورارتھر برنک میل، روبرٹ تھورپ اور ولیم ڈگبے تھے۔

کانگڑا کے انگریز ڈپٹی کمشنر نے لکھا ہے کہ اپنے پورے سفر کے دوران میں نے لداخ میں مہاراجہ کی سرکاری کی زیادتیاں، خود حکمراں کا لالچی پن، سفاکی اور اس کے تمام ارباب اختیار کی انتہائی بدعنوانیاں کی واحد کہانی سنی۔

دوسرے پیپر میں لکھا ہے: 'مہاراجہ لداخ میں اپنے افسروں کو کنٹرول میں لانے کی بساط نہیں رکھتا اور یہ فرض کرنا نامناسب نہیں ہے کہ وہ اس طرح کشمیر میں بھی اُنھیں قابو میں رکھنے کے قابل نہیں ہے۔'

لداخ میں تاجروں پر ہونے والے مظالم کا تذکرہ ہے اور وہ لکھتا ہے۔ مہاراجہ اور اس کے حکام تاجروں پر ظلم کرتے ہیں اور ناجائز پیسہ بٹورتے ہیں۔ تاجران بھاری محصولات سے بھی نالاں ہیں۔'

سری نگر میں مقیم انگریز ریزیڈنٹ نے مہاراجہ کو لداخ میں اصلاحات لانے کے لیے کہا ہے۔

لیہہ کے برٹش جوائنٹ کمشنر ڈاکٹر کیلے کو بھی گلہ ہے کہ پرانے نظام میں اصلاحات لانے کی کوشش نہیں کی گئی ہے۔

۱۸۶۷ء میں مہاراجہ نے غالباً انگریزوں کی تجویز پر تجارت کو فروغ دینے کے لیے لیہہ میں ستمبر اور جموں میں اکتوبر میں تجارتی میلے منعقد کرنے کے احکامات جاری کیے۔ مہتہ شیر سنگھ کو انتظامات دیکھنے کے لیے لیہہ بھیجا گیا۔ یہ میلہ ۱۴ ستمبر سے شروع ہوا اور ایک مہینہ جاری رہا۔ اس میں پنجاب، کشمیر، وسط ایشیا، تبت، سکردو اور لیہہ کے تاجروں اور دیہاتیوں نے اپنی مصنوعات اور تجارتی اشیا کی نمائش کی اور بہترین نمائشی سامان رکھنے والوں میں انعامات تقسیم کیے گئے۔ اگست ۱۸۷۲ء میں شے میں ایک ایسا میلہ منعقد ہوا۔ تب ولیم جانسن لیہہ کا وزیر تھا۔

ایسا لگتا ہے کہ یہ میلہ فصل کٹائی کے تہوار روپہلا کے ساتھ منعقد ہوا۔ برطانوی ہند کے ایک اہل کار کپتان ہنری ساچے کے مطابق ۱۸۵۱ء میں لیہہ سے ۶ میل دور شے میں ایک تجارتی میلہ منعقد ہوا، جس میں زیادہ تر مغربی تبت کے خانہ بدوش چنکپا قبیلہ نے حصہ لیا۔ اس لیے اس میلے کا نام چنگدوس یا چنگ پاؤں کا اجتماع کہا گیا۔ ان کے ساتھ یاک، گھوڑے اور اندازاً دس ہزار سے تیس ہزار کے درمیان بھیڑیں تھیں۔ چنگ پا بڑی مقدار میں اون اور نمک لے کر آئے تھے۔ ایک بھیڑ سولہ سیر یا لگ بھگ ۱۵ کلوگرام بوجھ اُٹھاتی ہے۔

پاچینو

روس نے اس ٹرانس ہمالیائی خطے سے سیاسی اور تجارتی طور پر بڑی دلچسپی لی ہے اور اپنے سفارت کار اور جاسوس بھیجے ہیں۔ ۷۰-۱۸۶۹ء میں پاچینو نام کے ایک روسی اہلکار نے ایک یارقندی تاجر کے بھیس میں لیہہ ۔ سکردو اور گلگت کا سفر کیا۔ اس کے پاس روسی حکومت کی طرف سے مہاراجہ رنبیر سنگھ کے نام ایک تحریری پیغام تھا۔ پاچینو ترکی، فارسی اور عربی زبانیں جانتا تھا۔ ۱۸۷۳ء میں پاچینو دوبارہ ایک ترکی حکیم کے بھیس میں مہاراجہ سے ملاقات کرنے کشمیر پہنچا۔ برٹش جوائنٹ

کمشنر آنے جانے والوں پر کڑی نظر رکھتا تھا۔ اس لیے روسی ایجنٹ بھیس بدل کر خفیہ طور پر آتے تھے۔ مہاراجہ ان دنوں کشمیر میں نہیں تھا۔ پاچینو نے مہاراجہ کے وزیر دیوان جوالا سہائے اور اس کے بیٹے لچھمن سہائے سے تبادلۂ خیال کیا۔

سر ڈوگلس فورسیتھ کے سفارتی مشن

روس کی توسیع پسند پالیسی کی وجہ سے برطانوی ہند سرکار کو تشویش تھی اور اس کی نظر میں مشرقی ترکستان کی اہمیت بڑھ گئی تھی۔ وائسرائے لارڈ میو کا جانشین لارڈ نارتھ بروک اس معاملے میں زیادہ سنجیدہ تھا۔ فورسیتھ اس کا دست راست تھا۔ برٹش انڈیا یعقوب بیگ سے تجارتی اور سیاسی تعلقات اُستوار کرنا چاہتا تھا۔

۱۸۷۰ء میں سر تھامس ڈوگلس فورسیتھ کی قیادت میں ایک سفارتی مشن یعقوب بیگ والیٔ مشرقی ترکستان کے ہاں کاشغر روانہ ہوا۔

۱۸۷۳ء میں دوسرا مشن بھیجا گیا۔ یہ مشن اب تک کا سب سے بڑا اور بڑا آن بان والا تھا۔ کشمیر میں جھیل ڈل کے کنارے چنار کے پیڑوں کے سائے میں مشن کو حتمی شکل دی گئی۔ مشن میں متعدد انگریز افسران کے علاوہ دوسرے ملازمین تھے جن کی تعداد لگ بھگ ۳۵۰ تھی۔ ۵۰۰ باربردار، ۶۷۴ قلی، اور دوسرے ملازمین کا انتظام کیا گیا۔ باربرداری اور سواری کے لیے ۱۶۲۱ یاک اور گھوڑے لیے گئے۔ بڑے مشن کا مقصد یعقوب بیگ کو متاثر کرنا تھا۔ اس کا انتظام لیہہ کے وزیر جانسن نے کیا تھا۔ وہ خود شہید ولہ تک گیا۔

فورسیتھ نے افسران کے تعارف کے بعد یعقوب بیگ کو ملکۂ برطانیہ کا خط پیش کیا اور ملکہ کے تحائف پیش کیے۔ پھر وائسرائے کا خط اور تحفے پیش کیے۔

مشن کی وجہ سے لیہہ میں اشیائے خوردنی کی قلت پڑی اور قحط کا سماں پیدا ہوا جس کا اثر کئی سال رہا۔ بہت سارے قلی بیرون لداخ سے لائے گئے تھے اور ان کی کفالت مشکل تھی۔ مشن ایک فوجی مہم کی طرح لگ رہا تھا۔
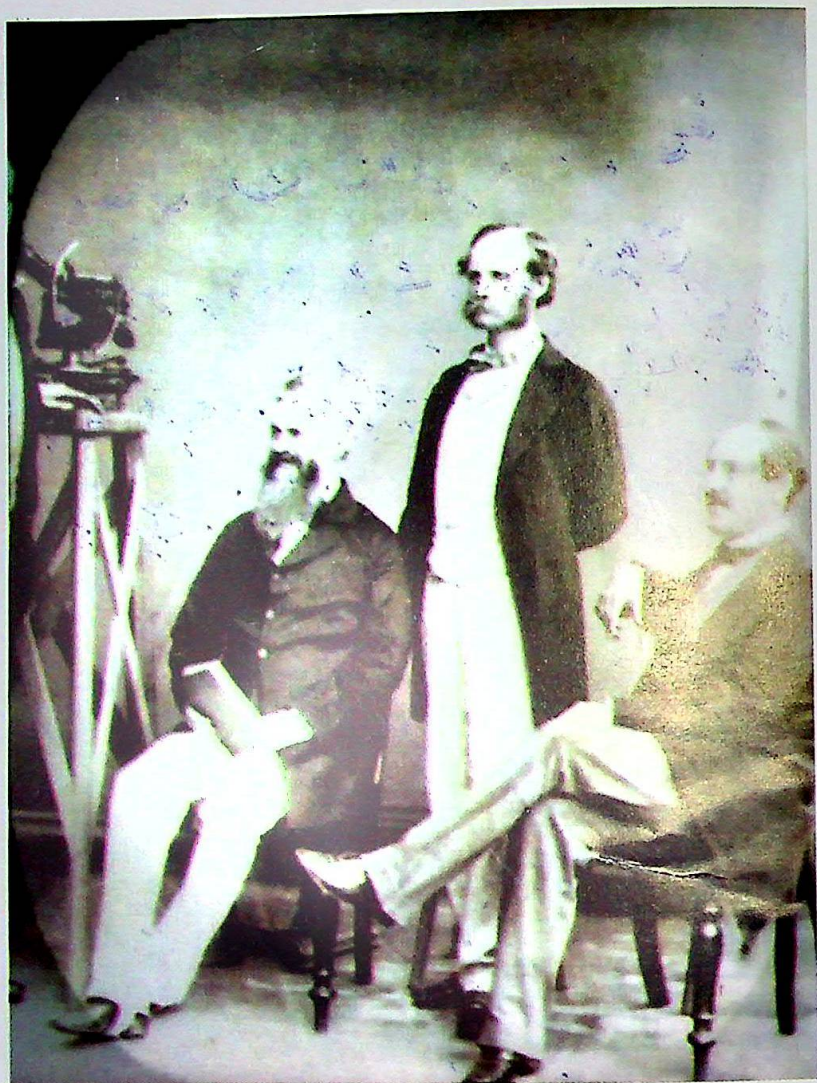
تھامس جارج منٹگمری اور اس کے ساتھی

ینگ ہاسبنڈ کئی مرتبہ لداخ آیا

تھامس جارج منٹگمری، جس نے لہیہ کے راستے تبت اور سنٹرل ایشیا جاسوس بھیجے تھے۔ وہ برطانوی ہند کا ایک افسر تھا۔
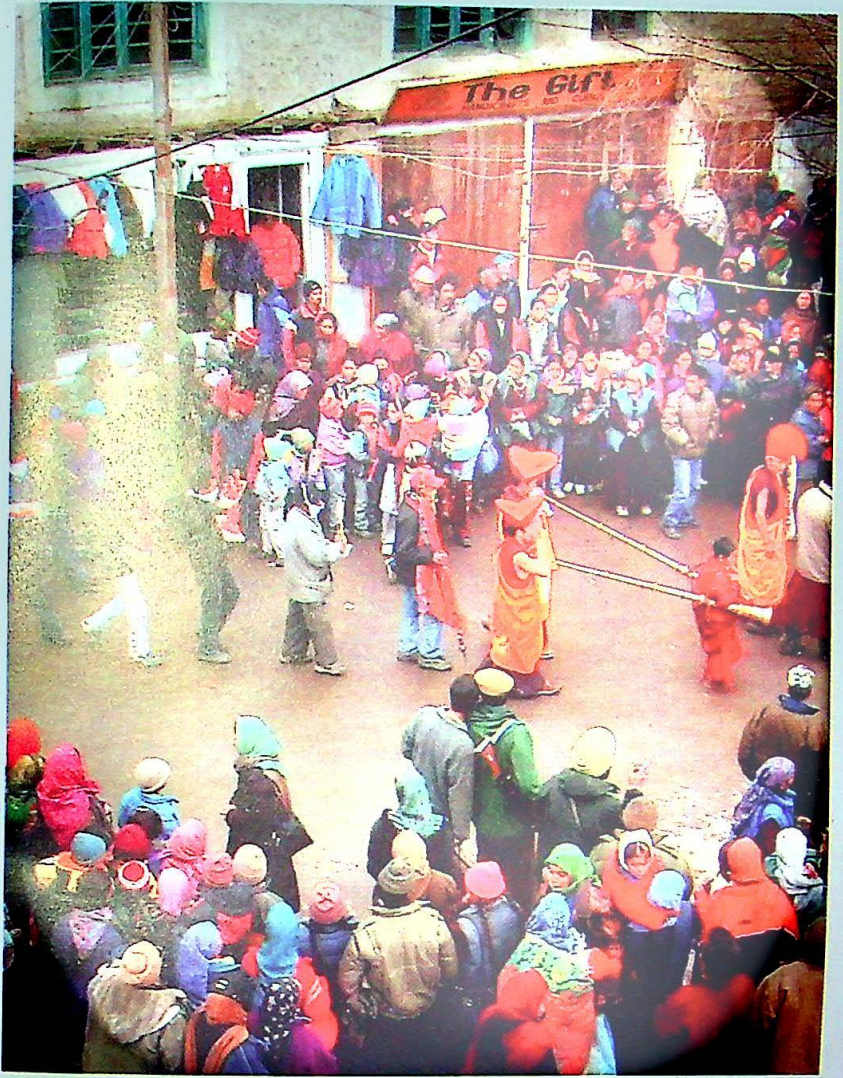
لیہ میں دھارمک میلے کی ایک جھلک

دوسری قطار میں دائیں طرف لداخی عالم جوزف گیرگن اور بائیں طرف پادری والٹر اسبو، جو دس سال لداخ میں رہے ۔ کتاب میں ان دونوں کا تذکرہ ہے ۔ جوزف گیرگن نے مونچھیں رکھی ہیں اور والٹر اسبو نے ٹائی اور چشمہ لگا ہے۔

لداخی عورتیں اپنے پورے لباس اور زیورات میں

لداخ کی وادیوں میں خودرو جنگلی پھولوں کی بہتات ہے

جھیل پنگونگ ۔ ہند، چین سرحد پر یہ جھیل ایک اہم سیاحتی مرکز ہے

ولیم مورکرافٹ اور اس کا ساتھی 1912ء میں مغربی تبت میں۔

لیہ کا تاریخی بازار 1894 میں
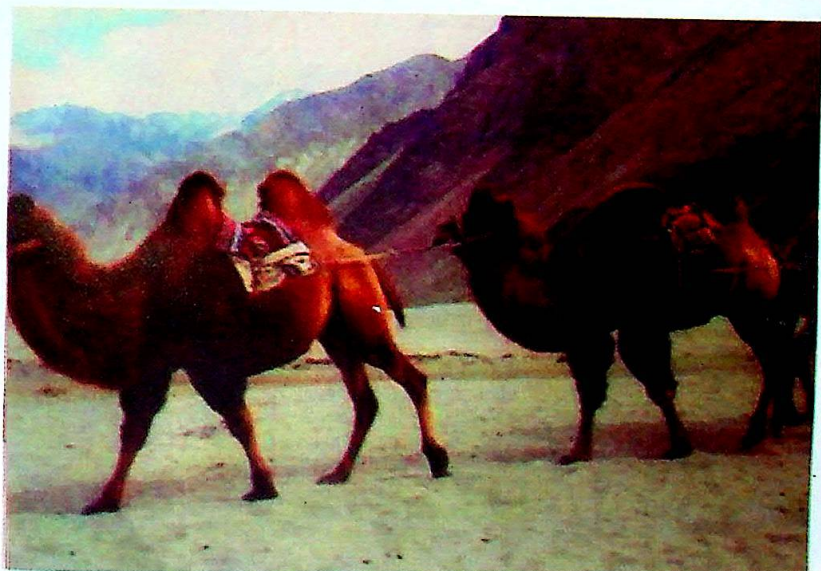
لداخ اور سنٹرل ایشیا کے مابین ماضی میں تجارتی تعلقات کا ورثہ۔ سیاحوں کا ایک مشغلہ اونٹ کی سواری ہے۔

نکولس نوٹووچ (جس نے 1887ء میں یہ انکشاف کیا کہ لداخ میں ایک پرانا صحیفہ ہے، جس میں ہندوستان اور تبت میں حضرت عیسی کی آمد کا ذکر ہے۔ اس کتاب سے سارے یورپ، امریکہ وغیرہ میں سنسنی سی پھیل گئی۔ تب سے اس پر متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں اور فلمیں بنی ہیں۔ کتاب میں اس کا ذکر ہے۔)
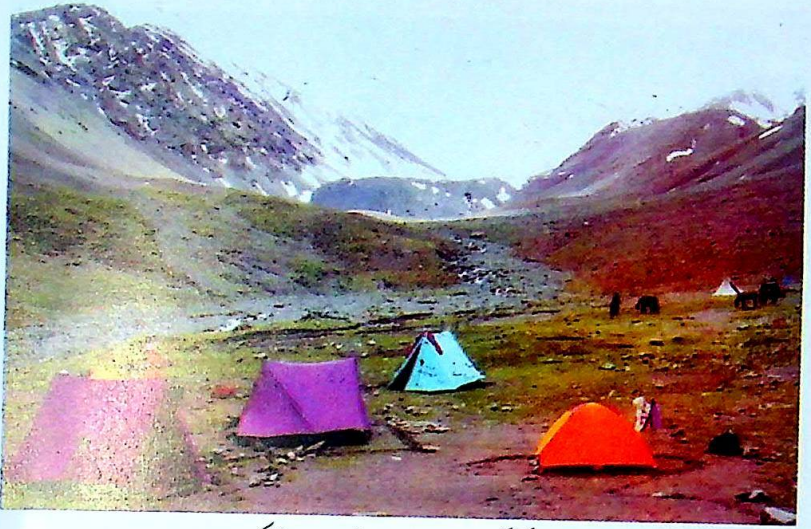
ٹریکینگ پر جانے والے سیاحوں کا کیمپ

سیاح، ٹریکینگ پر

پنڈت نین سنگھ، جو 1873ء میں برطانوی ہند کی طرف سے لیہ سے ایک یاتری کے بھیس
میں جاسوسی اور سائنسی تحقیق کے لئے تبت کی راج دھانی لہاسہ پہنچا۔
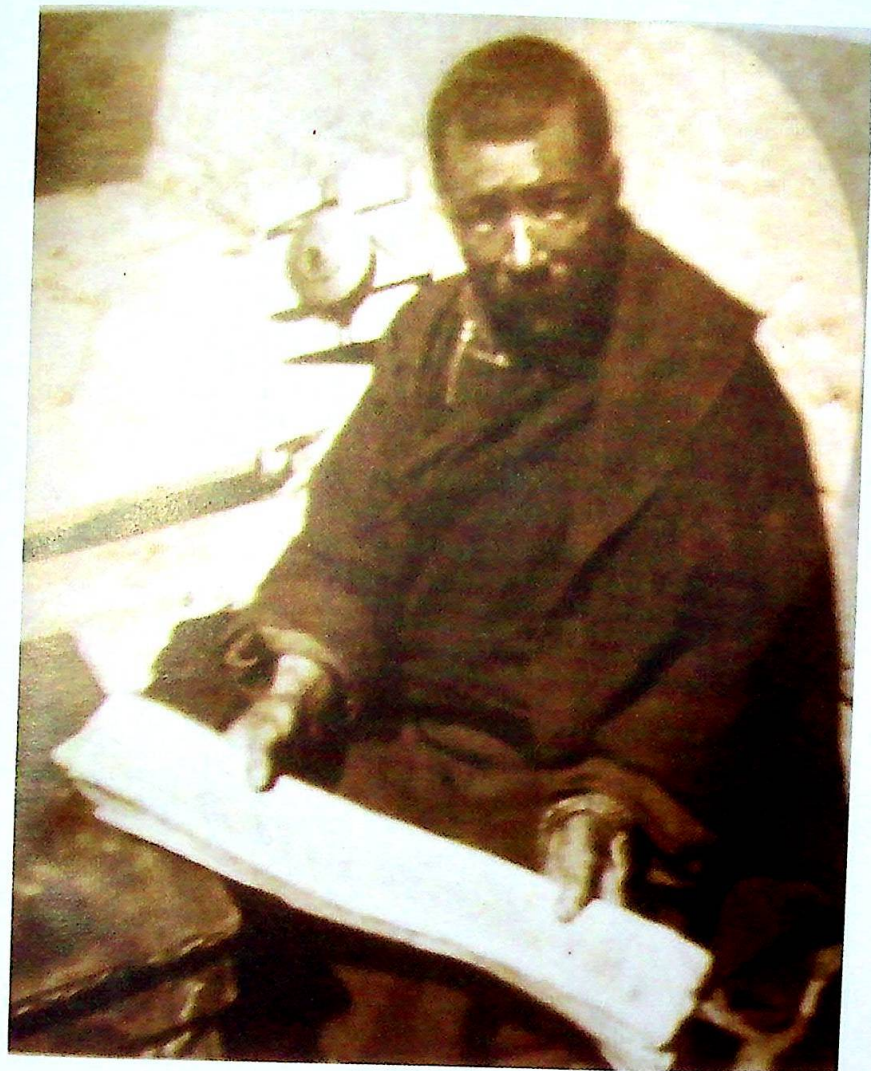
ایک لامانے مذہبی قلمی نسخہ مسز گاسیکو اور میڈم الزبیتھ کاسپری کو دکھایا۔

مشن کے ایک محقق کپتان Biddulaph رقم طراز ہے: 'اس میں مبالغہ نہیں کہ ہم ہمارے ہمسایہ ملکوں کی نسبت وسطی افریقہ کا جغرافیہ زیادہ جانتے ہیں۔'

اس مہم میں واپسی پر ایک سائنسداں فرڈیننڈ سٹولزیکا لداخ کے ایک ویران مقام مورگو میں ۱۹ جولائی ۱۸۷۴ء کو بلندی کی بیماری کی وجہ سے فوت ہوا۔ تب وہ ۳۶ سال کا تھا۔ سٹولزیکا ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کا سکریٹری رہا تھا۔ اس کی نعش لیہہ لائی گئی اور مسیحی قبرستان کے پاس تدفین کی گئی۔ اس مہم کے دوران سٹولزیکا نے بڑی مقدار میں پودے، چٹانوں کے نمونے اور جانور جمع کیے تھے۔

دوسرے سال جب فورسیتھ ہندوستان لوٹا تو مشن کی کامیابی پر ایک ہیرو کی طرح استقبال کیا گیا۔

ایچ. ڈبلیو. بیلیو (Bellew)

۱۸۷۳ء میں برطانوی ہند کا ایک سائنسداں، ایچ ڈبلیو بلیو سفارتی اور سائنسی مشن پر کاشغر جانے کے لیے لیہہ پہنچا۔ لیہہ کے وزیر جانسن نے لیہہ سے ۵۰ میل آگے سسپول میں اس کی پیشوائی کی۔ لیہہ پہنچنے پر اس کے اعزاز میں لیہہ قلعہ سے توپوں کی سلامی دی۔ برٹش جوائنٹ کمشنر رابرٹ شا نے لیہہ میں اس کا استقبال کیا جہاں لیہہ بازار میں فوج کے ایک دستے نے سلامی دی۔ جانسن سائنسداں بلیو کے ہمراہ یارقند کی سرحد شہیدولہ تک گیا اور فورسیتھ مشن کے ارکان میں شامل ہوا۔

بلیو نے اس سفر کے دوران لداخی سماجی زندگی کا کچھ مشاہدہ کیا تھا۔ وہ لکھتا ہے: 'ایک لداخی کے لیے اس کی پیالی بڑی چہیتی ہے۔ یہ ایک دلی دوست کی طرح اس کے سینے سے چمٹی رہتی ہے اور ہمیشہ کام دیتی ہے۔ پانی پینے، Porridge دلیا اور ستو کھانے کے لیے پیالی استعمال ہوتی ہے ....مسلمان پگڑی باندھتے ہیں۔ کتابوں میں چھپی تقریروں سے پتہ لگتا ہے کہ پچھلی صدی کے اوائل میں مسلمان مرد کنٹوپ بھی پہنتے تھے۔ بعد میں اس کی جگہ فیض کیپ نے لی جسے رومی ٹوپی کہا جاتا تھا۔

نوبراہ میں ۱۸۴۲ء میں جھیل خومدن کے پشتے ٹوٹنے سے جو نقصان پہنچا تھا، بلیو نے تیس سال کے بعد اس کے نشانات دیکھے۔ کاشغر میں وہ فورسیتھ مشن کے ارکان سے جا ملا۔

کاشغر سے واپسی پر جانسن نے چھونگ تھاشی سے آگے دریائے شایوک کے پاس ایک اور مرتبہ سائنسداں کا خیر مقدم کیا۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ کی طرف سے ٹین بند یوروپی کھانے، شمپین، شیری اور دوسری اقسام کی شراب بھیجی گئی تھی۔

۱۷ جون کو وہ لیہہ واپس پہنچا۔ برٹش جوائنٹ کمشنر Molloy نے لیہہ سے دو تین میل آگے بیل لیو کا استقبال کیا۔ لیہہ قلعہ سے سلامی میں توپ کے پندرہ گولے داغے گئے اور سپاہیوں کے علاوہ مقامی لوگوں نے روایتی طور پر اس کا سواگت کیا۔ آنے یا نہ آنے کے لیے مقامی لاگوں کی مرضی کو دخل نہیں تھا۔ اس زمانے میں انگریز افسروں کی بڑی ناز برداری ہوتی تھی۔

اس کے چند روز بعد سٹولزیکا کی نعش لیہہ پہنچی۔ ۱۸۷۶ء میں لیہہ میں اس کی قبر پر Obelisk نصب کیا گیا جس پر اس کی زندگی کے مختصر حالات لکھے گئے ہیں۔

بلیو نے کرگل قصبے کا بھی ذکر کیا ہے اور پوریگ کی راجدھانی بتایا ہے۔

یعقوب بیگ نے ۱۸۶۵ء سے ۱۸۷۶ء تک حکومت کی۔ اس کے دو بیٹوں میں تخت کے لیے لڑائی ہوئی۔ چین نے اس سے فائدہ اٹھایا اور دوبارہ مشرقی ترکستان پر قابض ہوا۔ یعقوب بیگ مارا گیا۔ بعض لوگوں کے مطابق زہر کھا کر خودکشی کی۔ روس نے کاشغر میں ایک بڑی کونسل قائم کی جب کہ ۱۸۹۰ء کی دہائی تک کسی انگریز ملازم کو چین نے کاشغر میں آنے کی اجازت نہیں دی۔ چین نے خطے کا نام سنکیانگ یانئی مملکت رکھا۔ آج اسے شین جیانگ کہا جاتا ہے۔

انڈریوولسن

۱۸۷۳ء میں ایک انگریز سیاح سپیتی لاہول سے ہوتا ہوا زنسکار پہنچا جہاں سے دراس روانہ ہوا۔ زنسکار میں وہ اپنے مشاہدے کو یوں بیان کرتا ہے: 'اوم منے پدمے ہوم' کا منتر ہر ایک کے لب پر تھا۔ مسافر سفر میں، چرواہا بھیڑ بکریاں چراتا ہوا، گرہستن گھر میں اور لاما ہر مرحلہ پر یہ منتر جپتا ہے۔ یہ نوزائیدہ بچے کی پہلی اور مرنے والے کی آخری دعا ہے۔'

وہ اپنی کتاب the abode of Snow میں استنبول سے یارقند کے ایک سفیر کی لیہہ آمد سے متعلق لکھتا ہے۔'لداخ میں اس کی آمد کا بڑا چرچا ہے۔یوروپ میں اس نے بہت سامان خریدا تھا۔جہاں سے وہ یارقند روانہ ہوتا ہے۔'

رنبیر سنگھ نے اس کے سامان کی نقل وحمل کے لیے تین ہزار قلیوں کے فراہم کرنے کا حکم دیا تھا اور قلی اس بیگار سے اپنے آپ کو بچانے کے لیے کوشاں تھے۔

ولسن لکھتا ہے کہ لوگ بیگار سے سخت نالاں تھے۔

کاؤلے لمبرٹ (Cowley Lambert)

۱۸۷۴ء میں دو انگریز کاؤلے لمبرٹ اور لیڈے کرسری نگر سے ہوتے ہوئے لیہہ آئے۔ سسپول گاؤں میں کوتوال اور سپاہی نے ان کی خیمہ گاہ کی صفائی کرنے سے انکار کیا۔کاؤلے آپے سے باہر ہوا اور سزا دینے کے لیے ایک ڈنڈا کاٹا جس نے بقول کاؤلے صورت حال بدل دی جس کو کاؤلے کے ہم سفر لیڈے کرنے ایک پرانی نظم میں معمولی ردوبدل کے ساتھ یوں پیش کیا ہے۔لیڈے کر کاؤلے کو ڈینیل کہتا ہے:

ڈینیل نے ڈنڈا کاٹنا شروع کیا

ڈنڈا سپاہی کو ڈرانے لگا

سپاہی کوتوال کو دھمکی دینے لگا

اور کوتوال نے ایندھن وغیرہ لانا شروع کیا

گاؤں میں ایک کوتوال نمبردار کے ماتحت کام کرتا تھا۔عام طور پر لداخیوں کے ساتھ یوروپیوں کا برتاؤ اچھا ہوتا تھا۔وہ گھوڑوں کا کرایہ اور کھانے پینے کی چیزوں کی پوری قیمت ادا کرتے تھے۔شکایات مقامی اور غیر مقامی ملازموں سے تھی، جو لوگوں کو بڑے ہراساں کرتے تھے۔لیہہ کے

وزیر جانسن نے سال ۱۸۸۰ء کی سالانہ رپورٹ میں لکھا ہے کہ اس سال کے دوران کچھ پابندیوں کی وجہ سے صرف تین یوروپی سیاح لداخ وارد ہوئے جس سے مقامی لوگوں میں مایوسی پھیلی ہے۔ سیاحوں سے قلیوں، دُکان داروں، گھوڑے والوں اور ان گاؤں والوں کو مالی فائدہ تھا، جہاں سے سیاح گزرتے تھے۔

راستے میں کاؤلے لمبرٹ نے بہت سارے لداخیوں کو پریر وہیل گھماتے ہوئے دیکھا۔ وہ اپنا تاثر یوں بیان کرتا ہے: 'پریر وہیل مفید ایجاد ہے جسے بولتے، چلتے، کھاتے اور سواری میں استعمال کرتے ہوئے ثواب کمایا جاسکتا ہے۔'

اُن دنوں جانسن لداخ کا وزیر تھا۔ اس نے سیاحوں کے لیے لیہہ بازار میں پولو میچ کا اہتمام کیا جسے کاؤلے لمبرٹ اور یوروپیوں نے پسند کیا۔ بعد میں لوک ناچ دکھایا۔ کاؤلے کو یہ پسند نہیں آیا۔ وہ اپنا ردعمل یوں بیان کرتا ہے: 'بھلا اسے ناچ کیسے کہا جائے؟ میں سوچ بھی نہیں سکتا کہ یہ ناچ ہے۔ اسے مردے کے گرد لگایا ہوا چکر کہا جائے تو زیادہ موزوں رہے گا۔ مجھے یاد ہے کہ ہماری پارٹی کے ایک فرد نے تو یہ ناخوشگوار بات تک کہی کہ یہ رقاص جتنی جلدی مر جائیں، اتنا بہتر رہے گا۔'

مسز جے سی مورے اینسلے (Murray Aynsley)

اینسلے کی کتاب ۱۸۷۹ء میں چھپی ہے۔ ایسا لگتا ہے، وہ تین سال پہلے ستمبر میں لداخ آئی تھی۔ اس کا شوہر اس کے ساتھ تھا۔ لیہہ میں اُنھوں نے دسہرہ دیکھا، جو ڈوگروں کی دین تھا۔ تقریب کے آخری روز درگا کی مورتی دریا میں پھینکی گئی۔

اُنھوں نے ستورلوق کا تہوار بھی دیکھا۔ لداخ کے راجہ نے جلوس کی قیادت کی۔ برٹش جوائنٹ کمشنر تقریب میں موجود تھا۔ اس موقعے پر دُشمن اور بدی کی علامت ایک پتلے کو گولیوں کا نشانہ بنایا جاتا تھا۔ یہ تقریب راجگان لداخ کے زمانے میں منائی جاتی تھی۔ وزیر وزارت جانسن نے اس

پر گولیاں چلانے کی رسم شروع کی۔اس سے پہلے لامے مذہبی کتب کا وِرد کرتے ہیں۔ڈوگرہ دورِ حکومت میں تقریب کو نیا معنی ملا جب پتلا مہاراجہ کے دُشمن کی علامت تھا۔موجودہ جمہوری دور میں اس تقریب کو اور نیا مفہوم و معنی ملا ہے۔

اینسلے لکھتی ہے: 'لداخی عورتیں بالوں کی زیادہ چٹیائیں بناتی ہیں، جن کو کمر کے نیچے جوڑا جاتا ہے۔' اب بالوں کا یہ انداز Hairdo ختم ہوگیا ہے اور پونی ٹیل، بوبی کٹ وغیرہ مقبول ہیں۔

ہر سال اگست، ستمبر میں مشرقی ترکستان سے تجارتی کارواں لیہہ آتے تھے۔ پنجاب، اور کشمیر سے بھی تاجر لیہہ پہنچ جاتے اور مال کا تبادلہ یا خرید و فروخت ہوتی تھی۔تبت سے چنکپا اور بلتستان سے بلتی مختلف اوقات میں کاروبار اور تجارت کے لیے لیہہ آتے تھے۔ترکی کارواں کے ساتھ عازمین حج بھی ہوتے، جو کشمیر کے راستے حج بیت اللہ کے لیے جاتے تھے اور واپس بھی اکثر اسی راستے سے آتے تھے۔عازمین حج میں عورتیں اور بچے بھی ہوتے۔برٹش جوائنٹ کمشنران کا باقاعدہ ریکارڈ رکھتا تھا۔قارئین کی معلومات کے لیے سال ۱۸۷۶ء کا ریکارڈ یہاں پیش کیا جاتا ہے:

ترکی تاجر	۶۱۷	سواری کے گھوڑے	۱۸۰
تاجروں کے نوکر	۸۵۸	بار بردار گدھے	۵۷۰
بار بردار گھوڑے	۲۶۲۳	تبتی نمک لدے گھوڑے	۲۰۵
یاک	۳۷۲	عازمین حج	۷۲
بار بردار بھیڑیں اور بکریاں	۵۶۲۰	بچے اور عازمین حج عورتیں	۷اور۱۱
بار بردار قلی	۲۵۳	کل افراد	۱۱۶۵

آرکائیوز ریکارڈ کے مطابق لیہہ بازار میں داخلہ بلتی سرائے سے ہوتا تھا۔یہاں بہت بلتی نظر آتے تھے۔یہ جگہ آج بھی بالکھانگ کے نام سے جانی جاتی ہے جس کا مطلب بلتی گھر یا سرائے

ہے۔ بعد میں داخلہ کے راستے پر ایک پھاٹک لگایا گیا اور اس کے اوپر بنے کمرے میں ایک منشی آنے جانے والے تاجروں کے مال کا حساب کتاب رکھتا تھا۔

آرکائیوز ریکارڈ کے مطابق، جسے برٹش جوائنٹ کمشنر نے مرتب کیا ہے، مشرقی ترکستان سے ہر سال ۵۰۰ من چرس آتی تھی۔ ایک سیر چرس تین روپیے میں ملتی تھی۔ کچھ چرس لداخ میں استعمال ہوتی تھی۔ باقی پنجاب وغیرہ جاتی تھی۔ ہر سال چار ہزار من تمبا کو لداخ در آمد ہوتا تھا۔

لداخ کے راستے بڑی مقدار میں افیون مشرقی ترکستان جاتی تھی۔ چین سرکار کو اس پر بڑی تشویش تھی۔ ایک مرحلے پر اس کی درآمد پر پابندی لگادی گئی جب کہ پنجاب کے انتظامیہ کو لوگوں کے چرس کے روز افزوں استعمال پر فکر تھی اور اس کی درآمدات کی حوصلہ شکنی کے لیے بھاری محصولات لگادیئے۔

موراوین مشن کا قیام

۱۸۸۵ء میں لیہہ میں موراوین مشن قائم ہوا۔ مشن نے اپنے قیام کے ایک سال بعد لیہہ میں پہلا اسکول کھولا اور ۱۸۸۷ء میں لیہہ میں ایک ہسپتال قائم کیا۔ یہ لداخ میں پہلا ایلو پیتھک ہسپتال تھا۔ ڈاکٹر کارل مارکس اور فادر اڈولف ریڈسلوب موراوین مشن کے بانی تھے۔ اس سے پہلے پادری ہیڈے نے جرمنی سے دو تین کلو آلو اور کئی قسموں کی سبزیوں کے بیج لائے تھے اور لیہہ اور ہماچل پردیش میں کیلانگ میں ان کی پہلی دفعہ کاشت کی تھی۔ لداخ میں پہلے پہل آلو اور پھول گوبھی سے مشن نے متعارف کیا۔

ڈاکٹر کارل مارکس ہسپتال کو دیکھتے تھے اور فادر ریڈسلوب اسکول کے نگراں تھے۔ ڈاکٹر مارکس نے لداخ کی تاریخ ''گیالربس'' کے تین حصوں کا بودھی سے انگریزی میں ترجمہ کیا۔ فادر ریڈسلوب نے دو لداخیوں کے تعاون سے عہد نامہ عتیق کا لداخی میں ترجمہ کیا۔ ڈاکٹر کارل مارکس ٹائفس زدہ لداخی مریضوں کا علاج کرتے ہوئے خود اس مرض کے شکار ہوئے اور ۳۴ سال کی عمر میں ۱۸۹۱ء

میں چل بسے۔ ان کو اپنے نوزائیدہ بچے کے ساتھ دفنایا گیا۔ بچے کا جنم ایک روز پہلے ہوا تھا۔ کارل مارکس کی تدفین کے وقت ٹائفس سے فادر ریڈسلوب کی حالت بھی بڑی خراب تھی اور چند روز بعد ان کا بھی انتقال ہوا اور ڈاکٹر مارکس کے پہلو میں ان کو دفن کیا گیا۔ تب وہ ۵۴ برس کے تھے۔ مشن کے پادری اپنے ایثار اور خدمت خلق کے لیے لوگوں میں بڑے مقبول تھے۔ فادر ریڈسلوب کو لوگ 'کوشوق' (بڑے لاما) کہتے تھے۔ دونوں کی بیوائیں جرمنی واپس چلی گئیں۔

فادر ریڈسلوب اور ڈاکٹر مارکس سے پہلے مشن کے پادری ہنرک اگسٹ یشکے لداخ آئے تھے۔ اُنھوں نے ۱۸۷۵ء میں لیہہ کے پاس ایک گاؤں میں تین ماہ قیام کیا۔ ۱۸۸۱ء میں یشکے نے اپنی مشہور تصنیف تبتی۔ انگریزی ڈکشنری مکمل کی۔

موراوین مشن نے مختلف امور میں لداخیوں کی رہنمائی کی ہے۔ سردیوں میں زیرزمین سبزیاں محفوظ رکھنے کے طریقے سے لداخیوں کو روشناس کیا۔ لداخ کے فن تعمیر پر بھی مشن کا اثر ہے۔ مکانوں میں بڑی کھڑکیاں اور روشن دان بنانے کا رواج مشن نے ڈالا۔ جراب، دستانہ وغیرہ کی بنائی بھی مشن کے پادریوں نے سکھائی۔ دست کاریوں کا پہلا سینٹر لیہہ میں مشن نے کھولا۔ پہلے پہل لداخ میں گراموفون، پیٹرومیکس، کیمرہ، پریشر کوکر، سلائی مشین وغیرہ موراوین مشن ہی کی دین ہیں۔

موراوین مشن نے ۱۹۰۴ء میں 'لداخ گی اخبار' کے نام سے ایک اخبار کا اجرا کیا جس کے ایک حصے میں خبریں، دوسرے میں سلسلہ وار کہانی اور تیسرے حصے میں لداخی کہاوتیں چھپتی تھیں۔

مشن کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے لداخی زبان، ثقافت، تمدن اور تاریخ سے دُنیا کو آگاہ کیا۔ اس ضمن میں مشن کے پادریوں نے علمی اور تاریخی کتابیں لکھیں اور ترجمے کا کام کیا۔ وہ اہم تاریخی یادگاروں اور ثقافتی ورثہ کو منظر عام پر لائے۔ آئندہ صفحات میں مشن کے سرکردہ پادریوں کا تذکرہ ہوگا، جو وقتاً فوقتاً لداخ آئے اور لداخی تاریخ، ثقافت اور زندگی پر کتابیں لکھیں۔

لداخ کی مٹی میں مشن سمت متعدد یوروپی جذب ہوئے۔ لیہہ قصبہ میں دو مسیحی قبرستان ہیں۔ ایک قصبے کے بالائی حصے میں موراوین مشن اسکول کے پاس ہے۔ دوسرا قصبے کے جنوب میں

مسلمانوں کے قبرستان سے متصل ہے۔ بالائی قبرستان میں ۱۶ قبریں ہیں۔ جن میں ڈلگلیش اینڈ ریو کی قبر بھی ہے جس کو ایک افغان داؤد نے ۸ اپریل ۱۸۸۸ء کو قراقرم پر قتل کیا تھا۔ وہ ایک تاجر تھا اور لیہہ اور مشرقی ترکستان کے درمیان تجارت کے سلسلے میں سفر کرتا تھا۔ وہ ایک ایکسپلورر محقق بھی تھا اور لداخی اور ترکی زبانیں روانی سے بول سکتا تھا۔ فادر دانیال کیلٹی بھی یہاں مدفون ہے۔ اُنھوں نے لیہہ میں ایک اسکول کھولا تھا۔ ۲۳ اپریل ۱۸۸۹ء کو وہ لداخ کی بلندی اور سردی کی وجہ سے ۳۴ سال کی عمر میں فوت ہوئے۔ حالیہ سالوں میں قبروں میں اضافہ ہوا ہے۔ ستمبر ۱۹۸۶ء میں ایک ریٹائر فوجی افسر میجر جرنیل موریس بی ڈائی سے لداخ میں سیاحت پر آیا تھا۔ یہاں وہ بلندی سے پیدا ہونے والے امراض کا شکار ہوا۔ اس سے پہلے کہ ان کو بذریعہ ہوائی جہاز لیہہ سے باہر لے جایا جائے، وہ جانبر نہیں ہوئے۔ فوجی اعزازات کے ساتھ اس یوروپی قبرستان میں ان کی آخری رسومات سرانجام دی گئیں۔ ڈاکٹر مارکس، ریڈسلوب، ڈاکٹر شا اور متعدد یوروپی دوسرے قبرستان میں مدفون ہیں جہاں مقامی عیسائی آبادی کے متوفین دفن کیے جاتے ہیں۔

لداخ کے خلسے اور سورو گاؤں میں بھی یوروپی قبریں ہیں۔

جرمنی کے شہر ہرن ہٹ (Hernhut) میں لداخ سمیت مغربی ہمالیہ کی بودھ ثقافت کی چیزیں ایک عجائب گھر میں رکھی گئی ہیں۔ یہ چیزیں موراوین مشن کے پادریوں نے ۱۸۸۵ء میں مشن کے قیام کے بعد وقتاً فوقتاً وہاں محفوظ کرنے کے لیے بھیجی تھیں۔ ان میں نادر تصاویر، دستاویزات، گھریلو برتن، دستکاریوں کے نمونے، لباس، پاپوش، ٹوپیاں وغیرہ شامل ہیں۔

کپتان ایچ ایل رمزے

کپتان ایچ ایل رمزے ۱۸۸۵ء سے ۱۸۹۱ء تک لیہہ میں برٹش جوائنٹ کمشنر رہا۔ جوائنٹ کمشنر گرمیوں کے تین مہینوں یا اس سے کم مدت کے لیے لداخ آتا تھا۔ رمزے نے لداخی بول چال کی زبان پر ایک لغت مرتب کی ہے۔ اس کتاب میں اُنھوں نے لداخ کے رسم ورواج، لباس، عقائد، مالیہ، بیگار وغیرہ سے متعلق معلومات فراہم کی ہیں۔

رمزے کے زمانے میں لداخ میں لڑکا لگ بھگ ۱۴ سے ۲۰ سال اور لڑکی ۱۴ سے ۱۸ سال کے درمیان شادی کرتے تھے۔ بودھ اور ارغون دونوں میں شادی کے لیے یہی عمر مروج تھی۔ بودھوں میں سگائی سے پہلے رشتے کی موزونیت سے متعلق جیوتشی سے مشورہ لیا جاتا تھا۔ اگر قسمت اچھی نہ ہوتو سگائی نہیں ہوتی تھی۔

لڑکا نہ ہونے کی صورت میں بڑی بیٹی کے لیے خانہ داماد لایا جاتا تھا۔ اولاد نہ ہوتو ایک رشتہ دار لڑکی کو گود لیا جاتا تھا۔ تین سے زیادہ بیٹے ہوں تو باقی کسی گمپہ میں بھکشو بن جاتے تھے۔ رمزے کے زمانے میں کھاؤں (چھوٹا گھر) میں عمر رسیدہ ماں باپ کی الگ رہائش کی سماجی رسم پر پوری طرح عمل ہوتا تھا۔

لداخی مرد اور عورتیں پٹو کے پاجامے پہنتے تھے۔ بودھ عورتیں بچہ جننے تک سفید پٹو کے چوڑی دار پاجامہ پہنتی تھیں جب کہ آرغون عورتیں سفید پاجامہ شادی ہونے تک پہنتی تھیں۔ اس کے بعد سیاہ رنگ کا پاجامہ استعمال کرتی تھیں۔ ''سکنگ نام' لداخی زبان میں ''ٹانگ پٹو'' کا مطلب دیتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پاجامہ پٹو کا بنتا تھا۔ اب یہ لفظ بگڑ کر ''کانم'' ہوگیا ہے۔

رمزے لکھتا ہے۔ 'لداخیوں کو وقت کی اہمیت کا احساس نہیں ہے۔ وہ 'آدھا دن' جیسے الفاظ استعمال کر کے وقت بتاتے ہیں۔ تب لداخ میں گھڑی اور گھڑیال نہیں پہنچے تھے۔ کچھ لوگ وقت دیکھنے کے لیے پیتل کا برتن استعمال کرتے ہیں، جس کے اوپر ایک چھوٹا سا سوراخ بنا ہوتا ہے۔ کچھ لوگ ریت سے وقت کا تعین کرتے ہیں۔ لاموں کے پاس وقت معلوم کرنے کے لیے Hour Glass ہے۔'

تب لداخی برے اور اچھے شگون پر اعتقاد رکھتے تھے۔ ایک کتاب میں اچھے اور برے شگون کی علامتیں دی گئی ہیں۔ 'رمزے رقم طراز ہے:

'اگر شادی کے دن قوس قزح نظر آئے یا آسمان پر سرخی ہو تو یہ اچھا شگون مانا جاتا ہے۔ صبح تڑکے سب سے پہلے کسی معزز عمر رسیدہ آدمی سے آمنا سامنا ہو یا اس کا منہ دیکھے تو اچھا شگون

ہے۔ایک آدمی پانی، دودھ یا شراب لیے نظر آجائے تو یہ نیک شگون ہے۔مکان کے پاس صبح صبح چھکی بولے تو مہمان کی آمد یا خوش آئند خط ملنے کی نشانی ہے۔'

رمزے نے برے شگون کی متعدد علامتیں بتائی ہیں۔چیل یا چکور کا مکان کی چھت پر بیٹھنا، مکان کے اوپر اوپر سے کائیں کائیں کرنا، رات کو دور سے گیدڑ اور کتے کا بھونکنا، اُلو کا بولنا، گھوڑے کا ہنہنانا، کسی مکان میں آگ لگنا، پرندے کی بیٹ سر پر پڑنا، برے خواب نظر آنا، دلہا یا دُلہن کے سامنے گدھے کا دوڑنا یا ہانک لگانا، شادی کی ضیافت پر چھنگ کا ذائقہ کھٹا ہونا، کسی شخص کی پیالی کا الٹا گرنا اور شادی پر تیر ٹھونسے اناج کا اُلٹ پڑنا بدشگون مانے جاتے تھے۔

رمزے لکھتا ہے: 'لداخ وزارت میں ۱۳ کاردار ہیں۔کاردار کا کام مالیہ جمع کرنا، جرائم کی تحقیقات اور رپورٹ کرنا، بیگار کا حساب کتاب رکھنا اور مقامی امور کی نگرانی کرنا ہے۔کاردار کو بیگار معاف ہے۔اس کو اس کی جمع کردہ مالیہ کی رقم کا دو فیصد ملتا ہے، تاہم جنس میں کچھ نہیں ملتا۔

مالیہ سے سالانہ ۶۹ ہزار روپے کی آمدنی تھی۔اس رقم میں زمین سے ۴۵ ہزار روپے نقد، ۱۱ ہزار روپے کی مالیت کا جنس، روپشو کے سہاگہ سے ۸ ہزار روپے اور متفرق آمدنی تقریباً ۵ ہزار روپے تھی۔ کنپوں، ملازمین اور عام لوگوں سے مالیہ لیا جاتا تھا۔

بیگار بڑا سخت تھا۔لوگ مالیہ یا لگان کے خلاف شکایتیں نہیں کرتے تھے، جتنی بیگار کے خلاف کرتے تھے۔لکڑی چیلینگ گاؤں میں درختوں سے مفت میں یا بیگار کٹوائی جاتی تھی جہاں سے دریا میں نیموں تک لکڑی کی کڑیوں کو بہا دیا جاتا تھا اور نیموں سے اُنھیں لیہہ لائی جاتی تھیں۔لہاسہ جانے والا خیرسگالی تجارتی مشن لوپچق اور تبت سے لیہہ آنے والا چابا مشن کے لیے باربردار جانور مفت حاصل کیے جاتے تھے۔

آٹا گراٹ میں مفت پسوایا جاتا تھا۔بیگار میں کبھی کبھی ہر گھر سے ایک آدمی کسی کام کے لیے بلایا جاتا تھا اور اس کا کوئی معاوضہ نہیں دیا جاتا تھا۔اس سلسلے میں بازار میں منادی ہوتی تھی۔بیگار کے اس کام کو ''ہالا'' کہا جاتا تھا۔

۱۸۸۵ء میں حکام نے زمین پر فاضل مالیہ عائد کرنے کے بدلے بیگار معاف کرنے کا منصوبہ کیا لیکن گنپوں کی مخالفت کی وجہ سے یہ منصوبہ ناکام ہوا۔ گنپوں کے پاس بڑی آراضی تھی اور بیگار معاف تھا۔

برٹش جوائنٹ کمشنر کو غیر لداخیوں کے معاملات میں دیوانی اور فوج داری مقدمات چلانے کے اختیارات حاصل تھے۔

لیہہ کے قلعہ میں باقاعدہ فوج ۵۰ تھی۔ اس کے علاوہ ۷۰ لداخی سپاہی تھے۔ خطے کے دوسرے قلعوں میں ۶ یا ۸ پہرہ دار تھے۔ اُن ہی دنوں چھشوت کے قلعہ کو گرالیا گیا تھا۔

کسان کبھی چند مویشی برائے ثواب گنپوں کی نذر کرتے تھے جو گنپوں کی آراضی پر چرائے جاتے اور مرتے دم تک ان سے کوئی کام نہیں لیا جاتا تھا۔

رمزے نے لداخ میں غلاموں کے تین زمروں کا تذکرہ کیا ہے۔ ان میں ایک زمرہ مغربی تبت سے تعلق رکھتا تھا۔ ان کو ان کے ماں باپ نے کمسنی میں لداخیوں کو فروخت کیا تھا۔ لداخ کے وزیر جانسن نے ۱۸۷۳ء کے آس پاس ان غلاموں کو رہا کرنے کا حکم دیا اور مزید ایسے بچوں کی بردہ فروشی ممنوع قرار دی۔ ان میں اکثر مغربی تبت واپس چلے گئے۔ چند لداخ میں رہے۔

غلاموں کا ایک زمرہ ڈوگرہ سپاہیوں کی اولاد تھی جنھیں غلام زادہ کہا جاتا تھا۔ سرکار ان کی کچھ مدد کرتی تھی۔ ۱۸۶۸ء میں ان سے کھیتی باڑی کا کام لینے کی کوشش کی گئی لیکن اناڑی پن اور سرمایہ نہ ہونے کی وجہ سے یہ منصوبہ کامیاب نہیں ہوا۔ اس کے سات سال بعد ۱۸۷۵ء میں انگریز وزیر وزارت فریڈرک ڈریو نے مہاراجہ سے اجازت حاصل کر کے ان کو آزاد کیا۔ تب سے یہ مقامی آبادی میں جذب ہوئے۔

تیسرا گروہ سرکاری مقروض تھا یا یہ اس گروہ کی اولاد تھی۔ ان کو باقیدار کہا جاتا تھا۔

رمزے کے مطابق لداخی چیچک کے انسداد کے لیے ٹیکہ پر اعتقاد نہیں رکھتے تھے بلکہ چیچک زدہ ایک آدمی کے زخم یا پھوڑا اسے کھرنڈ لے کر اس کو سکھاتے اور تھوڑا سا سفوف پانی میں گھول کر پلاتے تھے یا کبھی جلد کو تھوڑی سی چھیل کر تھوڑا سا سفوف اس پر ڈالا جاتا تھا۔

چیچک زدہ مریض کو چند دنوں کے لیے خوراک اور پانی کے ساتھ الگ تھلگ رکھا جاتا تھا۔اس میں شفایابی کے امکان تھے۔

رمزے کا مشاہدہ ہے: 'لداخی مرد چارزانو بیٹھتے ہیں۔عورتوں کے لیے چارزانو بیٹھنا موزوں نہیں سمجھا جاتا۔وہ ایک زانو بیٹھتی ہیں اور ترکی دوزانو بیٹھتے ہیں۔' آج بیٹھنے کے انداز اور دوسرے لوازمات پر کوئی دھیان نہیں دیتا اور نہ سماج اُنھیں لازم قرار دیتا ہے۔

رمزے لکھتا ہے۔'لداخی عمومی طور پر میل سے انجان ہیں البتہ اُنھیں کوس کا علم ہے۔ایک کوس لگ بھگ ڈیڑھ میل کا ہے۔'

میلا دسموچھے کے تہوار کے دنوں میں لداخی راجہ کی مصروفیات سے متعلق وہ رقم طراز ہے۔ دسموچھے کے موقعے پر راجہ لیہہ کی اپنی قیام گاہ میں سکونت کرتا تھا۔تب وہ لاما، رقاص، گھوڑسواروں اور گویوں میں گھرا رہتا تھا۔پانچ روز پوجا، رقص وسرود، گھوڑ دوڑ اور دعوتوں میں گزرتا۔لوسر یا سال نو کے تہوار پر بھی پانچ روز ایسے ہی گزارتا۔ایسے میں راجہ کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔

لوگ میلوں تماشوں کے بڑے شوقین تھے۔رمزے لکھتا ہے کہ راستہ دُشوار گزار اور دورافتادہ ہونے کے باوجود لوگ ان دنوں زنسکار، چانگ تھانگ وغیرہ سے ہمس میلہ دیکھنے آتے تھے۔

نکولس نوٹوویچ

۱۸۸۷ء میں روسی نژاد کے ایک قلم کار نکولس نوٹوویچ نے اس اعلان سے ہنگامہ پیدا کیا کہ اس نے لداخ کے ہمس گنپہ میں ایک پرانا صحیفہ دیکھا، جس میں ہندوستان اور تبت میں حضرت عیسیٰ کی آمد کا تذکرہ ہے۔جب اس کی کتاب The unknown life of Jesus Christ فرانسیسی زبان میں چھپی تو ساری دُنیا میں سنسنی پھیلی۔جلد ہی کتاب کا کئی زبانوں میں ترجمہ ہوا۔لیہہ میں مشن کے پادریوں نے ہمس گنپہ کے انتظامیہ سے رابطہ قائم کیا جس نے نوٹوویچ کے بیان کو سراسر غلط قرار دیا۔آگرہ کالج سے پروفیسر ڈوگلس تصدیق کے لیے لداخ آئے۔ان کو بھی یہی جواب

ملا اور نوٹووچ کے بیان کو ایک شوشہ قرار دیا گیا۔ یہ بات ہمیشہ کے لیے ختم ہوگئی ہوتی، اگر رام کرشنا مشن کے نائب صدر سوامی ابھیدا انندا نے یہ بیان نہ دیا ہوتا کہ اُنھوں نے بھی یہ صحیفہ ۱۹۲۲ء میں ہمس گنپہ میں دیکھا۔ سوامی کو ایک لامانے صحیفہ دکھاتے ہوئے کہا کہ یہ اصل کاپی سے تبتی میں ترجمہ کیا ہوا نسخہ ہے۔ اصل کاپی جو پالی زبان میں ہے، لہاسہ کے ماربو آ گنپہ میں ہے۔ نوٹووچ اور ابھیدا انندا دونوں نے صحیفہ ہذا کا ترجمہ کیا ہے اور نفس مضمون میں زیادہ فرق نہیں ہے۔ اس میں حضرت عیسیٰ کے پند و نصائح ہیں جو حضرت عیسیٰ نے ہندوستان میں لوگوں کو دیا۔ ۱۹۳۹ء میں دو سر کردہ خواتین الزبتھ کاسپری اور مادر گلوریا نے تصدیق کی کہ ایک ایسا صحیفہ ہمس گنپہ میں موجود ہے۔ ایک لامانے اپنے ہاتھ میں لے کر یہ صحیفہ اُنھیں دکھایا اور یہ بھی کہا کہ حضرت عیسیٰ ہمس بھی آئے تھے۔ الزبتھ کاسپری منٹسوری اسکول کی بانیوں میں تھی اور مادر گلوریا ورلڈ فیلوشپ آف faith کی صدر تھی۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ اس کے بعد جب بھی موراوین مشن کے پادریوں نے مذکورہ صحیفہ سے متعلق پوچھا تو گنپہ کے انتظامیہ نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ البتہ بعد میں سوامی ابھیدا انندا کے ایک چیلے کو بتایا کہ ایسا صحیفہ پہلے موجود تھا لیکن اب نہیں ہے۔ تردید اور تصدیق کا یہ سلسلہ اب ختم ہوگیا ہے لیکن بہتوں کو مخمصے میں ڈال گیا ہے۔ چنانچہ آج بھی کئی یوروپی صحیفہ کی تلاش میں ہمس گنپہ کا چکر لگاتے ہیں۔ حالیہ سالوں میں اس پر کتابیں لکھی گئی ہیں اور فلمیں بنی ہیں۔

فادر ڈینیل کیلٹی

فادر ڈینیل کیلٹی ۱۸۸۸ء میں مل ہل مشن کی طرف سے لیہہ آئے۔ اُنھوں نے اپنے مشن کا نام سینٹ پیٹر مشن رکھا۔ وہ رومن کیتھولک تھے۔ ڈینیل کیلٹی نے آتے ہی لداخی زبان سیکھنے کی طرف خاص توجہ دی۔ اسی دوران اپنی رہائش کے لیے سرکاری خرچ پر ۳ کمروں پر مشتمل ایک مکان تعمیر کرایا۔ کیلٹی چند بچوں کو پڑھانے لگے۔ اُنھوں نے لداخی میں ایک لغت بھی مرتب کی۔ ناسازگار آب و ہوا، لداخ کی بلندی اور محنت نے ان کی صحت پر برا اثر ڈالا اور وہ ۲۳ اپریل ۱۸۸۹ء

کو عین جوانی میں چل بسے۔ تب سے زمانہ حال تک کئی کیتھولک مشنریاں لداخ آئیں۔ آج کل سینٹ پیٹر کے نام سے مشن ایک اسکول چلا رہا ہے اور لیہہ ہوائی اڈے کے پاس ایک کلیسا تعمیر کیا گیا ہے۔

ینگ ہاسبنڈ

ینگ ہاسبنڈ کو پہلے پہل روس کی پیش قدمی کا جائزہ لینے کے لیے لداخ بھیجا۔ تب وہ فوج میں لیفٹیننٹ تھا۔ ۳۱ جولائی ۱۸۸۹ء کو وہ لیہہ پہنچا۔ لیہہ میں موسیٰ اور ساقی نام کے دو کرغیز روس کے خلاف مدد مانگنے آئے تھے۔ ینگ ہاسبنڈ نے لیہہ سے ۷ اسپاہی اپنے ساتھ لیے۔ وہ لکھتا ہے: 'لداخ ضلع میں تعینات سپاہیوں کی حالت خستہ ہے۔ اُنھیں کم تنخواہ، کم کپڑے اور کم کھانا ملتے ہیں۔' نوبراہ میں ینگ ہاسبنڈ نے روس کی ایک پارٹی کی یارقند آمد سے متعلق سنا جس کی منزل شہیدولا تھی۔ وہ اسے پہلے شہیدولا پہنچنا چاہتا تھا۔

اس سے پہلے ینگ ہاسبنڈ نے لیہہ میں کرغیزوں کے سامنے چاند ماری کا مظاہرہ کیا۔

ینگ ہاسبنڈ بعد میں کئی مرتبہ لداخ آیا۔ وہ لداخی قلیوں اور دوسرے ملازمین میں بڑا مقبول تھا۔ ایک ملازم شکور علی اس کا چہیتا تھا۔ اپنی کتاب 'کشمیر' میں اس نے شکور علی کا خصوصی طور پر ذکر کیا اور اس کی تصویر شائع کی ہے۔ شکور علیؒ نے ٹرانس ہمالیائی خطے میں اس کے ساتھ تین مرتبہ سفر کیا ہے اور ایک دفعہ اس کی جان بچائی تھی۔ کرنل ینگ ہاسبنڈ جب کشمیر میں ریزیڈنٹ بنا تو شکور علی اس سے ملنے آیا اور کئی ہفتے اس کے ساتھ رہا۔ اس کا بیگار معاف کرانے کے لیے مہاراجہ سے سفارش کی۔ مہاراجہ نے خود اس حکم نامے پر دستخط کیا اور ریزیڈنسی کی گارڈن پارٹی میں یہ حکم نامہ اس کو دیا۔ دوسرے روز دربار میں اس کو اعزازی شال پیش کیا۔

ینگ ہاسبنڈ نے خطے میں اپنی مہمات سے متعلق کئی کتابیں لکھی ہیں۔ مہم میں شریک لداخی ملازمین کا ذکر کرتا ہوا وہ لکھتا ہے: 'یہ افراد مہم جوئی کے اتنے ہی دلدادہ ہیں، جتنے ان کے

Employers مالکان ہیں'۔

ایک جگہ وہ لکھتا ہے کہ شکار کے لائسنسوں سے ریاستی سرکار کو سالانہ ۲۵ ہزار روپیے کی آمدنی ہے۔ کسی کسی سال سینکڑوں شکاری لداخ اور بلتستان آتے ہیں۔ شکاریوں کے لیے بنائے گئے قواعد اور ضوابط ہر سال شائع کیے جاتے ہیں۔

گزیٹر آف کشمیر اینڈ لداخ

انگریز ریزیڈنٹ کی پہل پر ۱۸۷۵ء میں لیہہ میں ایک ڈاک خانہ کھولا گیا۔ کشمیر اور لداخ گزیٹر مرتبہ ۱۸۹۰ء کے مطابق رسل و رسائل کے لیے سونمرگ سے لیہہ تک ۳۲ منزلیں مقرر کیں سردیوں میں سونمرگ سے مٹائن تک مزید ۱۶ ہرکارے تعینات کیے جاتے تھے۔ گرمیوں میں سری نگر سے لیہہ ڈاک پہنچنے میں سات روز لگتے تھے جب کہ سردیوں میں پندرہ یا اس سے زیادہ دن لگتے تھے۔ زیادہ تر خطوط ملازموں، یوروپیوں اور چند تاجروں کے ہوتے تھے۔

۱۸۸۸ء میں لداخ کا وزیر پنڈت رادھا کشن تھا۔ قصبے میں ۴۰۰ مکانات تھے اور بازار میں دُکانوں کی تعداد ۱۳۰ تھی، جس میں ۵۰ دُکانیں سارے سال کھلی رہتی تھیں۔ باقی دُکانیں جولائی سے ستمبر تک کھولی جاتی تھیں۔

گزیٹر کے مطابق ان دنوں لیہہ اور نوبرا میں آباد صرف مسلمان مرغیاں رکھتے تھے۔ لداخ میں کاغذ ایک پودا Astrogabes Strictus کی جڑوں سے بنایا جاتا تھا۔

لیہہ میں ان دنوں ۲۰۰ فوجی اور ۴ توپیں تھیں۔ زنسکار اور دراس میں تیس تیس سپاہی اور دو دو توپیں تھیں۔ ڈوگرہ انتظامیہ نے لیہہ اور دیہات میں تقریباً سو ملیشیا رکھے تھے۔ ان دنوں ایک فوجی جمعدار کی تنخواہ ۶ روپیے ۴ آنے تھی۔ حولدار کی ۴ روپیے ۶ آنے، نشانچی کی ۴ روپیے ۴ آنے اور ایک سپاہی کی ۴ روپیے ۱ آنہ تھی۔

راجہ امر سنگھ کی رانی کے انتقال پر ۳۰ ستمبر ۱۸۸۸ء کو لیہہ کے وزیر وزارت پنڈت رادھا کشن

کے حکم پر لیہہ میں دُکانیں بند رہیں۔ برٹش جوائنٹ کمشنر ایچ ایل رمزے نے اس پر اعتراض کیا کہ یہ تجارتی سرگرمیوں میں مداخلت کے مترادف ہے اور ۱۸۷۰ء کے تجارتی معاہدے کی خلاف ورزی ہے۔ رمزے کا یہ بھی کہنا تھا کہ لیہہ ایک آزاد قصبہ ہے۔

عموماً ستمبر میں لیہہ میں کارواں آتے ہیں۔ وزیر نے جواب دیا کہ دُکانیں بند کرانے کا اختیار وزیر وزارت کو ہے۔ شاہی خاندان کے کسی فرد کے مرنے پر سوگ میں دُکانیں بند کی جاتی ہیں۔ آج تک کسی برٹش جوائنٹ کمشنر نے اس پر اعتراض نہیں کیا۔ وزیر نے مزید لکھا کہ ۱۸۷۰ء کے تجارتی معاہدے کے تحت مہاراجہ نے کچھ مراعات دینا مان لیا تھا۔ لیکن ریاست کے اقتدارِ اعلیٰ سے مہاراجہ دستبردار نہیں ہوا ہے۔

رمزے نے شاہی لفظ استعمال کرنے پر سخت اعتراض کیا اور کہا کہ اس کے لیے صحیح لفظ Ruling Family ہے۔ وزیر رادھا کشن نے لکھا کہ آئندہ وہ Royal کا لفظ استعمال نہیں کرے گا۔

ازبیلا برڈ بشپ (Isbella B. Bishop)

۱۸۹۱ء کے آس پاس ازبیلا بشپ لداخ آئی۔ تب وہ لگ بھگ ساٹھ کے پیٹے میں تھی۔ تعلیم اور صحت میں موراوین مشن کی سماجی خدمات لوگوں میں آہستہ آہستہ مقبولیت حاصل کر رہی تھیں۔ ازبیلا سری نگر سے آئی تھی جب لیہہ تک ۱۵،۱۶ دن کا سفر تھا۔ وہ روز صبح چھ بجے اُٹھتی تھی۔ ایک قلی کو چھوٹا سا خیمہ اور لنچ کی ٹوکری کے ساتھ پہلے روانہ کرتی تھی۔ خود سات بجے نکلتی۔ راستے میں خیمے میں دو گھنٹے آرام کرتی تھی۔ سفر کے اختتام پر چائے پیتی اور دو گھنٹے بعد ڈنر کرتی تھی۔ جب وہ لیہہ پہنچی تو چند ہی دُکانیں کھلی تھیں۔ کارواں پہنچنے والے تھے۔ اس سے پہلے قصبے کی آبادی تقریباً دوگنی ہو گئی۔ لداخ آنے والے گوناگوں لوگوں میں منے پا (مذہبی تفریحی منڈلی)، آچے لہامو (کلچرل منڈلی)، درویش، فقیر، عازمین حج وغیرہ شامل تھے۔ ترکی کارواں پہنچنے پر لیہہ کے پر رونق بازار میں لہاسہ، امرتسر، کابل اور بخارا کے تاجروں سے چہل پہل آئی۔ دوسرے بہت سارے سیاحوں کی طرح وہ لداخیوں

کو تبتی کہتی ہے۔ ایک خاتون لیڈی میڈل ٹون کو وہ لکھتی ہے: 'میں تبتیوں کو بہت پسند کرتی ہوں'۔

اپنی کتاب مطبوعہ ۱۹۰۴ء بعنوان Among the Tibetans میں وہ لکھتی ہے: 'نوبراہ میں ہندر گاؤں کے لوگوں نے مجھ سے پوچھا۔ یوروپی عورت ہمیشہ کیوں لکھتی اور سینے پرونے کا کام کرتی رہتی ہے؟ کیا وہ بہت غریب ہے یا اس نے لکھنے اور سینے پرونے کا کام کرنے کے لیے حلف اُٹھا رکھا ہے؟'

از بیلا کے مطابق لیہہ میں لوگ وزیر کے حکم کے باوجود اپنے بچوں کو موراوین اسکول نہیں بھیجتے تھے۔ پادری ریڈسلوب اور ڈاکٹر کارل مارکس والدین سے ملے اور اُنھیں ترغیب دی کہ وہ بچوں کو اسکول بھیجیں۔ اس کا اچھا نتیجہ نکلا۔

از بیلا لکھتی ہے، مشن کے اسپتال اور ڈسپنسری میں سردیوں میں اوسطاً سو مریض آتے ہیں۔ گرمیوں میں مریضوں کی تعداد بہت زیادہ ہوتی ہے۔ لداخی عورتوں سے متعلق وہ رقم طراز ہے: 'لداخی عورتیں ساٹھ پونڈ وزن کا بوجھ اُٹھا کر دروں کو پار کرتی ہیں۔ ان کی عمر لمبی ہوتی ہے۔'

نہانے دھونے میں لداخیوں کی سستی اور خامی کا ذکر کرتی ہوئی وہ لکھتی ہے: 'لداخی سال میں ایک دفعہ نہاتے ہیں۔ تہواروں کے بغیر شاذ ہی کپڑے بدلتے ہیں۔'

فادر ریڈسلوب کے ساتھ وہ نوبراہ جاتی ہے۔ واپسی پر دریائے شایوک عبور کرتی ہوئی وہ گھوڑے سے گر جاتی ہے اور بال بال جان بچتی ہے، لیکن سینے کی ایک ہڈی ٹوٹ جاتی ہے۔ اس حادثے کے باوجود ذوق سیاحت اس کو ۱۳ ہزار فٹ سے زیادہ بلند گاؤں روپشو لے جاتا ہے جہاں اس نے خانہ بدوش چنگپاؤں کے ساتھ تین راتیں گزاریں۔

از بیلا بشپ کو لیہہ کے خوبصورت آسمان، رنگ اور ثقافت سے لگاؤ کی وجہ سے لداخ سے واپس جانے کا دُکھ تھا۔

ایک امریکی دانیال جے بورسٹین (D.J. Boorstin) نے ۱۹۶۰ء میں از بیلا سے متعلق لکھا ہے: 'کسی بھی دور یا ملک میں کسی اور عورت کا پانا مشکل ہے، جس نے اتنا لمبا سفر کیا ہو، اتنا زیادہ

دیکھا ہو اور جو دیکھا اس کا ایسا اثر پذیر ریکارڈ چھوڑا ہو۔'

ہملٹن بوور (Hamilton Bower)

ہملٹن بوور ۱۸۸۹ء میں مشرقی ترکستان میں شکار کھیلنے جانے کے لیے لیہہ آیا تھا۔ بوور کو ایک افغان داؤد محمد کی گرفتاری کا فریضہ سونپا گیا۔ داؤد نے جیسا کہ اوپر آیا ہے، قراقرم درہ پر انڈریوڈ لگلیش کو قتل کیا تھا۔ لیہہ کا ایک شخص شمس الدین داؤد محمد کو جانتا تھا۔ بوور نے اس کو اپنے ساتھ لیا۔ ایک سال پیچھا کرنے کے بعد بوور اور شمس الدین مفرور مجرم کو سمرقند میں گرفتار کرنے میں کامیاب ہوئے۔ شمس الدین کی کارکردگی کے لیے لیہہ میں ایک تقریب میں جوائنٹ کمشنر ایچ ایل رمزے نے اس کو تین ہزار روپے انعام اور سند دی اور مناسب ملازمت دلانے کے لیے ڈوگرہ حکومت کو سفارش کی۔

ہملٹن بوور ۱۸۹۱ء میں لیہہ سے خفیہ سفر پر تبت روانہ ہوا۔ لداخیوں کو اپنے ساتھ کام پر لیتے ہوئے بوور نے ان کو یہ ہدایت دی کہ وہ یہ نہ پوچھے کہ کہاں جا رہے ہیں۔ تاہم لیہہ آئے ہوئے تبتیوں کو پتہ چلا کہ بوور کی منزل لہاسہ ہے۔ بوور کے ساتھ چھ آرغون تھے۔ سفر میں بوور اور انگریز ڈاکٹر نے اپنا بھیس بدل کر لداخی لباس پہنا تا کہ لوگ اُنھیں نہ پہچانیں۔ تبت میں جگہ جگہ ان سے پوچھا گیا کہ پارٹی میں کوئی یوروپی تو نہیں۔ اُنھوں نے اس کا جواب نفی میں دیا۔

دوسرے بہت سارے یوروپیوں کی طرح آخر کار بوور کو پہچان لیا گیا اور وہ لہاسہ نہیں پہنچ سکا۔

ای ایف نائٹ (Knight)

مئی ۱۸۹۱ء میں ایک اور انگریز ای ایف نائٹ لداخ آیا۔ اس کی کتاب Where Three Empires meet اس زمانے کے بلتستان اور لداخ پر ایک دلچسپ معلوماتی تصنیف ہے۔ نائٹ نے بیان کیا ہے کہ بندوبست افسر کی اصلاحات کی وجہ سے سیاحوں اور نجی طور پر سفر کرنے والوں کے لیے گھوڑے کا کرایہ اور رسد کے دام میں اضافہ کیا گیا تھا۔ خود غرض اور دھوکے باز مسافر ان احکام

سے بچنے اور کم روپیہ خرچ کرنے کے لیے جعلی کاغذات سے کام لیتے تھے۔ ایک ملازم کے پاس بہت سارے کاغذات تھے۔ اس نے ای ایف نائٹ کو ایک چٹ دکھائی جس پر کس فوجی کپتان نے لکھا تھا: 'یہ آدمی سب سے بڑا چور اور بدمعاش ہے۔ ایسے لوگوں سے مجھے شاذ ہی پالا پڑا ہے۔' نائٹ لکھتا ہے۔ 'زوجی لا پر لداخی قلی برف سے اپنی آنکھوں کو محفوظ رکھنے کے لیے مقامی طور پر بنی عینک استعمال کرنے لگے جس کی کمانی لکڑی کی بنی تھی اور رنگین شیشے کی جگہ گھوڑے کے بال بروئے کار لائے گئے تھے'

زوجی درے کے بعد دوسری اہم منزل کرگل تھی۔ بقول نائٹ 'لداخ کے لوگ وادی کرگل کو دُنیا میں زرخیز ترین علاقہ سمجھتے ہیں'

نائٹ نے دیکھا، سیاحوں کا روایتی طور پر استقبال کیا جاتا تھا۔ اس سلسلے میں عموماً عورتیں برتنوں اور تھالیوں میں خشک پھل، آٹا، دودھ، لسی، دہی وغیرہ لے کر سیاحوں کی راہ میں راستے کے کنارے کھڑی ہوتی تھیں۔ ایک غریب آدمی گلدستہ پیش کرتا تھا۔

مصنف نے لیہہ بازار میں بچوں کو کرکٹ کی قسم کا کھیل کھیلتے دیکھا۔ وہ بلے کی جگہ پولو کی اسٹک استعمال کرتے تھے اور گیند لکڑی کی بنی تھی، جو پولو میں مین استعمال ہوتی تھی۔

نائٹ نے مشاہدہ کیا کہ لداخ کے پالتو جانور چھوٹے ہیں۔ اس کے برعکس جنگلی جانور بڑے ہیں۔ غیر ملکیوں کو جانوروں میں لداخ کی بکری سب سے زیادہ خوبصورت لگتی ہے۔

نائٹ نے دیکھا لیہہ اور آس پاس کے دیہات میں رات کو چوکیدار گشت کرتے تھے۔ پولو میں ان دنوں چھشوت کے کھلاڑی اچھے سمجھے جاتے تھے۔

نائٹ کی آمد سے چند سال پہلے گیہوں کے ٹیکس میں اضافہ کرنے کی تجویز کی گئی تھی۔ اس کا سخت ردِّعمل ہوا تھا اور لوگوں نے احتجاجی مظاہرے کیے تھے۔

برٹش جوائنٹ کمشنر ترکی تاجروں اور مقامی لوگوں کے مابین جھگڑوں اور تنازعوں کی ثالثی کرتا تھا اور فیصلہ صادر کرتا تھا۔

نائٹ نے رومی کلیسا اور لاموں کی مذہبی رسومات میں بڑی یکسانیت دیکھی۔ مصنف کے مطابق ان دنوں مسلمان عورتیں اپنی ٹوپی پر سکے اور سنگار پٹیاں سجاتی تھیں۔ غالباً یہ علاقہ کرگل کی عورتیں ہوں گی جو ماضی قریب تک سیجلی ٹوپیاں پہنتی تھیں۔

ان دنوں لیہہ بازار میں افواہ گرم تھی کہ روس نے افغانستان پر فوج کشی کی ہے۔ گلگت کے پاس کشمیر کے علاقے پر Kanjutis کے حملے کی خبر بھی گرم تھی جس سے گلگت میں تعینات انگریز ایجنٹ کرنل ڈورانڈ نپٹ رہا ہے۔

اُن دنوں سامان کی نقل وحمل کے لیے بھی لوگوں کو زبردستی پکڑ کر بیگار پر گلگت لیا جاتا تھا۔ لوگ اس سے بڑے ڈرتے تھے۔ نائٹ نے اس کا ذکر کیا ہے۔ پچھلی خزاں میں گاندربل کے پاس سپاہیوں نے بہت سارے لداخیوں کو گھات لگا کر پکڑا تھا اور گلگت بیگار پر لے گئے تھے۔

نائٹ نے لکھا ہے۔ 'کشمیر واپسی پر ہر پڑاؤ پر بچے گلدستہ لے کر پہنچتے اور مصنف کو پیش کرتے تھے'۔

ایف گرینارڈ

فرانس سرکار نے ۱۸۹۱ء میں ایک سائنسی مشن کو M Dutreuil De Rhins کی سرکردگی میں تبت بھیجا تھا۔ مہم کے ممبران ۱۹ فروری کو پیرس سے روانہ ہوئے M Dutreuil اس مہم میں تبتیوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ ایک لداخی محمد عیسیٰ کاروان لیڈر تھا۔ مصنف ایف گرینارڈ مہم کا ایک رکن تھا۔ مہم کے ارکان روسی ترکستان سے چینی (مشرقی) ترکستان پہنچے جہاں یہ لداخ کے لیے روانہ ہوئے۔ لداخ کے سرحدی گاؤں سے اُنھوں نے برٹش جوائنٹ کمشنر سے لداخ میں داخلہ کی اجازت کے لیے درخواست کی۔ اجازت ملنے پر وہ لوکھونگ سے ٹانکچے پہنچے۔ تب ٹانکچے میں ۱۲ اور ۱۵ کے درمیان مکانات تھے۔ ڈوگرہ حکومت نے گاؤں میں بید کے درخت لگائے تھے۔ مصنف کے مطابق لداخی شجرکاری کو غیر ضروری سمجھتے ہیں۔ وہ اپنے آباواجداد کی رسومات پر مطمئن ہیں۔ جو کے چند خوشوں اور گھاس کے گچھوں پر قانع اور مطمئن ہیں۔

۱۲ اکتوبر ۱۸۹۱ء کو وہ لیہہ پہنچے۔ گرینارڈ کا مشاہدہ ہے: 'کاشغر اور ختن کے دلالی قصبے کے مقابلے میں لیہہ میں مکانات زیادہ شاندار اور متناسب ہیں۔ ان میں گیلریاں، ہموار اور چپٹی چھتیں ہیں۔ لیہہ سے وہ واپس مشرقی ترکستان روانہ ہوئے۔

لارڈ ڈنمور

اگلے سال راستہ کھلنے پر انگریز افسر لارڈ ایرل آف ڈنمور روسی فوج کی سرگرمیوں اور نقل و حرکت کا جائزہ لینے کے لیے کشمیر سے لداخ روانہ ہوا۔ ۱۰ مئی ۱۸۹۲ء کو وہ بالتال پہنچا جہاں دراس کے تھانیدار نے ڈنمور کو پانچ روپیہ کا نذرانہ پیش کیا جسے چھو کر واپس کیا جاتا تھا۔ اس رسم کو 'دالی' کہا جاتا تھا اور یہ بڑے آدمیوں کے لیے مخصوص تھی۔ ڈنمور نے پانچ روپیے کو چھوا اور واپس لینے کے لیے اشارہ کیا۔ انجان آدمی اسے اٹھالیتا تھا۔ ڈنمور لکھتا ہے۔ ہندوستان میں اس رسم کو Touch and Remit کہا جاتا ہے۔

گاؤں میں لوگ آٹا، چاول، سوکھی خوبانی، اخروٹ وغیرہ کی شکل میں دالی پیش کرتے، جن میں کچھ مٹھی میں لے کر واپس کیے جاتے تھے۔

دراس سے پہلے پن دراس کو دیکھ کر ڈینمور کو Western Isle of Scotland میں اپنا گھر یاد آیا۔ پہاڑیاں، چٹانیں، گھاس، ٹٹو سبھی وہاں کے مناظر پیش کر رہے تھے۔

خربو کے پاس وزیر کی طرف سے ایک لداخی اسکالر مشن چھرنگ سپلکیس اور دو آدمیوں نے ڈنمور کا خیر مقدم کیا۔ منشی سپلکیس کئی زبانیں جانتا تھا اور لداخ کی تاریخ پر نظر تھی۔

ڈنمور نے اپنی کتاب The Pamir میں لکھا ہے: 'لیہہ کی آبادی موسم سرما میں تین ہزار رہتی ہے اور گرما میں چار ہزار تک پہنچتی ہے۔ لیہہ بازار کے دونوں طرف سفیدہ کے درخت ہیں۔'

ڈنمور رقم طراز ہے: 'لداخی لداخ کو دُنیا کی ناف کہتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ لداخ دُنیا کے مرکز میں ہے۔'

لداخی بودھوں کے عقیدے کا ذکر کرتا ہوا وہ لکھتا ہے: 'اگر ایک تاجر کو لداخ سے لمبے سفر پر یارقند یا کاشغر جانا ہوتا اور وہ اپنی حفاظت اور مال کی فروخت میں اچھا منافع چاہتا ہے تو وہ اپنے علاقے کے لاما کے پاس جاتا ہے۔ اس سے منتر تراشی ہوئی پتھر کی ایک سل خریدتا ہے۔ اسے احترام سے منے دیوار پر رکھتا ہے اور اس پورے اعتماد کے ساتھ سفر پر روانہ ہوتا ہے کہ اس کی خواہش پوری ہوگی۔ اچھی فصل کے لیے بھی ایسی سل خرید کر منے دیوار پر رکھی جاتی ہے۔ اسی طرح بے اولاد والدین اس یقین کے ساتھ سلیں منے پر رکھتے کہ اُنھیں بچوں والا بھرا پرا خاندان نصیب ہوگا'۔

پامیر کے سفر کے دوران ڈنمور نے قراقرم درہ کے پار ایک گھاٹی میں انسانی اور گھوڑوں کی ہڈیوں کے ڈھانچے دیکھے۔ ڈنمور نے اس بے نام وادی کا نام لداخی میں ''روسپا لونکپا'' رکھا جس کا مطلب ہڈیوں والی وادی ہے۔ ۱۸،۲۵۰ فٹ بلند ایک درے پر اس نے ایک تتلی دیکھی۔ اس کا نام ''پیمالیپڑ ے لا'' یا تتلی درہ رکھا۔

قراقرم کے دامن میں اس نے ایک جگہ دیکھی جسے 'اُبلتی چائے کا نالہ' کہا جاتا تھا۔ یہاں ایک یارقندی کو چائے پینے کے لیے پانی نہیں اُبلا تھا تو اس نے سارے کنگھے چائے اُبالنے کے لیے جلا ڈالے، جو اس کا واحد سامان تجارت تھا۔

اس سفر کے دوران ایک مرتبہ اس کے ایک لداخی ملازم شکور علی کو کھانسی ہوئی۔ ڈنمور نے اس کو کھانے کے لیے لوزینجیز دیئے۔ یہ میٹھے تھے۔ شکور علی نے اس کا ذکر دوسرے لداخیوں کے سامنے کیا۔ آدھا گھنٹہ بعد یہ خبر آئی کہ باقی قلیوں کو بھی کھانسی کی شکایت ہے۔ ڈنمور نے سبھوں کو درجن بھر لوزینجیز دیئے۔ ڈنمور لکھتا ہے: 'لداخیوں کو میٹھی چیزوں کا بڑا شوق ہے'۔

الیف ای ایس ایڈیر (F.E.S. Adair)

۱۸۹۴ء کی گرمیوں میں ایک شکاری ایف ای ایس ایڈیر شکار کے لیے لداخ پہنچا۔ اس نے یہاں جنگلی جانوروں کے غول دیکھے اور شکاریوں کو ٹرافیوں کے ساتھ واپس جاتے ہوئے دیکھا۔ ٹرافیوں میں جنگلی بکروں، جنگلی یاک وغیرہ کے سر تھے جنھیں ڈرائنگ روم میں سجاوٹ کے

لیے لیے جاتے تھے۔

پاندراس کے پاس اڈیر کو تین سرخ ریچھ نظر آئے۔ تبت کی سرحد کے پاس ہنلے گاؤں میں اس نے جنگلی بکرے ناپو کے کئی ریوڑ دیکھے۔

مصنف نے ۴۲ قسموں کی تتلیوں کے نام دیئے ہیں۔ یہ تتلیاں اڈیر کو اپنی سیاحت کے دوران نظر آئیں۔

ان دنوں لداخ میں پختہ پل خال خال تھے۔ آمدورفت کے لیے دریاؤں پر جھولا پل تھے جو بید کے درخت کی ٹہنیوں سے بنائے جاتے تھے۔ چھوٹے دل کے لوگ اسے پار کرنے سے ڈرتے تھے۔ مصنف کے ایک دوست کے خدمت گار کو آنکھوں پر پٹی اور ہاتھ پیر باندھ کر ایک قلی نے پیٹھ پر اُٹھا کر پل پار کیا۔

لیہہ میں موراوین مشن کے ہاں مہینوں کے بعد اڈیر کو سلاد اور پھول گوبھی کھانے کو ملی۔ وہ ان کے ذائقے کی تعریف کرتا ہے۔ مشن کے پادری اپنے باغ میں سبزیاں اُگاتے تھے۔

لیہہ میں اس نے دھات کا بنا افیون کا پائپ دیکھا۔ ان دنوں لداخ میں چرس اور افیون عام دستیاب تھی اور متعدد لوگ ان منشیات کے عادی ہو گئے تھے۔

۱۸۹۴ء میں موراوین مشن کا ایک ڈاکٹر احمد شاہ لیہہ آیا۔ وہ چار سال لداخ میں رہا۔ اس نے لداخ سے متعلق ایک کتاب لکھی ہے۔

احمد شاہ

احمد شاہ نے دعویٰ کیا ہے کہ اس نے لیہہ میں فٹ بال اور لالٹین سے لوگوں کو روشناس کیا۔ فٹ بال لداخ میں گزشتہ صدی کے آخری ربع تک سب سے پسندیدہ کھیل تھا۔ اب کرکٹ نے اس کی جگہ لی ہے۔

احمد شاہ لکھتا ہے۔ 'لوگ چیچک کا ٹیکہ نہیں لگاتے ہیں اور چیچک کے مریض کو کھانا اور پانی دے کر الگ رکھا جاتا ہے۔'

احمد شاہ نے لداخ میں خودکشی کی ایک واردات کا ذکر کیا ہے جو نومبر ۱۸۹۵ء کو پیش آئی۔ جس آدمی نے خودکشی کی اس کے پاس اپنی بیٹی کی شادی کے لیے جہیز کا سامان نہیں تھا۔ ان دنوں دلہن کے لیے سرپوش پیرق کا ہونا ضروری تھا۔

احمد شاہ نے منشی سپلگیں کا ذکر کیا ہے۔ منشی لیہہ سے ۵ پڑاؤ دور خربو گاؤں میں وزیر کی طرف سے برٹش جوائنٹ کمشنر گاڈفری کی پیشوائی کے لیے آیا تھا۔ احمد شاہ لکھتا ہے: 'لداخ میں منشی کی بڑی عزت تھی۔ انتظامیہ کی طرف سے اُنھیں غیر ملکیوں کی رہبری کے لیے متعین کیا جاتا تھا۔ جو کوئی غیر ملکی لیہہ آتا، منشی سے ضرور ملتا تھا۔ منشی پنجابی بھی بولتا تھا۔ ان کے گھر میں لہاسہ کی نادر چیزیں برائے فروخت رکھی تھیں۔ وہ اچھا شکاری تھا۔ ان کے پاس درجن بھر انگریزی بندوقیں اور ریوالور تھے جو یورو پی شکاریوں نے ان کو دیئے تھے۔'

وہ فورسیتھ مشن کے ساتھ یارقند گیا تھا اور دو مرتبہ لہاسہ کا سفر کیا تھا۔ منشی اور سانو منشی ہم عصر تھے۔ یہ دونوں پنجابی اور اُردو زبانیں جانتے تھے۔ مصنف کو وزیر نے اُنھیں بطور مترجم فراہم کیا۔

اے ای وارڈ

ایک انگریز اے ای وارڈ نے The tourists and sportsman's guide of Kashmir and Ladakh کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے جس میں لداخ کے جنگلی جانوروں، پرندوں اور پھولوں کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ وارڈ ۱۸۹۴ء میں لداخ آیا تھا۔ اس کے دو سال بعد کتاب شائع ہوئی۔ لداخ اور کشمیر میں آنے والے سیاحوں اور شکاریوں کی تعداد میں اضافہ کے پیش نظر ایک ایسی معلوماتی کتاب کی ضرورت تھی اور غالباً اس موضوع پر یہ پہلی کتاب تھی۔

وارڈ نے لکھا ہے: 'سردیوں میں لیہہ میں دو تہائی دُکانیں بند ہو جاتی ہیں۔ پنجابی دُکاندار بھی سردیوں میں لیہہ میں نہیں رہتے۔'

فادر سیمائل ریباک (S. Ribach)

موراوین مشن کے پادری فادر سیمائل ریباک ۱۸۹۴ء میں لیہہ آئے۔ وہ ۱۹ سال لداخ میں رہے۔ ان کی کتاب Broghpa Namghyal، The life of a Villager افسانوی انداز میں لکھی گئی ہے، تاہم یہ لداخی سماجی زندگی کی صحیح تصویر پیش کرتی ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے لداخ کے خلسے گاؤں کا ایک کردار بوروغپا نمگیل اور اس کے خاندان کو لیا ہے اور ان کے گرد لداخی زندگی، سماج اور ثقافت کے مختلف پہلو منظر عام پر آتے ہیں۔ اس زمانے میں ایک لداخی پر جیوتش، جنات، پانی اور زمین کے ہم زاد (spirit) کا جو اثر و نفوذ تھا، اس کو انھوں نے خوبصورتی سے اُجاگر کیا ہے۔

ریباک نے لیہہ کے پاس ایک گاؤں شے میں ایک اسکول کھولنے کے لیے گاؤں کے بزرگوں کے سامنے تجویز رکھی لیکن بزرگوں نے ایک انوکھی دلیل دیتے ہوئے مخالفت کی کہ حکومت کی شہ پر اسکول کھولا جا رہا ہے تاکہ بچوں کو فوجی تربیت کے لیے تیار کیا جائے۔ گھنٹوں کی بحث و تکرار کے بعد فادر ریباک گاؤں والوں کی غلط فہمی دور کرنے میں کامیاب ہوئے اور اسکول کے لیے ایک کمرہ کرایہ پر لیا۔ نو بچوں نے اسکول میں داخلہ لیا۔ دوسری دفعہ ریباک جب شے گئے تو اپنے ساتھ ایک فٹ بال بھی لے گئے جس نے اسکول نہ آنے والوں میں اسکول جانے کا شوق پیدا کیا۔ چنانچہ کھیل کے اختتام پر مزید نو بچوں نے داخلہ لیا۔

گاڈفیری

برٹش جوائنٹ کمشنر گاڈفیری سے متعلق میں ایک واقعہ کے بیان پر اکتفا کرتا ہوں۔ ۱۸۹۴ء میں جب وہ سری نگر سے لیہہ روانہ ہو رہا تھا تو کرگل میں دریائے سورو میں سیلاب کی وجہ سے قصبے کا پل بہہ جانے سے وہ آگے نہیں جاسکا۔ گاڈفری اور دوسرے افسران کرگل کے پاس چھالے سوکو میں خیمہ

زن ہوئے۔ کئی لداخیوں نے دریا پار کرنے کی کوشش کی لیکن وہ ڈوب گئے۔ پانی کے شور کی وجہ سے دریا کے آر پار آواز نہیں جاتی تھی۔ تب ایک آدمی کو ایک تدبیر سوجھی۔ وہ تیر اور کمان لایا۔ تیر پر ایک چٹھی باندھ کر کمان کے چلّے سے ٹکا کر دریا کے پار چھوڑا لیکن تیر دریا میں چلا گیا۔ پھر دوسرا تیر آزمایا جو دریا کے پار گیا۔ اس طرح پیغامات کا تبادلہ ہوا۔ دونوں طرف سینکڑوں قلی جمع ہوئے۔ کرگل میں سامان جمع کیا جانے لگا۔ اس کے بعد رسیوں کے ذریعے آر پار پیغامات کا تبادلہ ہوا۔ آخر کار پل بن گیا اور ۲۶ جولائی کو پل آمد و رفت کے لیے کھول دیا گیا۔ ۱۳ اگست کو کپتان گوڈفری لیہہ پہنچا۔

آرتھر نیوے اور ٹینڈل بسکو

۱۸۹۶ء میں ڈاکٹر آرتھر نیوے اور ٹینڈل بسکو لداخ آئے۔ دونوں نے زندگی کا بڑا حصہ کشمیر میں گزارا تھا۔ ٹینڈل بسکو نے سری نگر میں بسکو اسکول قائم کیا تھا۔ اس تعلیمی ادارے نے وادی کشمیر میں علم کا اجالا پھیلانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ لداخیوں کے کردار سے متعلق آرتھر نیوے کے تاثرات:

'لداخی قانع اور شادماں نسل ہیں۔ یہ جھگڑالو نہیں ہیں اور نہ انتقام لینے والے ہیں۔ شاذ و نادر ہی یہ جو سے بنی شراب (چھنگ) کے اثر میں آتے ہیں۔'

نیوے لداخ سے متعلق لکھتا ہے: 'لداخ ایک انوکھی پر کشش جگہ ہے۔ کشمیر کے شاداب حسن سے یہ بالکل عاری ہے، تاہم اس کے اونچے رتیلے میدانوں اور ناہموار گرینائٹ کے لمبے پہاڑوں میں اپنا حسن ہے۔ جو بھی کبھی وہاں گئے ہوں، اس کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔'

دراس سے متعلق وہ رقم طراز ہے: 'دراس ایک ویران اور بلند مقام ہے لیکن اس کی اپنی کشش ہے۔' نیوے دراس کے پہاڑوں کی رنگارنگی سے متاثر لگتا ہے۔

ڈاکٹر نیوے نے لداخ کے پھولوں، پرندوں اور جانوروں کا ذکر کیا ہے۔ بقول ان کے اُن دنوں مسلمان لیہہ میں متعہ کرتے تھے۔ ڈاکٹر نیوے نے لداخ پر ایک گائیڈ بک بھی لکھی ہے۔

ٹینڈل بسکو نے بھی اپنا دلچسپ سفر نامہ لکھا ہے۔ برٹش جوائنٹ کمشنر کپتان ٹرینچ سری نگر سے

لیہہ کے سفر میں ان کے ساتھ تھا۔ راستے میں کئی گاؤں میں جوائنٹ کمشنر کا استقبال کیا گیا۔ مولبیک میں لاموں نے موسیقی کے آلات بجا کر سواگت کیا اور ایک پولو میچ کا اہتمام کیا۔

راستے میں اُنھوں نے پانی اور ہاتھ سے چلنے والے پریر وہیل دیکھے حصول ثواب کے لیے جنھیں بودھ ہمیشہ حرکت میں رکھتے تھے۔

بسکو لداخی لباس سے بڑا متاثر تھا۔ مردوں نے اپنے کمر بند سے چاقو، افیون کے پائپ، بٹوہ، قلم دان، دوات، چابک اور چقماق باندھے تھے۔

لیہہ سے ۷ میل آگے بہت سارے لوگ برٹش جوائنٹ کمشنر کی پیشوائی کے لیے آئے تھے۔ بعد میں قصبہ کے بازار میں ان کا شاندار استقبال کیا گیا جس میں اسکول کے بینڈ، گمپوں کی موسیقی کے آلات اور مقامی آبادی کا ''کلچور'' کا روایتی سواگت شامل تھا۔

بسکو نے بھی لکھا ہے کہ بودھوں کی پوجا عیسائیوں سے ملتی ہے۔

ٹینڈل بسکو اور آرتھر نیوے میلہ ہمس دیکھنے گئے۔ اُنھوں نے ایک گھوڑے پر تین سواریوں کو عام دیکھا۔ مرد پیچھے اور عورت آگے ہوتی تھی۔

پوریگ میں نیوے نے موتیابند کے ۴۲ آپریشن کیے۔ بسکو لکھتا ہے: 'نابیناؤں کو بینائی ملنے سے ڈاکٹر نیوے کو غیر معمولی مسرت ہوتی تھی۔ ڈاکٹر اپنی اُنگلیاں اُٹھا کر مریض کو گننے دیتا۔ جب وہ ٹھیک ٹھیک گن پاتا تو وہ خوشی سے مسکراتا تھا۔

اے۔ ایچ۔ فرانکی

ڈاکٹر اگسٹ ہمہ فرانکی ہمہ جہت صفات کے مالک تھے۔ وہ بیک وقت قلمکار، مورخ، ماہر تعلیم ،موسیقار اور مصور تھے۔ لداخ کی تاریخ، ثقافت آثار قدیمہ لوک ادب زبان وغیرہ پر انھوں نے جتنا کا م کیا ہے، شاید ہی آج تک کسی اور نے کیا ہو۔ وہ جرمنی سے پہلے پہل ۸ جون ۱۸۹۶ء کو موراوین مشن کے ایک پادری کی حیثیت سے لداخ آئے تب وہ ۲۶ سال کے تھے۔ انھوں نے ۱۲ سال لداخ میں

قیام کیا۔۱۹۰۴ء میں انھوں نے لداخی اخبار ''لداخ گی اخبار'' کی ادارت کی۔ ۱۹۰۷ء میں لداخ کی تاریخ پران کی تصنیف شائع ہوئی۔ ڈائریکٹر جنرل آف آرکیالوجی ڈاکٹر جے۔ایچ۔ مارشل نے لداخ کے آثارِ قدیمہ کے سروے کیلیے فرانکی کی خدمات حاصل کیں۔ فرانکی نے ۱۲ جون ۱۹۰۹ء کو اس سلسلے میں شملہ سے سرینگر تک سفر کیا اور Antiquities of Indian Tibet کے نام سے دو جلدوں میں لداخ کے آثار قدیمہ پر یادگار کتاب تصنیف کی۔ ان کے علاوہ فرانکی نے لداخ سے متعلق گوناگوں موضوعات پر متعدد مضامین لکھے۔ انھوں نے لداخ کی تاریخ بھی لکھی۔

لومڑی کی مکاری سے متعلق فرانکی نے لداخ اور یوروپ کی کہانیوں میں یکسانیت پائی۔ فرانکی نے کیسر کی داستان کو Edda کی رعایت سے جوڑا۔ انھوں نے یورپ اور لداخ کے سرمائی تیوہاروں میں بھی مماثلت پائی۔

فرانکی نے ایک لداخی شادی میں اس لیے شرکت نہیں کی کہ دلہن بہت چھوٹی تھی۔ بیٹے کی شادی کے بعد ماں اور باپ کو بڑے مکان سے چھوٹے مکان میں منتقل کرنے پر انھوں نے نکتہ چینی کی۔ چھوٹے مکان میں ضروریات اور آسائشیں کم ہوتی تھیں۔

خلسے گاؤں کے لوگ ایک جگہ سے لکڑی بالکل نہیں لاتے تھے۔ ان کا کہنا تھا، وہاں ایک ہمزاد (Spirit) نے بسیرا کیا ہے۔ درخت کو نقصان پہچانے سے وہ ناراض ہوگا اور متعلقہ آدمی یا اس کے خاندان پر بلا نازل ہوگی۔ فرانکی اور اس کی بیوی نے لوگوں کا وہم دور کرنے کے لیے وہاں سے لکڑی لاکر استعمال کی۔

جرمن قومیت کا ہونے کی وجہ سے دوسری جنگ عظیم میں ان کو احمد آباد میں قید کیا گیا۔ بعد میں دوبارہ لداخ آنے کی انھیں اجازت نہیں ملی۔ وہ ۱۹۳۰ء میں چل بسے۔

ایچ زیڈ۔ دارہ (H.Z.Darrah)

ایک انگریز ایچ۔ زیڈ دارہ ۱۸۹۶ میں شکار کے لیے لداخ گیا۔ وہ لکھنو میں ڈپٹی کمشنر تھا۔ منشی

سپلکیس کے حوالے سے اس نے لکھا ہے کہ جنگلی یاک اور ژوس(Antilope) چنگ چھنمو علاقہ میں، ناپو(Bharal) اور شاپو(Urial) لیہہ کے نزدیکی نالا اور رومبق اور نیان(ovis Ammon) خرنق میں پائے جاتے ہیں۔

منشی کی سفارش پر اس نے ایک مقامی شکاری راپسانگ کو اپنے ساتھ لیا۔ دارہ نے راپسانگ کی تعریف کی ہے۔

ان دنوں لیہہ میں موہن لال نام کا ایک دکاندار تھا جس کی دکان پر ساری چیزیں دستیاب تھیں۔

دارہ جگہ جگہ سے ڈاک اور اخبارات لانے کے لیے قلی بھیجتا تھا اور حالات سے آگاہ رہتا تھا۔

جارج لیٹل ڈیل

کئی دفعہ یورپی Explorers نے مقامی کارواں لیڈر، رہبروں، ٹٹو والوں اور قلیوں کی خدمات کو نظر انداز کیا ہے اور اپنے سفرناموں میں صرف اپنے کارناموں کا ہی ذکر کیا ہے۔ اس کی ایک مثال جارج لیٹل ڈیل کا سفر تبت ہے۔ لیٹل ڈیل نے اپنے سفرنامہ میں لداخی ملازمین کا بالکل ذکر نہیں کیا ہے جب کہ اس مہم میں وہ اپنی جان پر کھیلے تھے۔ رسول گلوان کارواں لیڈر تھا۔ لٹیل ڈیل کی منزل تبت تھی لیکن تبت یورپیوں کے لیے بند تھا۔ لداخیوں نے لیٹل ڈیل کو لہاسہ کے قریب پہنچا دیا جہاں سینکڑوں مسلح تبتیوں نے ان کو گھیرے میں لے لیا۔ یہ مقام لہاسہ سے ۴۳ میل دور تھا۔ یہاں سے ان کو واپس جانے کے لیے مجبور کیا۔ واپسی کے لیے انھوں نے لہاسہ۔ لیہہ کا راستہ اختیار کیا، لیکن تبتی حاکم کا تحریری حکم نامہ نہ ہونے کی وجہ سے پارٹی کو اشیائے خوردنی اور باربردار جانور ملنے میں بڑی دقت پیش آئی۔ اس حالت میں رسول گلوان اور قلم رسول کے دماغ نے کام کیا۔ اول الذکر نے ایک تبتی لاما کا بھیس اختیار کیا اور قلم رسول نے ایک چینی لاما کا روپ دھارا۔ اس لمبے سفر میں اُنھوں نے جگہ جگہ تبتیوں سے کہا کہ وہ دلائی لاما کے نمائندے ہیں۔ جارج لیٹل ڈیل دلائی لاما کا مہمان ہے۔ اس سفر میں لٹیل ڈیل کی بیوی بھی تھی۔ جس نے خود کو ملکہ وکٹوریہ کی چھوٹی بہن بتایا۔

انھوں نے جعلی تعویزیں اور نقلی ٹکیوں کو دلائی لاما کے عطا کردہ تبرکات بتا کر تبتیوں میں تقسیم کیں۔ سیدھے سادھے تبتی ان کی باتوں کے جھانسے میں آگئے اور اظہار تشکر کے ساتھ مفت بار بردار جانور اور کھانے پینے کی چیزیں مہیا کیں۔ ایک جگہ انھوں نے چند لوگوں کو ان کی درخواست پر ایک چراگاہ منتقل کی۔

مغربی تبت کے صدر مقام رودوق کے پاس انھیں چند اہل کاروں اور مسلح سپاہیوں نے روک لیا اور ہیڈ چیف نے ان کو سخت ٹوکا کہ تبتی حاکم اعلیٰ کے حکم کے بغیر انھوں نے تبتیوں سے کھانے پینے کی اشیا اور یاک گھوڑے حاصل کیے۔ قلم رسول بولا۔ اگر ہم یہ ڈرامہ نہ کرتے تو یہاں نہیں پہنچتے اور راستے میں بھوکے مرجاتے۔

ایک سال تین ماہ تیرہ روز کے بعد نومبر ۱۸۹۶ء میں وہ لیہہ پہنچے اور لیہہ میں ایک روز رہنے کے بعد جاج لیٹل ڈیل اور مسز ڈیل کے اصرار پر گلوان رسول کو ان کے ساتھ سرینگر جانا پڑا۔ نومبر کا مہینہ تھا۔ زوجی لا پر سفر کرنا جان جوکھوں کا کام تھا۔ اس کی نو بیاہتا بیوی مریم نے احتجاج کیا۔ شادی کے آٹھ روز بعد وہ تبت کے سفر پر نکلا تھا۔ سرینگر سے رسول اپنی جان پر کھیل کر برفانی زوجی لا عبور کر کے لیہہ لوٹا۔

۱۸۹۷ء میں کشمیر میں تعینات برطانوی ہند کے انگریز افسر نے لیہہ بازار کا نقشہ اِن الفاظ میں کھینچا ہے: بازار مختلف قومیتوں کے لوگوں سے بھرا ہوا ہے۔ وسط ایشیا سے لمبے کوٹ میں ملبوس مسلمان، پر پروہیل اٹھائے ہوئے تبتی، سفید کپڑے پہنے ہوئے ہندوستان کے ہندو سبھی اپنے مال کے تبادلے کے لیے بھاؤ تاؤ کر رہے ہیں۔ ہندوستانی تاجر ترکستان کا مال لے کر اپنے آسان راستے سے ہندوستان لوٹتے ہیں جب کہ شمال کے تاجر واپس اپنی راہ لیتے ہیں اور یارقند پہنچنے کے لیے کوشاں ہیں۔ اگر تبت سب کے لیے کھلا ہوتا تو ہندو تاجر تبت سے تجارت کرنے کو ترجیح دیتے۔

۱۸۹۸ء میں لیہ بازار کو وسعت دی گئی اور امیر لداخیوں نے نئی دکانیں تعمیر کیں۔ ایک سال کے بعد لیہ کے برٹش جوائنٹ کمشنر نے رپورٹ دی کہ لیہہ بازار بڑا ہے۔ اس میں بہتری لائی گئی ہے اور سبزی فروشوں اور مقامی دوسری پیداوار کی کھپت کے لیے منڈی بنائی گئی ہے۔

اسی دوران برٹش جوائنٹ کمشنر نے راستے اور سرائیں تعمیر کرنے کے لیے اقدام کیے۔ اس سے پہلے ۱۸۹۵ء میں خردونگ پر نئے راستے کا کام منشی سپلگیس کو سونپا جسے منشی نے بخوبی سرانجام دیا۔ پہلی مرتبہ سامان لدے گھوڑے خردونگ پار کر گئے اور منشی نے رپورٹ دی کہ اس کی آنکھوں کے سامنے ۴۰ سے ۵۰ سامان لدے ٹٹو درے سے صحیح سلامت گزرے۔

فینی بی ورک مین اور ولیم ایچ ورک مین

امریکی میاں بیوی فینی بولوک ورک مین اور ولیم ایچ ورک مین ۱۸۹۸ء کی گرمیوں میں لیہہ آئے جہاں سے وہ نوبراہ اور مشرقی ترکستان کی سرحد تک گئے۔ کوہ پیمائی کی، پھر زنسکار روانہ ہوئے۔ ۱۸۹۹ء میں دیوسائی سے سکردو اور شگر چلے گئے۔ تب سے ۱۹۱۲ء تک دونوں میاں بیوی نے خطے میں ۵ مہمات میں حصہ لیا اور آٹھ مرتبہ کوہ پیمائی کی۔ آٹھ ضخیم کتابوں میں انھوں نے ان کی تفصیلات پیش کی ہیں۔ ان سے پہلے کرنل گوڈوین آسٹین، کرنل ینگ ہاسبنڈ اور سر مارٹین کونوے نے قراقرم میں دشت نوردی اور کوہ پیمائی کی تھی۔

۱۹۰۲ء اور ۱۹۰۳ء میں فینی ورک مین اور ولیم ورک مین نے شمالی بلتستان میں ۳۰ میل لمبا چوگولونگما گلیشیر دریافت کیا۔ فینی نے ۲۲۵۶۸ فٹ بلند گونگما چوٹی سرکی اور ولیم ۲۳۳۹۲ Pyramid چوٹی پر چڑھا۔ ۱۹۰۴ء میں فینی نے لداخ میں کرگل کے پاس نن کن کی ایک چوٹی سرکی اور اس کو ۲۳۳۰۰ فٹ بلند پایا۔ سیون ہیڈن نے ولیم اور فینی کے ان یخ بستہ پہاڑوں کی دریافت کو دنیا کے لیے ایک اہم واقعہ قرار دیا ہے۔

دونوں میاں بیوی کی اہم ترین دریافت سیاچن یا گل گلاب گلیشیر ہے۔ ۱۹۱۱ اور ۱۹۱۲ کی مہمات میں انھوں نے یہ کارنامہ سرانجام دیا۔ فینی نے اسے ''عظیم گل گلاب یا سیاچن کی فتح اور دنیا کا طویل ترین دقطبی گلیشیر' کہا ہے۔

کسی کے خواب وخیال میں نہیں تھا کہ ۴۶ میل لمبا گل گلاب گلیشیر ۲۷ سال بعد دنیا کا بلند ترین

میدان جنگ میں تبدیل ہوگا۔فینی نے اپنی کتاب Two summers in the Ice wilds of Eastern kara koram میں ۱۹۱۱ اور ۱۹۱۲ میں سیاچن کی مہم کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔اس میں ۱۴۱ خوبصورت تصویریں ہیں۔ایک تصویر میں فینی لگ بھگ ۲۱ ہزار فٹ بلند چوٹی پر اسکرٹ اور جیکٹ میں ملبوس ایک اخبار پڑھ رہی ہے جس پر ''عورتوں کو حق ووٹ'' کی سرخی جمی ہے۔فینی کے سامنے اس کی میخ توڑنے کی کلہاڑی برف میں دھنسی ہے۔۱۹۱۲ء کی مہم کے دوران فینی اور ولیم نے ایک سرے سے دوسرے سرے تک سیاچن دیکھا۔ان کے ہمراہ کئی یورپی اور ۶۶ قلی وغیرہ تھے۔آج سیاچن کا نام ساری دنیا نے سنا ہے۔ان دنوں بقول فینی ورک مین اس کے ہمسایہ میں رہنے والے نوبراہ کے لوگوں کو بھی سیاچن کا بہت کم علم تھا۔

فینی اور ولیم سے پہلے ڈاکٹر ٹی۔جی۔لونگ سٹاف نے ۱۹۰۹ میں سیاچن کا سروے کیا تھا۔ان کے سروے اور قیاس کے مطابق کبھی بلتستان کے لوگ نوبراہ جانے کے لیے بطور شارٹ کٹ سیاچن کا ۱۸۴۰۰ فٹ بلند درہ بیلافونڈلا کا راستہ اختیار کرتے تھے۔جس سے فینی ورک مین بھی متفق ہے۔

ولیم اور فینی نے لداخیوں سے متعلق اپنے تاثرات یوں بیان کیے ہیں: لداخی خالی ٹین بوتلوں کو بڑے اشتیاق سے جمع کرتے ہیں، جو ان کے گھروں میں بڑے کام آتے ہیں۔

چنگ لونگ اور ساسیر درہ سے نشیب تک تین دن کے سفر کے دوران انھوں نے ہزاروں ٹٹوؤں کے ڈھانچوں کے علاوہ جانوروں کی بہت سی تازہ لاشیں دیکھیں۔چند مقامات پر ۲۰ سے ۵۰ ڈھانچوں کے انبار سے راستہ یوں ڈھکا ہوا تھا جو گھمسان کی لڑائیوں کے بعد دیکھنے میں آتا ہے۔ایک انگریز سے انھوں نے سنا کہ وہاں دو انسانی لاشیں بھی تھیں۔

سر ریجینلڈ رنکین (Sir Reginald Rankin)

جون ۱۸۹۸ء میں ایک انگریز فوجی افسر سر ریجینلڈ رنکین لیہہ آتا ہے۔اس کے ساتھ اس کا ہیڈ کلرک بطور مترجم آیا ہے۔وہ لاہور یونیورسٹی کا گریجویٹ ہے وہ سکردو بھی جاتے ہیں۔جہاں وزیر

اس سے ملنے آتا ہے۔ حسب معمول وزیر گورے کرنیل کا بڑا خیال رکھتا ہے۔ کرنیل سے روس کی توسیع پسند پالیسی کی بات ہوتی ہے۔ ان دنوں لیہہ۔ سکردو اور لیہہ سرینگر کے درمیان تار کا نظام قائم ہوا ہے۔ جس سے مواصلات میں سہولت ہوئی ہے۔

ایک جگہ پر سکون دریائے سندھ کو دیکھ کر کرنل لکھتا ہے: بلاشبہ وہ دن زیادہ دور نہیں جب چین کا راستہ کھلے گا۔ تبت کے وسائل کے استعمال سے مشرقی تجارت کو تحریک ملے گی اور ایک عمدہ صبح قدیم دریائے سندھ جاگے گا اور یہ دیکھے گا کہ اس پر سے تبتی سونا، چینی ہاتھ دانت، ریشم، اناج، سینکڑوں جہازوں میں لدے لیہہ سے برفانی چیلاس ہو کر کراچی پہنچیں گے۔

ظاہر ہے کرنل نے چٹانوں اور بڑے بڑے پتھروں سے بھرا تیز تند سندھ نہیں دیکھا تھا۔

ان دنوں کشتواڑ وغیرہ کے تاجر لداخ میں افیون فروخت کرتے تھے اور یارقند لی جاتی تھی۔ مرزا سیف الدین نے لکھا ہے کہ ۱۸۹۸ء میں خاقان چین نے حکم جاری کیا کہ جو بھی شخص چین کی قلمرو میں افیون لائے تو وہ لداخ واپس لے جا کر فروخت کرے۔ اگر کوئی چینی علاقے میں افیون رکھے گا یا پوشیدہ طور پر بیچے گا تو اس کو سخت سزا دی جائے گی۔ اس اعلان کے بعد افیون فروشوں کے گھروں کی تلاشی لی گئی اور برآمد شدہ افیون جلا دی گئی۔ لالہ کوٹھی مل کو چھ لاکھ روپے کا نقصان ہوا۔ یہ افیون ترکستان کے تاجروں کے پاس رکھی تھی۔

کپتان ٹرنچ (Trench)

ستمبر ۱۸۹۸ء میں لیہہ قصبہ کو خوبصورت بنانے اور اسے صاف ستھرا رکھنے کے لیے برٹش جوائنٹ کمشنر کپتان ٹرنچ نے کئی تجویزیں رکھیں۔ اس سلسلے میں ایک منصوبہ بنایا گیا جس کے تحت قصبے کی تنگ گلیوں میں بہتری لانے اور پولو گراؤنڈ جانے کے لیے تنگ گلی کو کشادہ کر کے ایک نیا بازار بنانا شامل تھا۔ اسکیم کے نئے نقشے میں ڈسپنسری کے لیے ایک نئی جگہ کی نشاندہی کی گئی تھی۔ ٹرنچ کا بنایا ہوا نیا بازار لیہہ کے چوک سے دیوی دوارہ تک جاتا تھا، لیکن یہ پولو گراؤنڈ اب شاپنگ کمپلیکس میں بدل گیا ہے۔ تب یہ پولو گراؤنڈ لداخیوں میں شغارن کے نام سے مشہور تھا۔

جوائنٹ کمشنر کے حکم پر بازار اور گلیوں کو ہفتے میں ایک مرتبہ صاف کیا جانے لگا قصبے کے لوگوں کو ہدایت دی گئی کہ وہ گرمیوں میں اپنے مکانات اور گلیوں کی مہینے میں کم سے کم ایک مرتبہ صفائی کریں۔ موسم بہار کے آغاز میں زمیندار بیت الخلا کی کھاد کھیتوں میں لینے کے لیے گلیوں میں نکالتے تھے۔لوگوں کو حکم دیا گیا کہ یہ کھاد گلی میں دو یا تین دن سے زیادہ نہ رہے۔ مضافات کی نگرانی کا فریضہ قصبے کے کوتوال کو سونپا گیا۔حکم کی خلاف ورزی کرنے والوں کے خلاف تحصیلدار جرمانہ عائد کرتا تھا۔

ان دنوں تبت کے ایک بڑے لاما کوشوق لبنر انگ نمگیل لیہہ آئے۔ کپتان ٹرینچ کوشوق سے ملاقات کرنا چاہتا تھا لیکن کوشوق نے یہ کہہ کر معذوری کا اظہار کیا کہ انھیں یورپیوں سے ملنے کی اجازت نہیں ہے۔اس پر ٹرینچ نے احتجاجاً خط لکھا کہ ملکہ برطانیہ کا نمائندہ ہونے کے باوجود انھیں ملاقات کا موقع نہیں دیا گیا۔خط پا کر بڑے لاما خوش ہوئے کیونکہ یہ خط دکھا کر لہاسہ میں وہ دلائی لاما کو اپنی وفاداری کا ثبوت پیش کر سکتے تھے۔تب تبتیوں میں یہ وہم تھا کہ لہاسہ میں غیر ملکیوں کی آمد سے قحط اور بیماریاں پھیلیں گی اور لوگ مذہب سے برگشتہ ہو جائیں گے۔

السٹیر لمب کے مطابق ان دنوں سینکڑوں یاتری ہندوستان سے کیلاش یاترا پر آتے تھے اور جھیل مانسروز میں اشنان کرتے تھے۔گرمیوں میں گرتوق میں ہزاروں تاجر اور لوگ جمع ہوتے تھے جن میں مشرقی ترکستان کے علاوہ روسی علاقوں کے تاجر بھی ہوتے تھے۔

سی۔ای۔ایم رسل (C.E.M.Russel)

۱۸۹۹ کے آس پاس لداخ آنے والے ایک اور شکاری سی۔ای۔ایم رسل نے شکار کے احوال لکھے ہیں تب ڈوگرہ حکومت نے ریاست میں شکار کے لیے کئی قوانین وضع کیے تھے۔لداخ میں جنگلی جانوروں کو ہانک کر شکار کرنے کی ممانعت تھی البتہ ریچھ اور چیتے کا ۱۵ مئی سے ۱۵ اکتوبر کے درمیان ہانک کر شکار کیا جاسکتا تھا۔نسل کشی کے موسم میں شکار کی اجازت نہیں تھی۔

شکاری جانور مارنے کی حد قائم کی گئی تھی۔اس کے مطابق ایک شکاری چھ مسکین دونیان (ovis Amimon) چار شاپو (urial) چار ناپو (Bharal) چار ژوس (Antilope) دو غزال

(Ghazal) دو کشمیری بارہ سینگا (Stag) اور ایک سیر و مار سکتا تھا۔ چیتے، ریچھ سور سیر دو غیرہ مارنے کے لیے کوئی حد مقرر نہیں کی گئی تھی۔ لائسنس فیس ساٹھ روپے تھی جس سے سرکار کو سالانہ تیس ہزار روپے کی آمدنی تھی۔

رسل لکھتا ہے کہ کام پر لیے ہوئے مقامی شکاری اور ملازم لوگوں پر ظلم ڈھاتے ہیں اور کرایہ وغیرہ ادا نہیں کرتے۔

ایڈگر فلپس (Edgar phelps)

ایڈگر فلپس کی کتاب yak shooting in Tibet ۱۹۰۰ء میں چھپی تھی۔ مصنف کا خطے میں یہ دوسرا یا تیسرا سفر تھا۔ رسول گلوان نے اس کے ساتھ سفر کیا تھا۔ اب کے رسول شکار کی اس مہم میں بطور کارواں لیڈر شامل ہوا۔ Gerry milne اس کا ساتھی تھا۔ وہ آسٹریلیا کا رہنے والا تھا۔ اس کی پارٹی ۲۰ افراد پر مشتمل تھی جن میں زیادہ تر آرغون تھے۔ کارواں میں ۴۲ گھوڑے اور ۵۰ یاک تھے۔ دودھ کے لیے ۱۰ بکریاں اور ۱۰ بھیڑیں بھی ساتھ لیں۔ ملازم کی تنخواہ فی کس ۱۰ روپیے تھی۔ کھانے کے لیے ہر ایک کو روزانہ دو پونڈ آٹا یا چاول دیا جاتا تھا۔ شکار کے گوشت کی فراوانی ہوتو گھٹا کر ایک پونڈ چاول یا آٹا دیا جاتا تھا۔

ہور پوچھو جھیل کے پاس انھوں نے ۲۰۰ جنگلی یاک کا ایک بڑا ریوڑ دیکھا۔ ان میں ۴ نر یاک تھے۔ فلپس نے ایک یاک کی لمبائی ساڑھے اٹھارہ ہاتھ اور سینگ کی لمبائی ۲۹ انچ دی ہے۔ ۱۹ ستمبر کو وہ لیہہ واپس پہنچے۔ فلپس کے پاس یاک کے سات سر، مرگ یا Antilope کے ۲۷ اور ناپو کے ۲ سر تھے۔ آج کل ایک ریوڑ میں دس بارہ سے زیادہ جنگلی یاک نہیں دیکھے جاتے۔ آرغون سے متعلق وہ رقم طراز ہے: اگر آپ ان کے ساتھ ٹھیک برتاؤ کریں تو یہ دنیا میں بہترین کام کرنے والے ہیں۔ یہ ہر قسم کی تکلیف سہہ سکتے ہیں۔ ہمیشہ خوش و خرم رہتے ہیں اور کوئی بھی کام کرنے کے لیے آمادہ ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر اے ہیبر، کیتھلین ایم ہیبر

موراوین مشن کے ڈاکٹر اے ہیبر اور کیتھلین ہیبر پہلے پہل ۱۹۰۲ء میں لداخ آئے۔ ان کی کتاب In Himalayan Tibet لداخ اور اس کے تمدن پر ایک دلچسپ کتاب ہے۔ قارئین کو اس کتاب میں اس زمانے کے لداخ کے متعلق دلچسپ معلومات ملتی ہیں۔ لداخ سے متعلق وہ لکھتے ہیں: اس خطے کے ساتھ ہمارے بارہ سالہ تعلقات کے باوجود دلچسپ لوگوں کے بارے میں ہم سطحی معلومات حاصل کر سکے ہیں۔ پوری جانکاری نہیں۔ ہم دکھ کے ساتھ صرف اس یقین پر ان کو چھوڑ کر جا سکتے ہیں کہ مستقبل ہمیں اس وسیع موضوع کو زیادہ فراغت اور قابلیت سے نمٹنے کے لیے یہاں لائے گا۔

ڈاکٹر ہیبر اور مسز ہیبر بارہ سال سے زیادہ لداخ رہے ہوں گے یا وہ انگلستان جا کر دوبارہ واپس آئے ہوں گے۔ ۱۹۱۹ء میں پہلی جنگ عظیم کے خاتمہ اور اتحادیوں کی فتح پر لیہ میں منعقدہ بڑھاؤ چار روزہ تقریبات کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں: لیہہ میں پہلی دفعہ پٹاخوں، راکٹوں اور آتش بازی کی پھلجھڑیوں کا مظاہرہ ہوا۔ وزیر کے بنگلے کے سامنے بڑا سا الاؤ جلایا گیا۔ پولیس کے دو سپاہی اس کی نگرانی کر رہے تھے۔ پٹاخوں کے ڈھیر کو آگ لگ گئی۔ تقریباً نصف درجن لوگ زخمی ہوئے۔ پولیس کے ایک سپاہی نے چوری سے اپنی جیبوں میں کچھ پٹاخے اٹھائے تھے جنھوں نے آگ پکڑی۔ وہ پاس کے نالے میں جا کر لیٹ گیا۔ اس دوران اس کے جسم کے مختلف حصوں سے راکٹ اور آتش بازی کی پھلجھڑیاں نکلنے لگیں۔ دوسرے زخمی علاج کے لیے آئے۔ یہ آدمی ہفتوں بعد آیا۔ وہ ٹھیک نہیں ہوا تھا۔

اس موقعے پر جرمنی کے بادشاہ کیسر کا پتلا جلایا گیا۔ ایک روز شہر میں گھوڑ سواروں کا جلوس نکلا۔ اس میں سرکردہ شہریوں کے علاوہ سرکاری ملازم شامل تھے جس میں تحصیلدار، ڈاک بابو، تار بابو، چرس افسر اور داروغہ تھے۔

ہیبر اور کیتھلین ہیبر لکھتے ہیں، ان دنوں لداخ میں حقہ نوشی عام تھی۔ عورتیں بھی حقہ پیتی تھیں۔ بہتوں کو نسوار کے استعمال کی عادت تھی اور جیب میں نسوار کی ڈبیہ رکھتے تھے۔

مصنفین نے تیراندازی کے تیوہار اور گھوڑ دوڑ کا بھی ذکر کیا ہے۔ انھوں نے کشمیر سے آتے ہوئے زوجی لا پر گوناگوں پھول دیکھے اور گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھے بیٹھے ستر اقسام کے پھول گنے۔

ان دنوں مسلمان ترکی ٹوپی اور پگڑی باندھتے تھے۔

ہیبر اور کیتھرائین ہیبر رقم طراز ہیں: لداخی بڑے صحت مند ہیں اور بہت کم بیمار ہوتے ہیں، ڈاکٹر ہیبر نے ۱۹۲۶ء میں اس بناء پر استعفےٰ دیا کہ کام کا بوجھ زیادہ نہ ہونے کی وجہ سے ان کے لیے کل وقتی مشن کے ڈاکٹر کی حیثیت سے کام کرنے کا جواز نہیں ہے۔

ہمس میلہ پر وزیر اور افسروں کی لڑکیاں، بہوئیں، بچے، وغیرہ بند پالکیوں میں میلہ جاتے تھے۔ غیر ملکی اپنے ساتھ بیٹھنے کے لیے کرسیاں لاتے تھے۔ اس کے لیے ہمس گنپہ کا منیجر باقاعدہ درخواست کرتا تھا۔

انھوں نے لداخی عورتوں کے مہنگے سرپوش پیرق کا ذکر کیا ہے اور پیرق پر کانوں سے جڑے کھال کے ٹکڑوں سے متعلق یہ روایت بیان کی ہے کہ لداخ کی ایک رانی کو کان کا درد ہوا۔ اس نے بھیڑ کے بچے کی کھال کے ٹکڑے دونوں کانوں سے لگا دیئے۔ درباری خواتین نے اس کی تقلید کی ۔ پھر یہ عام لوگوں تک پہنچا اور فیشن بن گیا۔

بچوں اور بڑوں کے کھیلوں میں فٹ بال، بھیڑ اور بھیڑ کا بچہ، آنکھ مچولی، بادشاہ اور وزیر کا کھیل، Hop-scotch سات سمندر یا پہلا دوجا اور کرکٹ کی قسم کا ایک کھیل شامل تھا۔ مٹی کے تین ڈھیر بنا کران پر تین لکڑیاں کھڑی کی جاتیں اور گیند کپڑے کی بنی ہوتی تھی۔

ایک زمانہ میں گھوڑ سوار ایک زندہ بھیڑ کو اٹھا کر گول تک لینے کا کھیل کھیلتے تھے۔ جو کوئی اسے گول کے پار لینے میں کامیاب ہوتا اس کو عمدہ ضیافت دی جاتی تھی۔ گھوڑ سواروں میں بھیڑ کے لیے خوب چھینا جھپٹی ہوتی تھی۔ اس کھیل میں یارقندی حصہ لیتے تھے۔ ہیبر کے زمانے میں اس کھیل میں زندہ کی جگہ مردہ بھیڑ مروّج ہوئی تھی۔

ہیر نے لداخ کے درد قبیلہ بروقپا کے احوال لکھے ہیں۔'بودھ بروقپا مرغ مرغیاں نہیں پالتے ہیں۔ انڈے نہیں کھاتے، گائے کا دودھ نہیں پیتے اور اس کا مکھن استعمال نہیں کرتے۔ دوسرے مغربی اور ملکی اسکالر فرانکی، سکندر خان، آر۔بی۔شا، فلیپی، ڈیبلی، ڈریو، جیٹمر، وہرا، امرناتھ، بترا وغیرہ نے بروقپا، ان کے عقائد اور رسومات پر روشنی ڈالی ہے۔

لداخ کے راجہ اور رانی سے ہیبر اور مسز ہیبر کے اچھے تعلقات تھے اور ایک دوسرے کو دعوت دیتے تھے۔ کرسمس پر رانی کو گراموفون کے ریکارڈ سنائے جاتے۔ رانی کبھی میجک لنٹرین دکھانے کی فرمائش کرتی تھی۔

او۔ٹی۔کراس بائی (O.T-Crosby)

او۔ٹی۔کراس بائی تکلے مکان سے ہوتا ہوا ۱۹۰۳ء میں لداخ وارد ہوا۔ اس نے اپنا سفر نامہ شاعرانہ اور فلسفیانہ انداز میں لکھا ہے۔

وسط ایشیا کے راستے پر پڑنے والا پہلا اور آخری لداخی گاؤں پنامیک میں اس نے انگلستان کے بادشاہ ایڈروڈ کی تخت نشینی کی خبر سنی۔

لیہہ کے ڈاک بنگلہ میں کئی ماہ پرانے انگریزی رسائل تھے۔ مصنف لکھتا ہے: یہ ہمارے لیے نئے تھے۔ کراس بائی نے ایک انگریز کا ذکر کیا ہے جس کو لیہہ میں بلندی کی وجہ سے نیند نہیں آئی۔ اس لیے وہ اکثر ایک ہزار فٹ نشیب میں دریائے سندھ کے کنارے سونے کے لیے جایا کرتا تھا۔ اس زمانے میں قصبے میں آکسیجن کی فراہمی کی سہولت نہیں تھی۔

لوپچق مشن

تبت اور لداخ کے درمیان ایک معاہدہ کے تحت لوپچق کے نام سے ایک سفارتی مشن لہاسہ جاتا تھا۔ لوپچق کا لفظی مطلب سالانہ سلام ہے۔ مشن کے ارکان دلائی لاما اور پنچن لاما کے پاس

حاضری دیتے تھے اور حکومت وقت کی طرف سے تحائف پیش کرتے تھے۔ اسی طرح تبت میں تیسرے سال چابا کے نام سے ایک سفارتی مشن لیہہ آتا تھا۔ چابا چائے سے نکلا ہے۔ چابا کے ارکان تبت سے چائے لاتے تھے اسی نسبت سے یہ نام پڑا ہے۔

لوپچق مشن کو اندرون لداخ میں آنے جانے میں ۲۷ روز لگتے تھے اور اس کے لیے ۳۰۰ کے قریب گھوڑے اور دوسرے بار بردار جانور اور کئی قلی مطلوب تھے۔ اسی طرح تبت سے آنے والے چابا مشن کو لداخ میں اٹھارہ منزلوں کے لیے ۲۵۷ گھوڑے اور یاک مفت فراہم کرنے پڑتے تھے۔ ان کے علاوہ کئی کمپنیوں کی طرف سے بھی نجی اور سفارتی مشن بھیجے جاتے تھے۔ لوپچق، چابا مشن کی طرح دوسرے مشنوں کے سامان کی نقل وحمل کے لیے لداخ کے لوگوں کو مفت بار بردار جانور فراہم کرنے پڑتے تھے۔

لیہہ کے اسسٹنٹ ریزیڈنٹ یا جوائنٹ کمشنر نے ۱۹۰۲ میں یہ معاملہ انگریز سرکار کے سامنے اُٹھایا اور لکھا کہ عام لوگوں سے مفت کام نہیں لینا چاہیے۔ ریاستی سرکار کے ساتھ طویل خط وکتابت کے بعد ۱۹۰۴ء میں انگریز سرکار نے یہ فیصلہ دیا کہ لوپچق اور چابا سفارتی مشن کے زیر استعمال آئے بار بردار جانوروں کا کرایہ ان کے مالکان کو کشمیر دربار ادا کرے گا اور پرائیویٹ تجارتی مشن کے اخراجات ان کے مالکان برداشت کریں گے۔

وزیر وزارت کی رپورٹ کے مطابق لوپچق پر ایک بار بردار جانور کے لیے یومیہ چھ آنے کے کرایہ کے حساب سے کل ۲۹۰۵ روپیہ ۱۴ آنے خرچ آتے تھے اور اسی شرح کرایہ سے چابا کے اخراجات ۱۸۶۶ روپیہ ۴ آنے تھے۔

جین۔ای ڈنکن (Jane.E Duncan)

۱۹۰۴ء کی گرمیوں میں لداخ سیاحت پر آنے والی ایک خاتون جین۔ای۔ڈنکن نے اپنا سفرنامہ لکھا ہے۔ وہ بہت سارے انگریزوں کی طرح اردو جانتی تھی۔ اُن ہی دنوں ہمس میلہ تھا۔

میلے پر چار یا پانچ یورپی اور ایک امریکی خاتون تھی۔ چار یورپی انگلستان اسکاٹ لینڈ اور آئرلینڈ سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے علاوہ ایک آسٹریلیاوی بھی تھا۔ امریکی لڑکی مس کینڈل پیشے سے لیکچرار تھی۔

ڈنکن لکھتی ہے: سفر میں وزیر کا اجرا کردہ پروانہ کام آتا ہے، جس میں گھوڑا اور کھانے پینے کی اشیا فراہم کرنے کی ہدایت ہوتی ہے۔'

مصنفہ لکھتی ہے: 'سبھی لوگ مرد، عورتیں اور بچے ماتھے پر ہاتھ لے کر جولے کہتے ہیں۔ لداخ میں پولیس کے صرف تین کانسٹیبل ہیں۔ ایک لیہہ میں تعینات ہے۔ اس کا فریضہ برٹش جوائنٹ کمشنر کے آگے چلنا ہے۔ وہ چور کو پکڑ کر تھانہ لے جاتا ہے...... جو غیر مقامی ہوتا ہے۔

کپتانی پیٹرسن جوائنٹ کمشنر تھا۔ میلے تماشے میں وردی پوش ملازم اس کے سامنے کھڑے رہتے ہیں.......

لداخی انگریزی دواؤں کے لیے ترستے ہیں اور اندھا دھند ان کا استعمال کرتے ہیں۔' مصنفہ ایک ڈاکٹر تھی۔ لوگوں نے اکثر اس سے دوائیاں مانگیں۔

وزیر کی طرف سے لیہہ میں سیاحوں کے لیے ناچ تماشے کا اہتمام کیا جس میں لاموں نے دھارمک ناچ بھی دکھایا۔

لیہہ میں نوادرات کی دو دکانیں تھیں جن میں ایک مالک کا ایک مقامی مسلمان حاجی نصر شاہ تھا۔ دکان کی بہت ساری اشیا لہاسہ اور یارقند سے لائی گئی تھیں۔

موراوین مشن کے ہاسپٹل میں ڈاکٹر شا تھا۔ ڈاکٹر شا نے مصنفہ کو بتایا کہ لیہہ میں شمالی یورپ کی ساری سبزیاں جیسے مٹر پھلی، گوبھی، سلاد، پیاز، گاجر، چقندر وغیرہ اگتی ہیں۔

لیہہ میں جین ڈنکن نے سنا کہ ۱۹۰۵ء میں ایک ہزار ترکی حاجی لداخ کے راستے وطن لوٹنے والے ہیں۔ روس اور جاپان کی جنگ کی وجہ سے یہ لداخ آنے پر مجبور تھے۔ بعد میں پتہ چلا کہ بہت سارے حاجی راستے میں فوت ہوئے۔

مصنفہ چانگ تنگ بھی گئی۔ واپسی پر پانچ اور سیاح لداخ پہنچے تھے۔ ان میں تین عورتیں

تھیں۔لداخ سے ڈنکن بلتستان گئی۔راستے میں پرنس آف Orleans کو دیکھا، جولداخ کے راستے روس جار ہا تھا۔لیہہ سے کئی سرکاری ملازمین پرنس کے انتظامات کے لیے خلنسے آئے تھے۔

برٹش جوائنٹ کمشنر کا خط بنام وزیر

۱۹۰۵ء میں برٹش جوئنٹ کمشنر نے وزیر کے نام ایک خط میں یاددہانی کرائی کہ حسب وعدہ ملازمین سے گاؤں میں دورے کے دوران کسانوں کو کھانے پینے کی اشیا کے دام ادا کرائیں اور گھوڑے وغیرہ کے استعمال کے لیے ان کا کرایہ کسانوں کو دیں۔وزیر اپنے تمام ملازموں کو اس حکم پرعمل کرنے کی ہدایت دیتا ہے۔تحصیلدار اور نائب تحصیلدار کو لکھتا ہے کہ اپنے ماتحتوں سے ان پرعمل کرائیں۔اگر کرایہ یا اشیا کی قیمت ادا نہ کرنے کی کوئی شکایت موصول ہو تو وہ یہ اس کے نوٹس میں لائیں۔

مہاراجہ اور اس کے حکام لداخ میں اپنی آمدنی بڑھانے کے چکر میں رہتے تھے۔کبھی اون کبھی سوڈا (جو نوبراہ میں دستیاب تھا) اور کبھی چھنگ پر ٹیکس عائد کرنے کا منصوبہ بناتے۔کبھی لیہہ میں کسٹم کا دفتر کھولنے کی تجویز رکھتے۔ملازمین اکثر وسط ایشیا کے تاجروں کو ہراساں کرتے تھے اور ان سے روپیہ بٹورنے کے لیے بہانہ ڈھونڈتے تھے۔ایسے میں برٹش جوائنٹ کمشنر مداخلت کرتا تھا جس سے لداخی اور یارقندی مصیبتوں سے بچ جاتے تھے۔

ڈیوڈ فریزر (D. Fraser)

ڈیوڈ فریزر نام کا ایک سیاح ۱۹۰۶ء میں زنسکار سے لیہہ پہنچا۔انہی دنوں مشرقی ترکستان سے تجارتی کارواں پہنچے۔وہ اپنے سفرنامہ میں لکھتا ہے کہ جب کارواں آتا ہے تو لیہہ بازار الف لیلیٰ کی یاد دلاتا ہے۔ان دنوں مشرقی ترکستان سے درآمدات کا ایک تہائی حصہ چرس ہوتی تھی جس کی مالیت ۳لاکھ روپے تھی۔اس پر سو فیصد ٹیکس تھا۔چرس سے پنجاب میں لوگوں پر برا اثر پڑ رہا تھا تب حکومت

نے ٹیکس چار سو فیصد گنا بڑھایا۔

سی۔ایم۔اینریکوئیز (C.M. Enriquez)

اینریکوئیز ۱۹۰۷ء میں لداخ آیا۔ایسا لگتا ہے تب مختلف قومیتوں کی وجہ سے لیہہ میں بڑی ریل پیل اور گہما گہمی تھی۔وہ قدرے مبالغے سے لکھتا ہے: 'لیہہ کے مقابلے کا (Cosmopolitian) شہر نہیں ہے۔اس کے دلفریب بازاروں کی چہل پہل کا منظر فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

........لیہہ کی عورتیں خوبصورتی اور پوشاک میں گاؤں کی عورتوں سے بہتر ہیں۔وہ سبھوں سے کھلتی ہیں اور صاف گو ہیں۔' مصنف نے لداخیوں کی خوش اخلاقی کی تعریف کی ہے اور جسمانی گندگی کی برائی کی ہے........رومی کلیسا اور لداخی لاموں میں کئی باتوں میں یکسانیت پائی ہے اور بتایا ہے کہ گھنٹیاں تسبیح اور تبرکات ایک جیسے ہیں۔

Enriquez کے لیہہ میں قیام کے دوران قحط کا سا عالم تھا اور بازار میں آٹا نایاب تھا۔

سون ہیڈن

سون ہیڈن سویڈن کا ایک سردہ محقق اور مہم جو تھا۔وہ چار مرتبہ لداخ آیا تھا جہاں سے وہ تبت اور وسط ایشیا روانہ ہوا تھا۔اس کی تصنیف (Trans Himalya تین جلدوں میں ان کے مہم جویانہ اور تحقیقی کارناموں پر بصیرت افروز روشنی ڈالتی ہے۔

۱۸۹۸ء میں ہیڈین کو رایل جیوگرافک سوسائٹی نے Founder ایوارڈ اور ۱۹۰۳ء میں وکٹوریہ ایوارڈ عطا کیا۔

ہیڈین لداخ میں آخری مرتبہ ۱۹۰۸ء میں آیا۔اپنی تبت کی مہم کے لیے انھیں لیہہ میں ۲۵ ملازموں کو بھرتی کرنا تھا۔یہ خبر سن کر اس لمبے اور مشکل سفر پر جانے کے لیے لیہہ کے بہت سارے جسمانی طور پر ٹھیک آدمی ہیڈن کے پاس آئے۔بہتوں نے سفارشیں لائی تھیں۔۶۲ سالہ عبدالغفور

نے، جس نے اس سے پہلے یورپیوں کے ساتھ لمبے سفر کیے تھے ہیڈن سے کہا کہ اگر وہ اس کو اس سفر میں نہیں لے گا، تو سردیوں میں اس کے بچے بھوکے مرجائیں گے۔ کارواں لیڈر محمد عیسیٰ کی سفارش پر ہیڈن نے عبدالغفور کو اپنی پارٹی میں شامل کیا۔ عمر رسیدہ آدمی نے اس سفر میں اپنے ساتھ کفن لیا تو محمد عیسیٰ نے قہقہہ لگایا۔ عبدالغفور صحیح وسلامت لوٹا اور ۵۳ سالہ محمد عیسیٰ تبت کے اس سفر میں چل بسا اور وہی کفن ان کے کام آیا۔ یہ واقعہ اس دور کے لداخیوں کی غریبی اور بے روزگاری کو اُجاگر کرتا ہے۔ ہیڈن لکھتا ہے: جب وہ لیہہ سے اپنی مہم پر روانہ ہوا تو بازار میں چند بھکاری ان کے پیچھے پیچھے چلے'۔

ہیڈن لیہہ کے تین امیر تاجر حاجی نصر شاہ، خواجہ غلام رسول اور داوا شاہ کا ذکر کرتا ہے۔ حاجی نصر شاہ کے خاندان میں تقریباً سوافراد تھے۔ لہاسہ، شیگاچے، گرتوق، یارقند اور سری نگر میں ان کے مکانات تھے۔ ان کے بیٹے تجارت کرتے تھے۔ ان کے بڑے بھائی حاجی حیدر شاہ اور عمر شاہ کا انتقال ہوگیا تھا۔ ایک روز ہیڈن برٹش جوائنٹ کمشنر کپتان پیٹرسن کے مشورے پر خواجہ نصر شاہ سے ملنے گیا۔ وہ ایک بڑے کمرے کی پہلی منزل میں اپنے بیٹوں اور پوتوں کے ساتھ بیٹھے تھے۔ بڑی کھڑکی دریائے سندھ کی طرف کھلتی تھی۔ وہاں جتنے صندوق تھے، وہ چاندی، سونے کے سفوف (gold dust) فیروزوں اور مونگوں سے بھرے ہوئے تھے جن کو فروخت کرنے کے لیے تبت لے جانا تھا۔ آدھی صدی سے یہ خاندان لوپچق کی قیادت کررہا تھا۔ خواجہ غلام رسول ان کا بیٹا تھا۔ آرکائیوز ریکارڈ کے مطابق ۱۹۰۲ء میں نصر شاہ کے بیٹے محمد صدیق کو لوپچق مشن کے سربراہ کی حیثیت سے لہاسہ بھیجا گیا۔ تب سے موروثی طور پر اُن کے خاندان کو یہ مراعات جاری رکھی تھی۔ دورِ راجگان کی روایت کے مطابق لداخ کی تجارت پر آرغون کی اجارہ داری تھی اور اُن سے ٹیکس نہیں لیا جاتا تھا۔

ہیڈن لکھتا ہے: نصر شاہ اندرون ایشیا میں مشہور تھا۔ ان کی بڑی عزت کی جاتی تھی۔ جب ہیڈ ین نے مذاقاً نصر شاہ سے پوچھا کہ کیا وہ ان کے ساتھ سفر کرے تو نصر شاہ بولا۔ ایک یورپی کو تبت اسمگل کرنے پر ان سے یہ رعایت چھین لی جائے گی۔

لوپچق سے خواجہ خاندان کو ہر سال ۲۵ ہزار روپیے کا خالص منافع تھا۔

ہیڈن کی خواجہ غلام رسول سے ملاقات مغربی تبت کے سرمائی صدر مقام گرتوق میں ہوئی۔ خواجہ تجارت کے سلسلے میں وہاں مقیم تھا۔ وہ مشرقی ترکستان سے مال منگاتا تھا اور تبت میں فروخت کرتا تھا۔ وہ کئی خانوں والے ایک بڑے تنبو میں سکونت پذیر تھا۔ دیوان خانے میں جہاں قالین بچھے تھے، بخاری جلائی تھی۔ خواجہ اس میں بیٹھا چاندی کے پترے لگے حقے سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ تنبو کے ساتھ ایک اور چھوٹا خیمہ تھا جس میں وہ نماز پڑھتا تھا۔ ہیڈن اور خواجہ نے فارسی میں بات چیت کی۔ ہیڈن لکھتا ہے خواجہ بڑا خوش مزاج اور رہی مذاق کرنے والا تھا۔

خواجہ نے ہیڈن کو قرض پر روپیہ فراہم کیا اور ہیڈن کی سفارش پر برطانوی ہند کے وائسرائے نے خواجہ غلام رسول کو خان بہادر کا خطاب دیا۔ خواجہ غلام رسول اور خواجہ نصر شاہ کی اولاد آج کل امریکہ، انگلستان، پاکستان، کشمیر وغیرہ میں آباد ہے۔

داواشاہ لداخ کا دوسرا بڑا تاجر تھا۔ اُنھوں نے بھی ہیڈن کو مالی امداد کی پیشکش کی۔ داواشاہ کے خاندان نے بھی لوپچق کی قیادت کی تھی۔ لداخ کے راجہ نے ہیڈن کو تبت میں گیانگچے تک بلا رکاوٹ سفر کرنے کے لیے اپنی سرخ چکور مہر ڈال کر سفارشی خط دیا لیکن تبتی افسروں نے اسے نظر انداز کر دیا۔ ان کے لیے ان کے افسر اعلیٰ دیوا جونگ کا حکم اہم تھا۔ اس مہم میں تنڈوپ صتم اچھا شکاری اور تنڈوپ گیالچن داستان گو تھا۔ سفر کے دوران ایک جگہ ہیڈن کو نام بدلنا پڑا اور حاجی بابا نام رکھا۔ ان دنوں لداخی مسلمان گونڈا ٹوپی (کنٹوپ) اور رومی ٹوپی دونوں پہنتے تھے۔ ہیڈن کا انتقال ۲۶ نومبر ۱۹۵۲ کو اسٹاک ہوم میں ہوا۔

چودھری خوشی محمد

چودھری خوشی محمد ۱۹۰۷ سے ۱۹۱۰ تک لداخ میں وزیر وزارت رہے۔ وہ ایک بڑے شاعر بھی تھے۔ وہ گجرات، پنجاب کے رہنے والے تھے۔ کشمیر میں ان کی آمد سے ادبی محفلوں میں نئی جان

آئی۔ ان کی مشہور نظم ''جوگی'' لداخ میں لکھی گئی تھی جس میں لداخ کے قدرتی مناظر کا دلکش نقشہ کھینچا گیا ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ یہ نظم انھوں نے کلکتہ میں کہی تھی۔ اس نظم کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ ایک دفعہ مہاراجہ پرتاپ سنگھ نے چودھری صاحب سے یہ نظم سنانے کی فرمائش کی تھی۔ اس کے چند بند پیش ہیں۔

کل صبح کے مطلع تاباں سے جب عالم بقعہ نور رہا

سب چاند ستارے ماند ہوئے، خورشید کا نور ظہور ہوا

مستانہ ہوائے گُلشن تھی جانانہ ادائے گلبن تھی

ہر وادی وادی ایمن تھی، ہر کوہ پہ جلوہ طور ہوا

سب طائر مل کر گانے لگے، عرفان کی تانیں اڑانے لگے

اشجار بھی وجد میں آنے لگے، دلکش وہ سماع طیور ہوا

تھا دلکش منظر دشت وجبل اور چال صبا کی مستانہ

اس حال میں ایک پہاڑی پر جا نکلا ناظرؔ دیوانہ

۱۹۰۶ء میں چودھری خوشی محمد ناظرؔ نے لداخ کا علاقہ چنگ تھنگ علاقہ دیکھا۔ جہاں بلتستانی بہت کم ہیں۔ کہیں کہیں خانہ بدوش چنگپا قبیلہ بھیڑ بکریاں پالتا ہے۔ ناظرؔ چنگ تھنگ کے ماحول اور مناظر سے متاثر ہوئے۔ اور اپنے تاثرات کا اِظہار ان اشعار میں کیا ہے۔

آ گئے ایسی جگہ ناظرؔ جہاں کوئی نہیں

گردِ رہ کوئی نہیں اور کارواں کوئی نہیں

ہم سفر اپنا بجز آبِ رواں کوئی نہیں

ہم نفس ہمدم بجز بادوزالہ کوئی نہیں

شورِ ناقوس اور آوازِ اذان کوئی نہیں

تفرقہ شیخ و برہمن کا یہاں کوئی نہیں

گل نہیں بلبل نہیں، نسترن سنبل نہیں

مرغِ خوش خواں کا چمن میں آشیاں کوئی نہیں

ناظر آنکھیں بند کر کے اب خدا کو یاد کر

تیرے چشم و گوش کا واقف یہاں کوئی نہیں

اُن دِنوں انگریزی زبان کا چلن بہت کم تھا۔جن الفاظ کے لیے ہم آج انگریزی الفاظ اکثر استعمال کرتے ہیں، تب اُن کے لیے اُردو کے متبادِل الفاظ استعمال کیے جاتے تھے۔جیسے اکاؤنٹینٹ کو فاضل باقی نویس، اکاؤنٹ بک کو بہی کھاتہ، ریکارڈ کیپر کو محافظ دفتر، ایکسائز ڈیوٹی کو محصولِ آبکاری، سیلز ٹیکس کو محصولِ فروخت وغیرہ اِستعمال کرتے تھے۔

خوشی محمد ناظر بعد میں کشمیر میں وزیر مال بنے۔ان کا انتقال ۱۹۴۴ء میں ہوا۔

جاپانی سیاح

ایک جاپانی سپاہیTsuyoshi Hino پہلا جاپانی تھا جس نے پچھلی صدی کے شروع میں لداخ کا سفر کیا۔۱۹۰۷ء میں اس نے کاشغر اور یارقند کی سیاحت کی۔

لارڈ منٹو اور گریٹ گیم

وائسرائے لارڈ منٹو نے خفیہ محکمہ کی رپورٹ کو رد کرتے ہوئے دو روسی کپتان پولوٹ سوف اور ایم اینڈریو کو ۲۱ جون ۱۹۰۷ کو ایک انگریز افسر میجر فیلڈنگ کے ہمراہ سرینگر سے لداخ کے راستے روس لوٹنے کی اجازت دی۔لیہہ پہنچنے پر انڈریو تاجروں سے تبت اور ترکستان کی تجارت سے متعلق معلومات حاصل کرتا ہوا پایا گیا۔وہ ترکی اور فارسی زبانیں جانتا تھا جب کہ کپتان پولوٹ سوف شہیدولہ سے مستق اور تق دومبش کے راستوں سے متعلق معلومات جمع کر رہا تھا۔میجر فیلڈنگ نے ان کے خلاف شکایت کی۔ابھی گریٹ گیم ختم نہیں ہوا تھا اور روس نے اپنی توسیع پسندانہ پالیسی کو خیرباد نہیں کیا تھا۔

تین سال بعد دونوں روسی اہل کاروں نے دوبارہ گلگت سے جانے کی اجازت مانگی۔ اس دفعہ وائسرائے نے ان کی پچھلی سرگرمیوں کی وجہ سے اجازت نہیں دی۔

سر مارک ایرل سٹین

سر ایرل سٹین کے علمی تحقیقی کام اور سائنسی سرگرمیوں کا مرکز کشمیر اور وسط ایشیا تھا۔ ان دونوں خطوں کے درمیان آنے جانے کے لیے ان کو لداخ سے گزرنا پڑتا تھا۔ وہ لداخ کی تاریخ اور ثقافت سے آگاہ تھا۔ وسط ایشیا اور مغربی چین میں انھوں نے ۱۹۰۶ سے ۱۹۰۸ء کے دوران کھدائی کرائی اور نوادرات منظر عام پر لائے۔ تن ہانگ کی گپھائیں دیکھیں۔ کئی گپھاؤں میں مخطوطات اور تصاویر خرید کر لداخ کے راستے برٹش میوزم بھیجیں۔ ڈھائی سال سے زیادہ کچھ مدت کے دوران انھوں نے دس ہزار میل کا سفر کیا۔ اس مہم کے دوران ۲۰ ہزار فٹ بلند برفانی کیون لین سلسلہ ہائے کوہ میں ان کے دائیں پیر کی انگلیاں سڑ گئیں۔ ۳۰۰ میل طے کر کے وہ لیہہ پہنچا، جہاں اس کا علاج ہوا۔ لیہہ میں یہ جان کر سٹین کو بڑی خوشی ہوئی کہ ان کے بھیجے گئے نوادرات کے سو صندوق برٹش میوزم پہنچ چکے تھے۔

سر ارل سٹین کو سنسکرت، فارسی، پشتو اور کشمیری پر دسترس حاصل تھی۔ انھوں نے راج ترنگنی کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ سر ارل سٹین ۲۶ اکتوبر ۱۹۲۳ء کو ۸۱ سال کی عمر میں کابل میں فوت ہوئے۔

لداخی راجہ اور کپتان کومپ بیل اور ڈی۔ جی۔ اولیور

لداخ کے راجہ کے ساتھ لیہہ میں تعینات حکام مناسب برتاؤ نہیں کرتے تھے۔ اس سلسلے میں برٹش جوائنٹ کمشنر کپتان کومپبیل نے مہاراجہ کی سرکار کو چند تجاویز پیش کی تھیں۔ اس ضمن میں اس کے جانشین ڈی۔ جی۔ اولیور نے ۱۳ جون ۱۹۰۸ کو ریاست کے وزیر اعظم کو ایک خط بھیجا، جس میں راجہ کے سماجی مرتبہ کا خیال رکھنے کی ضرورت پر زور دیا۔ کپتان کومپ بیل کی تجاویز کا بھی حوالہ دیا، جس میں ایک تجویز یہ تھی کہ راجہ کو کوئی سرکاری کام ہو تو تحصیلدار کو چاہیے کہ وہ راجہ کا پورا خیال رکھے۔

وزیراعظم نے برٹش جوائنٹ کمشنر کا خط وزیر خارجہ کو بھیجا اور موخر الذکر نے اسے لیہہ کے وزیر وزارت کو برائے رپورٹ ارسال کیا۔ وزیر جواب دیتا ہے کہ لداخ کا راجہ صنم نمگیل ایک بھلا مانس اور خوش اخلاق انسان ہے۔ راجگان بلتستان سے لداخی راجہ کا مرتبہ بلند مانا جاتا ہے۔ لداخی ان کی بڑی عزت کرتے ہیں۔ سال نو وغیرہ کے تیوہار پر راجہ جلوس میں شرکت کرتا ہے۔ ان اخراجات کی وجہ سے راجہ کی مالی حالت خراب ہے اور وہ مقروض ہے۔ ان کو کار سرکار کے لیے وزارت یا تحصیل دفتر میں نہیں بلانا چاہیے۔ اگر عدلیہ کا اہم معاملہ نہ ہو تو وہ اپنا معتبر بھیجنے کا مجاز ہونا چاہیے۔

مہاراجہ نے یہ تجویزیں مان لیں۔ اس دوران وزیر نے تحصیل دار کو ہدایت دی کہ وہ راجہ کے ساتھ عزت سے پیش آئے اور انھیں تحصیل میں کرسی پیش کرے۔

سر والٹر لارنس اور امپیریل گزیٹر آف انڈیا

سر والٹر لارنس لداخ میں ۱۸۵۰ء میں آیا تھا، اس دور کی ان کی کوئی تحریر نظر نہیں آئی۔ ۱۹۰۹ء میں انھوں نے امپیریل گزیٹر آف انڈیا مرتب کیا جس میں لداخ خطّے سے متعلق کئی باتیں لکھی ہیں۔ لیہہ سے سرینگر کا فاصلہ ۲۴۳ میل بتایا ہے۔ لیہہ اور سرینگر کے درمیان کرگل کو ایک دل خوش کن نخلستان قرار دیا ہے۔ آرغون سے متعلق وہ رقم طراز ہے۔ لیہہ کی مخلوط نسل تبت میں غیر تسلی بخش نہیں ہے۔ وزیر وزارت کے محکمہ کا سالانہ خرچ ۹۱۶۶ روپیہ ہے۔ لیہہ اور سکردو میں پرائمری اسکول ہیں۔ (اسی سال ۱۹۰۹ میں ان کو مڈل کا درجہ دیا گیا) بیگار بہت سخت ہے۔ بلتی اور لداخی میں زیادہ فرق نہیں ہے۔ بلتی بڑے صابر اور خوش خصلت ہیں۔ سخت مظالم کے باوجود خوش وخرم رہتے ہیں۔ کرگل اور سکردو تحصیلوں کی کل اراضی سے ایک اعشاریہ چار لاکھ روپیے کا مالیہ ملتا ہے۔ اس رقم میں ایک چوتھائی لگان جنس کی صورت میں لیا جاتا ہے۔ ۱۹۰۹ء میں لیہہ تحصیل میں ۱۶ پٹوار حلقے تھے۔

لداخ میں اگر بیوی کو بچہ نہیں ہے تو وہ اپنے مرحوم شوہر سے طلاق لینے کے لیے اپنی انگلی اور شوہر کی نعش کی انگلی سے دھاگا باندھ کر توڑ لیتی ہے۔ اس طرح وہ آنجہانی شوہر اور دوسرے شوہروں

سے طلاق حاصل کرتی ہے۔

۱۹۱۲ء میں وزارت میں ۲۹ ملازمین تھے ان میں ماسوائے تین یا چار منشی اور چند چپراسی ملازمین کے باقی جموں وکشمیر اور پنجاب سے تعلق رکھتے تھے۔ حتیٰ کہ افغانستان اور پشاور سے آئے ہوئے ملازمین بھی تھے۔ سکردو، کرگل اور لیہہ تحصیلوں میں کل ۱۳۵ ملازمین تھے۔ وزیر کا گریڈ ۲۵۰۔۳۵۰ روپیے تھا جب کہ ایک چپراسی ۶ سے ۸ روپیے ماہانہ تنخواہ لیتا تھا۔

آر۔ آر۔ اسٹیوورٹ

جولائی ۱۹۱۲ء میں امریکہ کا ایک ماہر نباتات آر۔ آر۔ اسٹیورٹ لداخ آیا۔ لداخ میں اس نے پودوں اور جڑی بوٹیوں کا سروے کیا۔ ۱۹۱۳ء میں اسٹیورٹ ایک پارٹی کے ساتھ دوبارہ لداخ آیا۔ لیہہ کرگل کے درمیان دواونچے درے نامی کا اور فوتو لا پر اس نے ۵۴/۴ قسموں کے پودوں کی گنتی کی۔ گلشن لا، ساپی لا اور روسی لا پر ۱۴۵ قسموں کے پودے دیکھے۔ روپشو میں ۱۷۵۰۰ فٹ کی بلندی پر ۶ اقسام کے پودے پائے۔

اسی سفر کے دوران اس نے ۹ ہزار سے ۱۷۵۰۰ کی بلندی پر ۷۵۴ قسموں کے پودوں اور جڑی بوٹیوں کے نمونے جمع کیے۔ لداخ سے وہ پارالاچا سے ہوتا ہوا شملہ گیا۔

اسٹیورٹ نے اپنے سے پہلے لداخ آنے والے ان ماہرین کی فہرست بنائی ہے جنھوں نے لداخ کے پودوں اور جڑی بوٹیوں کے نمونے جمع کیے۔ ان میں شلیے گین وائٹ کے برادران، ولیم ہے، جے ایل اسٹیورٹ ولیم ورک مین اور مسز ورک مین، کونولے، ڈیزی اور رڈی فلیپی شامل ہیں۔ ۱۸۷۳ میں ہنڈرسن اور ہیوم نے جو فورسیتھ مشن کے ممبر تھے ۴۰۰ قسموں کے پودوں کی فہرست مرتب کی تھی۔ ان میں ۲۷۶ قسمیں لداخ میں پائی گئیں۔

ڈاکٹر فیلیپو۔ ڈی۔ فیلیپی (Filippo De Filippi)

ڈاکٹر فیلیپو۔ڈی فیلیپی اٹلی کا ایک نامور محقق تھا۔ وہ ۱۴-۱۹۱۳ء میں بلتستان سے لداخ آیا۔اس نے کرگل میں ڈاک خانہ، تار گھر، سرائے اور ڈوگروں کے قلعے کا ذکر کیا ہے۔تب دریائے سورو پر جھولا پل تھا۔

فیلیپی مارچ کے مہینے میں لیہہ پہنچا۔جب وہ پھاٹک سے بازار میں داخل ہوا تو مہاراجہ کے افسران اور کوشوق کے نمائندے نے استقبال کیا۔

فیلیپی لکھتا ہے:لیہہ بازار کے دونوں طرف پیڑ ہیں۔ بازار پولو گراؤنڈ کے طور استعمال ہوتا ہے ....لیہہ ایک چھوٹا سا(Cosmopolitan) شہر ہے جہاں مختلف طبقوں اور زمروں کے شہری رہتے ہیں ....لداخی عورتیں چہرے کی اچھی رنگت کے لیے بیلاڈونا بیری کے بیج اور اس کا گودا استعمال کرتی ہیں۔

فادری ڈیزی ڈیری کے حوالے سے وہ لکھتا ہے۔لداخی بالکل مغرور نہیں ہیں۔وہ بھلے مانس، ہشاش بشاش اور حلیم ہیں۔

تاریخی تناظر میں آغون سے متعلق وہ رقم طراز ہے: آغون نام مشرقی ترکستان میں عام مستعمل ہے۔یہ لوگ چینی اور ترکی نسلوں کی اولاد ہیں۔یہ قدیم نام ہے۔مارکو پولو نے بھی آغون کا ذکر کیا ہے جو جنوب مشرقی منگولیا میں آباد تھے اور بودھوں اور مسلمانوں کی مخلوط النسل تھے۔

ڈاکٹر فیلیپی کے مطابق لیہہ ضلع کے ۱۰۸ گاؤں میں چھوٹے اور بڑے ۱۷۰ گمپے ہیں۔

فیلیپی لیہہ میں ایک گوشہ نشین لاما سے ملا۔وہ ایک پہاڑی پر ایک چھوٹی سی کٹیا میں رہتے تھے۔ ایک بلی اس کی واحد ساتھی تھی۔لداخ میں وہ مے ژھنگسپا کے نام سے جانے جاتے تھے۔

مصنف نے گلوان رسول کو ایک قابل ترین اور بہترین کارواں لیڈر قرار دیا ہے جو فیلیپی کے مطابق تبتی، انگریزی، فارسی اور ترکی زبانیں جانتا تھا۔

لیہہ میں فیلیپی نے کھیل تماشے اور گنپوں کے دھارمک رقص 'چھم' دیکھے۔اس نے ستورلوق کا میلہ دیکھا، جس میں بدی کی علامت ایک پتلے پر گولیاں چلائی جاتی تھیں اور پھر نذر آتش کیا جاتا تھا۔

یہ میلہ قدرتی آفات، لڑائیوں اور بیماریوں سے محفوظ رہنے کے لیے ہر سال منایا جاتا ہے۔

مصنف لکھتا ہے۔ انھیں دنوں نومبر میں سکردو میں چند غبارے چھوڑے گئے، جو مغربی تبت میں رُودوق میں اترے۔ لوگ گھبرائے اور لاموں نے لمبی پوجا کی۔

ایف۔ ای۔ پیٹر پندرہ سال سے لیہہ میں پادری تھے۔ انھوں نے لداخ کے بہت سارے گاؤں پر تحقیقی کام کیا ہے اور ان کی وجہ تسمیہ بتائی ہے۔

گیوٹو ڈینے لی (Giotto Dainelli)

گیوٹو ڈینے لی ڈاکٹر فیلیپی کا ہم سفر تھا۔ وہ بھی اطالوی تھا۔ اپنے سفرنامہ 'بلتستان اور لداخ کے درمیان'' میں کرگل سے متعلق لکھتا ہے'' کرگل ہندوستان اور وسط ایشیا کے درمیان تجارتی راستے پر ایک اہم پڑاؤ ہے۔ یہاں سے سکردو، زنسکار اور لیہہ راستے جاتے ہیں............ پہاڑی کی طرف سرائے، ڈاک اور تار گھر، ایک بڑا عمدہ بنگلہ اور وزیر وزارت کا ایک چھوٹا عمدہ مکان ہے۔ اس سے ذرا آگے مشرقی جانب سے دریائے سورو میں معاون دریا گرتا ہے۔ اس کے نزدیک دریا کے بائیں کنارے ڈوگروں کا ایک بڑا قلعہ ہے، جہاں ایک عمدہ مرمت شدہ جھولا پل سے پہنچتا ہے۔''

ڈینیلی نے درد قبیلے کے اعتقادات، شکل وشباہت، لباس وغیرہ سے متعلق بھی لکھا ہے۔

پنڈت جواہر لال نہرو

پنڈت جواہر لال نہرو نے ۱۹۱۶ء میں کشمیر کے پہاڑوں میں چند ہفتے گزارے تھے۔ وہ دراس تک آئے تھے۔ زوجی لا کی چوٹی سے لداخ کے ننگے پہاڑوں کو دیکھ کر وہ بڑے جذباتی ہوئے۔ اپنی سوانح حیات میں وہ لکھتے ہیں۔ 'وہاں فقط ننگی چٹانیں، برف اور یخ تھا۔ کہیں کہیں دل آویز پھول کھلے تھے۔ تاہم مجھے قدرت کے ان ویران اور ننگے گھواروں میں ایک عجیب اطمینان ملا اور میں نے ایک بھرپور طاقت اور طمانیت محسوس کی۔'

پنڈت جی دراس کے ڈاک بنگلے میں ٹھہرے تھے۔ وزیٹر بک میں ایک انگریز کپتان ماننگ وائٹ نے ۱۸ ۱۱ اکتوبر ۱۹۱۲ء کو لکھا تھا۔ 'جس مقامی آدمی نے اس بنگلے کا نقشہ بنایا ہے اور لوگوں کا پیسہ ضائع کیا ہے اسی سے یہ خریدوانا چاہیے۔'

پنڈت جی اس کے چند سال بعد آئے تھے اور اُنھوں نے ماننگ وائٹ کا نوٹ پڑھا اور اس میں ان جملوں کا اضافہ کیا۔ 'کپتان وائٹ کی رائے زنی کی روشنی میں ریاست کے اس انگریز انجینئر کو، جس نے یہ بنگلہ بنوایا، کم سے کم ایک ماہ اس میں رہنے دینا چاہیے۔'

اشبوروکے کرمپ (Ashbrooke Crump)

اشبوروکے کرمپ ۱۹۱۸ء کی گرمیوں میں لداخ آنے والے سیاحوں میں ایک سیاح خاتون تھی۔ وہ جولائی میں لداخ پہنچی۔ دوسرے سیاحوں نے اپنی سیاحت کی سرگزشت نہیں لکھی۔ اس لیے ہم ان کے تاثرات سے متعلق نہیں جانتے۔ کرمپ نے اپنی سرگذشت میں لکھا ہے۔ 'لداخی بڑے خوش وخرم رہتے ہیں۔ ہمارے قافلے کے افراد خوش طبع اور خوش مزاج ہیں اور خوش الحانی سے گاتے ہیں۔'

لداخی سبزیوں کو وہ ایشیا میں بہترین بتاتی ہے۔

نائٹ کا حوالہ دے کر اس نے راستے سے متعلق لکھا ہے کہ راستہ اتنا خراب ہے کہ رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔

ہیلن میری بولنوئیس (H.M.Boul Nois)

ایک خاتون سیاح ہیلن میری بولنوئیس اپنے شوہر، پانچ سالہ بچی اور چھ ماہ کے دودھ پیتے بچہ سمیت سیاحت پر لداخ آئی۔ وہ کشمیر سے آئی تھی۔ کرگل پہنچنے پر وہ لکھتی ہے: 'آخر کار ہم سبز نخلستان پہنچے۔ ایک چھوٹا ٹکڑا اٹلی جیسا تھا۔ یہیہ آنے سے پہلے وہ سید ھے ہمس میلہ دیکھنے گئے جہاں سے

۵ جولائی ۱۹۲۲ء کو وہ لیہہ پہنچے۔ اپنے سفرنامہ (Into little Tibet) میں بولنوئیس لکھتی ہے: 'لیہہ بازار خالی خالی سا تھا۔ کارواں کا موسم نہیں تھا۔ بازار میں تبتی اینٹ چائے، تانبے کی چائے دانیاں، چاندی کے پترے جڑے لکڑی کی پیالیاں، لاموں کی گھنٹی، مالا، کشکول، پر پر وہیل وغیرہ دستیاب ہیں۔ ان کے علاوہ ایک انسانی کھوپڑی بھی فروخت کے لیے رکھی ہے۔'

مصنفہ نے اپنی کتاب میں ڈاکٹر فرانکی اور کرنل واڈل کی کتابوں کا بہت حوالہ دیا ہے۔ ایسے کئی سفرناموں میں فرانکی اور دوسرے تاریخ دانوں کی کتابوں کے اقتباسات دیئے گئے ہیں۔

اس دوران لداخ کے وزیر کی طرف سے یوروپیوں کی تفریح کے لیے ایک تماشہ کا انتظام کیا جاتا ہے۔ مصنفہ کو بھی مدعو کیا جاتا ہے۔ دعوت نامے کے ساتھ تماشے کا پروگرام منسلک ہے۔ قارئین کی دلچسپی کے لیے ہم یہاں پروگرام کی تفصیلات پیش کرتے ہیں۔

۱	دُعا اور ڈراما (اسکول کے بچے پیش کریں گے)	دن کے ۳ بجے سے ساڑھے تین بجے
۲	بچوں کا کھیل	ساڑھے تین بجے سے ۴ بجے
۳	چائے	۴ بجے سے ساڑے ۴ بجے
۴	چھمز (لاموں کا مذہبی رقص)	ساڑھے ۴ بجے سے ۶ بجے
۵	آرام	۶ بجے سے ساڑھے ۸ بجے
۶	ڈنر	۸ بجے سے ساڑھے ۹ بجے تک
۷	لمبے آدمی کا ناچ	ساڑھے ۹ سے ۹ بج کر ۴۰ منٹ
۸	مور ناچ	۹ بج کر ۴۰ منٹ سے ۹ بج کر پچاس منٹ
۹	شیر ناچ	۹ بج کر ۵۰ منٹ سے ۱۰ بج کر ۵ منٹ تک
۱۰	سانپ (غالباً اژدھا (Dragon) ناچ ہوگا)	۱۰ بج کر ۵ منٹ سے ۱۰ بج کر ۲۰ منٹ تک
۱۱	بوڑھا آدمی اور بٹیا	۱۰ بج کر ۲۰ منٹ سے ۱۰ بج کر ۲۵ منٹ تک

۱۲	گھوڑ سواری		۱۰بج کر ۲۵منٹ سے ۱۰بج کر ۴۰منٹ تک
۱۳	کشمیری پنڈت		۱۰بج کر ۴۰منٹ سے ۱۰بج کر ۵۵منٹ تک
۱۴	مور ہٹی		۱۰بج کر ۵۵منٹ سے ۱۱بج کر ۵منٹ تک
۱۵	تلوار ناچ		۱۱بج کر ۵منٹ سے ۱۱بج کر ۱۰منٹ تک
۱۶	کشتی اور امبان		۱۱بج کر ۱۰منٹ سے ۱۱بج کر ۲۰منٹ تک

تماشے کا مذکورہ پروگرام ہندوستان کی آزادی ملنے تک کم وبیش قائم رہا، جو برٹش جوائنٹ کمشنر اور دوسرے مہمانوں کو وقتاً فوقتاً دکھایا جاتا تھا۔ بعد میں ان میں چند آئیٹم منہا کیے گئے اور ان کے بدلے میں نئے آئیٹم کا اضافہ کیا گیا۔ کئی سیاحوں نے بڑے چاؤ سے اس تماشے کا تذکرہ کیا ہے۔ مور ناچ، شیر ناچ، اژدھا ناچ اور کشتی اور امبان چین کی دین ہیں۔ موخرالذکر تین ناچ قلم رسول اور ان کے ساتھیوں نے کاشغر میں دیکھے تھے اور پہلے پہل لیہہ میں رسول گلوان کی شادی پر دکھائے۔ ان تماشوں کو دیکھنے کے لیے لداخی بڑھ چڑھ کر آتے تھے۔ قلم رسول اور رسول لداخ کے مہم جو آرغون تھے۔

لیلین اے۔ سٹار (Lilian A. Starr)

۱۹۲۲ء کی گرمیوں میں ایک اور خاتون سیاح لیلین اے۔ سٹار لیہہ پہنچی۔ زوجی لا پر اس نے گھوڑے پر سوار ۵۷ قسموں کے خودرو پھول گنے۔ لیلین نے زوجی لا کو Rock Garden کہا ہے۔ ڈاک ہرکاروں کے لیے درے پر ہٹس بنے تھے۔

لیلین نے خردونگ درہ پر کئی اقسام کے پھول دیکھے لیکن یہ بکھرے بکھرے تھے۔

لیہہ میں ایک شام ریزیڈنٹ کے اعزاز میں وزیر کی طرف سے ایک تماشے کا اہتمام کیا گیا۔ لیلین نے بھی یہ تماشہ دیکھا۔ پروگرام وہی تھا، جس کا ذکر پہلے آیا ہے۔ تماشا گاہ میں کوشوق (بڑے لاما) اور راجہ کے لیے الگ شامیانہ تھا۔ ہندو اور مسلمان ملازموں کے لیے الگ شامیانے تھے۔ تماشا

گاہ کے درمیان میں الاؤ جلایا گیا تھا، جس پر بار بار مٹی کا تیل چھڑکا جاتا تھا۔ اس کی روشنی سے سارا ماحول جگمگا اُٹھتا تھا۔ بقول لیلین ایک لحاظ سے روپیہ جلایا جارہا تھا کیونکہ پنجاب اور کشمیر سے ایک ٹین مٹی کا تیل ۲۰ ڈالر میں لداخ پہنچتا تھا۔

اُن ہی دنوں پھیانگ گنپہ کے لامے جموں سے لیہہ پہنچے تھے، جہاں ان کو پرنس آف ویلز کو چھمز دکھانے کے لیے لیا گیا تھا۔

پھر لداخ سے واپس جانے کا دن آیا۔ لیلین اے۔ اسٹار حسرت سے کہتی ہے: 'افسوس! ۱۲ اگست کو ہمیں واپسی سفر پر دوبارہ روانہ ہونا پڑا۔'

تھیوڈر روزویلٹ اور کرمیت روزویلٹ

امریکی صدر فرینک لین روزویلٹ کے دو بیٹے تھیوڈر روزویلٹ اور کرمیت روزویلٹ شکار کے لیے لداخ آئے جہاں سے وہ یارقند گئے۔ دونوں بھائیوں نے East of the Sun and West of the Moon (مطبوعہ ۱۹۲۶ء) کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے، جس میں اس سفر کا ذکر ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ہم لداخ کے علاقے میں پہنچے تو عورتیں اور مرد جولے جولے کہنے لگے۔ لیہہ بازار میں ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں حقہ پہنچایا جاتا تھا اور حقہ نوش کش پر کش لگاتے تھے۔

خواجہ عبداللہ شاہ اقسقال تھے، جو برٹش جوائنٹ کمشنر کے تحت وسط ایشیا کے تجارتی امور کا افسر اعلیٰ ہوتا تھا۔

لیہہ میں ان کے لیے ایک تمدنی پروگرام کا اہتمام کیا گیا، جس میں ایک گلگتی نے تلوار ناچ دکھایا۔

سری نگر سے آتے ہوئے نورلا گاؤں میں اُنھوں نے ''منے پاشو'' دیکھا۔

بی اوسمسٹن (B. Osmeston)

۱۹۲۳ء میں بی اوسمسٹن نام کا ایک مغربی ماہر طیور لداخ آیا۔ اس نے لداخ میں دیکھی گئی

۶۷ اقسام کے پرندوں کی فہرست بنائی ہے۔ وہ غالباً پہلا ماہر تھا، جس نے لداخ کے پرندوں کا سروے کیا۔ اس کی فہرست کے چند پرندوں کے اُردو نام ملاحظہ ہوں: چنڈول، ناری، اسھلی، چاہا، تیتر، دھوبن، کوئل، تیہاری، کری، کالا باز، مندہ، طوطی، رام گنگرا، دیا، دھومرا، عقاب، ابابیل، سنبل وغیرہ۔ ان میں مقامی مقیم پرندے بہت تھوڑے ہیں۔ پرندوں کی بھاری اکثریت نقل وطن کر کے گرمیوں کے چند مہینوں کے لیے لداخ آتی ہے۔ حال میں سیکڑوں اقسام کے پرندوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ ۱۹۳۰ء کی دہائی میں او سسمٹسن پرندوں کا مطالعہ کرنے دوبارہ لداخ آیا۔ اس کے ساتھ ایک اور ماہر طیور Meinertzhagen بھی تھا۔

الیگزینڈر ڈیوڈ نیل (Alexandra David Neel)

تبت میں کمیونسٹ حکومت قائم ہونے سے پہلے لداخ سے متعدد بودھ مذہبی تعلیم حاصل کرنے اور یاترا پر لہاسہ جاتے تھے۔ کئی بودھ مذہبیات میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری لے کر لداخ لوٹتے تھے۔ کچھ لوگ وہاں مستقل بس جاتے تھے۔ چند مسلمان تجارت کے سلسلے میں تبت آتے جاتے تھے۔ لیہہ سے لہاسہ تین ماہ کا سفر تھا۔ ہر لداخی کے لیے تبت کھلا تھا۔ اس کا فائدہ اُٹھا کر انگریزوں نے تبت اور یار قند جاسوس بھیجے، جس کا ذکر اوپر آیا ہے۔

لداخیوں کے تئیں تبتیوں کی نظروں میں اپنی ایک شبیہ ہے۔ ذیل کا واقعہ اس ضمن میں ایک مثال ہے۔ الیگزینڈر ڈیوڈ نیل ایک فرانسیسی عورت تھی۔ وہ بدھ مت کی باطنی تعلیمات کی جویا تھی اور بھکشونی کی تربیت پائی تھی، لیکن یوروپیوں کے لیے تبت ایک ممنوعہ علاقہ تھا۔ ۱۹۲۳ء میں سکم کے ایک لاما یونگدن کے ہمراہ یاتری بن کر وہ لہاسہ پہنچی۔ اس نے اپنے چہرے اور بالوں کو سیاہ نایا تھا اور پھٹے پرانے کپڑے پہنے تھے جس کے اندر ایک ریوالور چھپا تھا۔ اپنا تجربہ وہ یوں بتاتی ہے۔ 'پوتالا کا درشن کر کے جب میں نیچے اتر رہی تھی تو مجھے دیکھ کر ایک آدمی نے اپنے ساتھیوں سے پوچھا، تمہارے خیال میں یہ کہاں سے آئی ہے؟ اس آدمی نے خود اس کا جواب دیا۔ 'یہ ایک لداخی

ہونی چاہیے۔'ڈیوڈ نیل تبتی زبان جانتی تھی۔

'دوسری مرتبہ جب میں چوکھنگ دیکھ رہی تھی،' تب بھی مجھے لداخی سمجھا گیا۔ کسی نے پیچھے سے کہا۔ اس عورت کو پوتر پانی دو۔ بچاری دور لداخ سے آئی ہے۔ اس کی گہری عقیدت کو دیکھو۔ میں نے اپنے گرد مسکراتے چہرے دیکھے۔ ایک آدمی میرا بازو پکڑ کر لے گیا اور ہیرے جڑے ایک برتن سے پوتر پانی پلایا۔''

ایک کتاب Five women Explorers میں اس کا نام ہے'ان عورتوں نے صبر آزما اور مشکل حالات میں تبت کا سفر کیا تھا۔ اپنے شوہر سے لمبی جدائی کے ان ایام میں اس نے اس کو تین ہزار خطوط لکھے تھے۔

پی ایس نازاروف

اگست ۱۹۲۴ء میں ایک روسی پی ایس نازاروف کاشغر سے لداخ کے لیے نکلا۔ اس نے روس میں کمیونسٹوں کے خلاف بغاوت میں حصہ لیا تھا اور وہاں سے فرار ہوا تھا۔ نازاروف نے اپنے سفرنامہ میں اپنے مشاہدات کا تذکرہ کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے: 'عورتوں کے علاوہ چھوٹی چھوٹی لڑکیاں بھی پیرق پہنتی ہیں۔ حتی کہ ۶،۵ سال کی بچیوں کے سر پر پیرق تھے۔' یہ بچیاں پیٹھ پر چھوٹی چھوٹی ٹوکریاں اُٹھائے درختوں سے گرے پتّے جمع کر رہی تھیں۔'

نازاروف لکھتا ہے: 'پیالی ایک لداخی کے ساتھ ہمیشہ رہتی ہے۔ غریب لوگوں کی پیالی خالص چوبی ہوتی ہے جب کہ خوش حال لوگوں کی چوبی پیالی پر چاندی کا پتر الگا ہوتا ہے یا یہ خالص چاندی کی بنی ہوتی ہے۔ چمچی بھی ساتھ ہوتی ہے' جو کمر بند سے باندھی رہتی ہے۔ اس پر نقش ونگار بنے ہوتے ہیں۔ زنانہ اور مردانہ چمچی الگ ہوتی ہے۔ چمچی پانچ یا چھ انچ لمبی ہوتی ہے جس کا نچلا حصہ شوربہ یا چائے پینے کے لیے استعمال ہوتا ہے اور بالائی حصہ ستو گھولنے کے لیے کام آتا ہے۔'

لداخی پھولوں کے شوقین ہیں۔ اپنی ٹوپیوں پر پھول لگاتے ہیں۔

ذاتی صفائی سے یہ غافل ہیں لیکن اپنے گھروں، گلیوں اور باغوں کو بہت صاف ستھرا رکھتے ہیں۔

۱۲۴ اکتوبر کو نازاروف کرگل پہنچتا ہے اور اپنے تاثرات یوں لکھتا ہے: "ہمیں یہاں بھی دیانت دار اور نیک خصلت لوگوں سے پالا پڑا۔" کشمیر جاتے ہوئے نازاروف کو T (ٹی) شکل کے ڈنڈے پر سامان اُٹھاتے بلتستان کے بلتی نظر آئے، جو معاش کی تلاش میں شملہ جا رہے تھے۔

کرنل منرٹزہیگن (R. Meinertz Hagen)

کرنل منرٹزہیگن R. Meinertz Hagen ۱۹۲۵ء کے موسم گرما میں حیواناتی زندگی دیکھنے کے لیے لداخ وارد ہوا۔ بعد میں اُنھوں نے ایک علمی مجلس میں دو قسطوں میں اپنا مضمون پڑھا۔ مضمون جیوگرافیکل جرنل میں شائع ہوا ہے۔ ان کے مشاہدے کے مطابق لیہہ میں ساری سرگرمیاں بازار، گنپوں اور شاہی محل کے گرد گھومتی ہیں۔

ہمس کے بڑے لاما کوشوق ستق سنگ راسپا سے کرنل کی ملاقات ہوئی۔ وہ لکھتا ہے کوشوق ستق سنگ راسپا ذہین اور خوش اخلاق بزرگ تھے۔ ان کے پاس کیمرہ، برقی ٹارچ سمیت کئی جدید چیزیں تھیں۔ اُنھوں نے بہت ساری ٹکٹیں بھی جمع کی تھیں۔

لیہہ سے کرنل اور اس کے ساتھی چنگ چھنمو اور پھر نوبراہ اور ساسیر گئے۔ چنگ چھنمو میں اُنھوں نے ژوس (Antelope) جنگلی گدھے اور نیان دیکھے۔ کرنل نے ژوس کو قابو میں لانے سے متعلق ایک لداخی سے سنی سنائی ایک انوکھی روایت کا ذکر کیا ہے۔ قدیم زمانے میں کوئی لداخی چنگ چھنمو میں ژوس کا شکار کرنے آتا تو اپنے ہمراہ ایک کنواری لڑکی کو لاتا تھا۔ لڑکی کو دیکھ کر ژوس موم ہو جاتا تھا اور اپنا سر اس کی گود میں ڈالتا تھا۔ اس طرح یہ آسانی سے پکڑا جاتا تھا۔

کرنل نے چنگ چھنمو میں دو برفانی چیتے دیکھے۔

علاقے میں بلندی کے اثرات کا ذکر کرتے ہوئے کرنل لکھتا ہے کہ بھوک جاتی رہی، نیند کم آئی اور اعصابی نظام متاثر ہوا اور وزن ۱۶ پونڈ کم ہو گیا۔ وہ زیادہ تر سیال خوراک کھاتا تھا۔

کرنل رقم طراز ہے۔'لداخ میں ملیریا، تشنج (Tetanus) اور ہیضہ جیسے امراض شاذونادر ہوتے ہیں۔ کینسر لگ بھگ نہیں ہوتا۔ (آج کل کینسر کی وارداتیں بہت بڑھ گئی ہیں)

مغربی لداخ میں ٹیم نے ۱۹ قسموں کی تتلیاں پکڑیں۔ بقول کرنل جو خطے سے مخصوص ہیں ان میں صرف ایک قسم ہندوستان میں اور چار ہمالیائی علاقے میں پائی جاتی ہیں۔ اسی طرح لداخ سے مخصوص ۸۸ پھول دار پودے جمع کیے۔

ایم ایل اے گومپرٹس (M.L.A. Gompartz)

۱۹۲۰ء کی دہائی میں ایک انگریز فوجی افسر میجر ایم ایل اے گومپرٹس المعروف گنپت لداخ آیا۔ گنپت نام اس کے ماتحت ہندوستانی سپاہیوں نے رکھا تھا، جب وہ ایک پیدل رجمنٹ میں سیکنڈ لیفٹیننٹ تھا۔ وہ لداخ کا سچا عاشق تھا۔ اس کی دو کتابیں The Magic Ladakh اور Road to Lamaland اس دور کے لداخ کا نقشہ پیش کرتی ہیں۔ وہ دو دفعہ یا اس سے زیادہ مرتبہ لداخ آیا لگتا ہے۔ ایک مرتبہ اس نے پورے چھ مہینے لداخ کی سیاحت کی۔ سفر کے اختتام پر وہ لکھتا ہے، 'خوش قسمتی سے میں ایک کیمرہ اور ٹائپ رائیٹر کے ساتھ لداخ کی چھ ماہ سیاحت کر پایا ہوں۔' لداخ اور جادو کا لفظ بہتوں کی زبان پر رہا ہے۔ گنپت کی کتاب The Magic Ladakh ۱۹۲۸ء میں شائع ہوئی۔

وہ لکھتا ہے: 'میرے لیے عمومی طور پر بالائی برف اور خصوص طور پر لداخ دلکشی رکھتا ہے جس کی کشش سے میں پامال ہو جاتا ہوں۔ دوسرے لوگ بھی ان ہی تجربات سے گزرتے ہیں۔'

گنپت لداخیوں سے متعلق اپنے تاثرات ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔ 'میری نظر انتخاب میں لداخیوں میں تین خصوصیتیں سب سے نمایاں نظر آتی ہیں۔ خوش رہنا، دیانت داری اور کام کرنے کا جذبہ۔ گرمی اور سردی میں یہ ہنستے ہنستے محنت و مشقت کریں گے۔ بھاری بوجھ اُٹھا کر لمبے فاصلے طے کریں گے۔ تھوڑی سی خوراک اور معمولی سے آرام پر وہ جیتے ہیں۔ جس معنی میں ہم آرام

وآسائش کو لیتے ہیں، وہ ان سے بالکل ناواقف ہیں۔ چاہے وہ امیر ہوں یا غریب۔ حتی کہ لداخ میں امارت کا جو مفہوم ہے، انگلستان میں اس سے مراد غریبی ہوگی۔'

ہیبر کے تاثرات کو دہراتا ہوا وہ The Road to Lama Land میں لکھتا ہے: 'لداخ آنے والے زیادہ تر لوگ محقق، سائنسداں، فنکار، قلمکار اور منتظم ہوتے ہیں۔ پادری ہیبر کے پاس لداخ آنے والوں کا ایک آٹوگراف البم تھا، جس میں بڑے دلچسپ نام تھے۔'

لداخ کی معاشی حالت سے متعلق اس کا خیال مثبت ہے اور اس میں تضاد بھی پایا جاتا ہے۔ وہ لکھتا ہے: 'لداخ ایک خودکفیل خطہ ہے۔ یہ ہر چیز پیدا کرتا ہے.........لداخ غریبی نہیں جانتا۔ میں نے یہاں کوئی بھکاری نہیں دیکھا۔ کوئی بچہ بے سہارا نہیں ہے۔'

اس کے مشاہدے کے مطابق لیہہ میں ان دنوں کوئی نانبائی نہیں تھا۔ گھر میں بنی روٹی، مربّہ اور مکھن کا استعمال ہوتا تھا۔

وہ رقم طراز ہے: 'لداخ کے ایک دیہاتی کی زندگی سڑک اور اس کے کھیتوں کے درمیان گزرتی ہے۔ وہ دھرتی کا پروردہ ہے اور زمین اس کی زندگی میں رچی بسی ہے۔ کتابوں، فلموں، سیاستدانوں، ہڑتالوں، تالہ بندیوں اور دوسرے بے شمار فوائد سے یہ بے خبر ہیں ـــــــ یہ فصلوں اور اپنے مویشیوں کے مسائل میں مستغرق رہتا ہے۔'

گنپت نے لکھا ہے: 'لداخ میں دیہات صدیوں تک ایسے ہی رہیں گے۔ یہاں پہاڑوں کی وجہ سے جہاز اتر نہیں سکتے۔ گاڑی نہیں جا سکتی' (گنپت کا یہ اندازہ اس کی کتاب The Magic Ladakh چھپنے کے بیس سال بعد غلط ثابت ہوا ہے، جب لیہہ میں ہوائی جہاز اترا اور دو سال بعد قصبے میں کم سے کم ایک جیپ چلتی تھی)

گنپت کے مطابق ان دنوں صرف کرگل اور لیہہ میں دُکانیں تھیں۔ راستے میں دودھ، انڈے اور چوزے کے سوا کچھ بھی نہیں ملتا۔ کرگل قصبہ میں مٹی کا تیل، ماچس، بمبئی اور مانچسٹر کے سوتی کپڑے دستیاب ہیں۔' رنگ برنگ پہاڑوں کے پس منظر میں اس کو کرگل دلفریب لگا۔

پشکیوم کو گنپت نے اس کی بنجر بھوری پہاڑیوں اور برفانی نالوں کی وجہ سے جواہر اور زمردی رنگ کا قیمتی پتھر کہا ہے۔

وہ رقم طراز ہے: 'مالا پھیرتے، پریر وہیل گھماتے، رسی بانٹتے مرد اور اون کاتتی ہوئی عورتیں عام نظر آتی ہیں..........عورتیں تکلی پر اون کاتتی ہوئی چلتی ہیں'۔

میلے میں جب تبّتی (لداخی) عورتوں کو آئینہ، ماچس وغیرہ دکھائے جاتے تو حیران ہو جاتی تھیں۔ گنپت نے چقماق سے آگ بنانے کی بڑی کوشش کی لیکن کامیاب نہیں ہوا لیکن ایک لداخی نے تین دفعہ رگڑنے پر چنگاری پیدا کی۔

مصنف نے لداخ میں مکہ معظّمہ سے حج کر کے آنے والے بہت سارے یارقندی دیکھے اور سفر کے دوران راستے میں مرنے والے مسافروں کی قبریں نظر آئیں۔ اس نے لداخ آنے والے مختلف قومیتوں کے لوگوں کا ذکر کیا ہے۔

ری صاحب یا پہاڑی صاحب

۱۹۲۰ء کی دہائی میں تین انوکھے اور دلچسپ یوروپی لداخ آئے۔ ان میں ایک عورت تھی۔ کچھ لوگ اُنھیں امریکی بتاتے ہیں۔ تینوں دسمبر سے مئی تک تقریباً چھ مہینے لیہہ کی پہاڑی پر ایک تنبو میں رہے جس میں گرمی کے لیے بنجاری جلائی جاتی تھی۔ وہ بہت کم قصبے میں آتے تھے اور پہاڑی کے اوپر سے قصبے کا نظارہ کرتے تھے۔ ان کی کتاب خطوط پر مشتمل ہے، جو ''ژھمسکنگ'' یا ''خانۂ گوشہ نشین'' کے پتہ سے اُنھوں نے اپنے احباب اور عزیزوں کو لکھا ہے۔ خطوط کا یہ مجموعہ ۱۹۲۷ء میں Himalayan Letters of Gypsy Davy andLady Ba کے نام سے چھپا ہے۔

ماضی قریب تک لیہہ میں بہت سارے بزرگوں کو پہاڑی پر ان کے رہنے کا واقعہ اچھی طرح یاد تھا اور یہ ری صاحب یا ''پہاڑی صاحب'' کے نام سے مشہور تھے۔

سخت سردی میں یہ پہاڑی کی بلندی پر کیوں رہے؟ لیہہ کے باشندوں کے لیے یہ ایک

بڑا سوالیہ نشان تھا۔ لیہہ کے اکثر لوگ کہتے تھے کہ قصبے کے ایک تارک الدنیا بھکشو نے اپنی روحانی طاقت سے ان کو سونے کا ایک ہرن دکھایا تھا اور وہ اسی سراب کی تلاش میں وہاں ٹھہرے تھے جب کہ پڑھے لکھے لوگ کہتے تھے کہ یہ یورینیم کی تلاش میں پہاڑ پر مقیم ہیں۔

اپنے خطوط میں اُنھوں نے لکھا ہے کہ لداخی ان دنوں لین دین میں کرنسی نوٹ پسند نہیں کرتے تھے اور چاندی کے سکّے مانگتے تھے۔ فیروزہ، اون وغیرہ ان کے لیے اہم تھے۔ مسلمان فیض کیپ پہنتے تھے۔ چنگپا اور یارقندی تاجر زبان استعمال کیے بغیر ایک دوسرے کی آستینوں میں ہاتھ ڈال کر گھوڑے اور دوسرے قیمتی مال کی قیمتیں تعین کرتے تھے۔ اس کے لیے خاموش انگلیاں استعمال کی جاتی تھیں۔

نکولس رور یک

۲۶ اگست ۱۹۲۵ء کو روسی نژاد کے بین الاقوامی شہرت کے مصور نکولس روریک اپنی پارٹی کے ساتھ لیہہ پہنچا اور ۱۹ ستمبر تک رہا۔ روریک اور اس کی پارٹی کے افراد پہاڑی کی بلندی پر واقع محل میں ٹھہرے، جو قصبے کا خوبصورت نظارہ پیش کرتا ہے۔

روریک نے اپنے سفر نامہ میں ہمس گنپہ کے مجوزہ مخطوطہ میں غیر معمولی دلچسپی دکھائی ہے، جس میں ہندوستان اور تبت میں حضرت عیسیٰ کی آمد کا ذکر ہے تاہم خود روریک نے یہ صحیفہ نہیں دیکھا۔ روریک لکھتا ہے کہ حضرت عیسیٰ لداخ بھی آئے تھے اور قصبے کے بازار اور گلیوں میں گزرتا ہوا تخیل آرائی کرتا ہے کہ دو ہزار سال قبل حضرت عیسیٰ کے مبارک قدم یہاں پڑے تھے۔

لیہہ میں قیام کے دوران نکولس روریک نے اپنے موقلم سے چند شاہکار تصویریں بنائی ہیں، جن میں لیہہ کا محل بھی شامل ہے۔

مہاراجہ ہری سنگھ اور یونین جیک

مہاراجہ ہری سنگھ، مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے انتقال پر ۱۹۲۵ء میں تخت نشین ہوا۔ وہ ریاست جموں

وکشمیر میں آخری ڈوگرہ حکمراں تھا۔ مہاراجہ نے سری نگر میں تعینات انگریز ریزیڈنٹ سے کہا کہ وہ ریزیڈنسی کی عمارت پر نصب انگریزوں کا پرچم یونین جیک ہٹادے۔ ریزیڈنٹ نے جب نہیں ہٹایا تو فوج کے ایک دستہ سے ہٹوادیا۔ تاہم برطانوی ہند حکومت کے پولیٹیکل ڈپارٹمنٹ کی مداخلت پر جھنڈا بحال کردیا گیا۔

مہاراجہ نے ریزیڈنٹ کو سردیوں میں کشمیر سے دربار کے ساتھ جموں جانے سے روکا۔ اور گلگت میں یونین جیک کے ساتھ ریاست کے جھنڈے کو بھی لہرایا۔

مہاراجہ ہری سنگھ قبائلی حملے کے بعد ۲۵ اکتوبر کو کشمیر سے فرار ہوا اور شیخ محمد عبداللہ نے ۵ مارچ ۱۹۴۸ء کو بطور وزیراعظم حلف لیا۔

ایوے اورمے (Eve Orme)

Mountain Magic کی مصنفہ ایوے اورمے ۱۹۲۶ء میں اپنے شوہر کے ہمراہ لداخ آئی اور بے ساختہ لکھا: 'ہم ایک ایسے ملک میں آئے ہیں، جو دوسرے سیارے کا لگتا ہے۔'

لداخیوں سے متعلق وہ لکھتی ہے: 'بازار میں ہر لداخی ہمیں دیکھ کر مسکرایا، خاص کر عورتیں بہت ہنستی ہیں۔ یہ عیاں تھا کہ بڑی غریبی اور لاعلمی کے باوجود ان کو زندگی اچھی لگتی تھی۔ موراوین مشنری نے ہمیں بتایا کہ دوسرے لوگوں سے یہ سیدھے سادے ہیں...... لداخ میں میلوں پر الاؤ فروزاں کیا جاتا ہے، جس پر مٹی کا تیل چھڑکا جاتا ہے۔'

پھولوں سے لداخیوں کے لگاؤ کا ذکر کرتی ہوئی وہ رقم طراز ہے: 'یہ لوگ اپنی غریبی کے باوجود گلاب کا پھول اپنی ٹوپی پر ٹانکتے ہیں۔'

ایوے اورمے کے مطابق ان دنوں سری نگر تا لیہہ ہر ریسٹ ہاؤس میں مختلف موضوعات پر کتابیں ہوتی تھیں جو سیلانیوں نے گزشتہ ۵۰ سال کے دوران چھوڑی تھیں۔

راہول سنکر واتسائین

ہندی کے ادیب اور زبان داں راہول سنکر واتسائن ۱۹۲۶ء میں لداخ آئے۔ تب وہ آریا سماج سے وابستہ تھے۔ اُنھوں نے لیہہ میں لداخی لیڈروں سے ملاقات کی۔ وہ ہمس کے بڑے لاما کوشوق ستق سنگ راسپا کے کئی روز مہمان رہے، جنھوں نے ان کو لاہول سپیتی کے سفر کے لیے ''لم اِیگ'' پروانہ راہداری دیا اور ایک آدمی کو ان کی مدد کے لیے ساتھ بھیجا۔ پروانہ راہداری سے راستے میں کھانا، سواری۔ کے لیے گھوڑا اور رہائش کے لیے کمرے کا انتظام ہو جاتا تھا۔

نوبراہ میں وہ ویزونگ گنپہ کے بڑے لاما راس رینگبو چھے سے ملاقاتی ہوئے۔ راہول سنکر واتسائن نے ان کو لداخی بودھوں میں اصلاحات لانے کے لیے چند مشورے دیئے۔ ان میں ایک Polyandry کا خاتمہ تھا جس کی وجہ سے بودھ لڑکیاں دوسرے فرقے کے لڑکوں سے شادی کرتی تھیں اور بودھ آبادی کم ہو رہی تھی۔ راہول نے صفائی کے لیے مردوں کو لمبے بال نہ رکھنے کا مشورہ بھی دیا اور لاموں کو الگ تعلیم دینے کی صلاح دی۔ ریزونگ کے کوشوق نے ان مشوروں کی تائید کی اور کہا کہ وہ بھی اس ضمن میں ان کے ہم خیال ہیں۔ یہی مشورے راہول سنکر واتسائن نے ہمس کے کوشوق ستق سنگ راسپا کو بھی دیئے۔

راہول سنکر واتسائن کے ۱۹۲۶ء کا سفر نامہ ''میری لداخ یاترا'' کے عنوان سے چھپا ہے۔

گیسے پے ٹوچی

گیسے پے ٹوچی اطالوی عالم تھے۔ اُنھوں نے بچپن سے بدھ مت پر ریسرچ کیا اور تانترک اور مہایان بدھ مت پر تحقیقی کام کرنے کے لیے ۸ مرتبہ تبت گئے۔ وہ کئی مرتبہ لداخ بھی آئے۔ یہاں تحقیقی کام کیا اور یہاں سے تبت گئے۔ گیسے پے ٹوچی نے تبت اور بدھ مت پر کئی عالمانہ کتابیں لکھی ہیں۔ ٹوچی نے ۱۹۳۰ء میں لداخ کے ہمس گنپہ میں اپنا مطالعہ جاری رکھا۔ یہ گنپہ ڈوگپا کرگیوت فرقے کی ترجمانی کرتا ہے۔ ۱۹۳۳ء میں مزید ریسرچ اور مطالعہ کے لیے وہ سپیتی

گئے۔ڈوگرہ حکومت سے پہلے سپیتی لداخ کا علاقہ تھا۔

ٹوچی رقم طراز ہیں۔'بدھ مت کے تمام صحیفوں کو پڑھنے کے لیے دو زندگیاں چاہئیں'۔

پروفیسر ٹوچی نے لیہہ محل کی بطور عظیم یادگار تعریف کی ہے۔

ہنرائیتا سینڈس میریک (Henrietta Sands Merrick)

پھر ایک امریکی خاتون ہنرائیتا سینڈس میریک لداخ آتی ہے۔غالباً جولائی کا مہینہ اور سن ۱۹۳۰ء تھا۔وہ لکھتی ہے: 'لیہہ میں غریبی کم نظر آتی ہے۔کوئی بھدّری نہیں۔میں آزادی سے گھومی پھری۔کسی نے میرے ساتھ دست درازی نہیں کی۔

وہ لیہہ میں چھ ہفتے رہی۔ان دنوں لیہہ کی رات کیسی تھی؟ مصنفہ سے سنیے: 'بازار میں رات کے دس بجے گھومتے ہوئے میں نے دیکھا، لیہہ سو چکا تھا۔سب لوگ سو چکے تھے۔کسی گھر میں روشنی نہیں تھی۔گھپ اندھیرا تھا'۔

آگے وہ لکھتی ہے: 'میں نے پادری سے پوچھا کہ کیا میں اپنا روپیہ Yakdams میں رکھوں؟'

آپ چاہیں تو اُسے باہر ڈیوڑھی پر رکھیں'، 'یہ لوگ کبھی نہیں چراتے'۔پادری نے جواب دیا۔

ہنرائیتا سینڈس نے اپنی کتاب In the world's Attic میں لداخی بچوں کی تصویر دی ہے۔ان کے سر پر ٹوپیاں ہیں۔پیر ننگے ہیں۔پاجامے اُٹنگے اور موری پتلی ہے۔آستین لمبی ہیں اور بے ڈھنگے نظر آتے ہیں۔ظاہر ہے ان دنوں لداخ میں بڑی غریبی تھی۔

ہنرائیتا کے مطابق تب لیہہ میں سامان لپیٹنے کے لیے کاغذ دستیاب نہیں تھا۔عیسائی عورتوں نے پیرق پہننا ترک کیا تھا اور کمخواب کی ٹوپی پہنتی تھی۔عیسائیوں کی کل آبادی سو نفوس تھی۔

پنڈت امرناتھ

پنڈت امرناتھ لیہہ میں تحصیلدار رہے تھے۔اپنی ملازمت کے دوران ۱۹۳۱ء میں اُنھوں نے

کے نام سے لداخ پر ایک Guide to Ladakh–An echo of the unknown گائیڈ بک لکھی ہے جس میں اس دور کے لداخ سے متعلق کئی دلچسپ باتوں کا انکشاف کیا ہے۔ مصنف نے تاریخ داں جوزف گیرگن، ان کے بیٹے اور لداخی مورخ سکیاپدن گیرگن، جو اُن دنوں لیہہ اسکول میں اُستاد تھے، جے تھرچین اور چرس افسر مولوی غلام محمد کا شکریہ ادا کیا ہے، جنھوں نے کتاب کی تصنیف میں مصنف کی مدد کی تھی۔

پنڈت امرناتھ نے لداخ کی سماجی، معاشی اور تمدنی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں: 'لوگ پیتاوا باندھتے ہیں۔ ان کے بستر بہت کم ہوتے ہیں۔ کم کپڑے اوڑھ کر اوندھے منہ سوتے ہیں اور لکڑی کا سرہانا استعمال کرتے ہیں۔

علاج معالجہ کے لیے لاما، لابا (oracle) اور لرجے (مقامی طبیب) سے رجوع ہوتے ہیں۔ ان دنوں دردسر کے علاج کے لیے عموماً شیشے کے ٹکڑے سے کان کی لو تھوڑی سی کاٹی جاتی ہے۔ لابا مریض کے بدن پر جہاں درد ہوتا ہے، ایک چھوٹی نالی میں رنگ دار پانی ڈال کر چوس لیتا ہے اور بقول مریض درد رفع ہو جاتا ہے۔

درد یا ڈوقپا قبیلہ رات کو چراغ نہیں جلاتا اور روشنی استعمال نہیں کرتا۔ ڈوقپا کا یہ عقیدہ ہے کہ روشنی سے دیوتا ناراض ہوں گے۔ پانی سے متعلق ان کا کہنا ہے کہ پانی صرف پینے کے لیے بنایا ہے، نہانے دھونے کے لیے نہیں۔

بچہ پیدا ہونے پر زچہ کے ساتھ اس کا شوہر بھی ایک ماہ گھر میں مقید رہتا ہے اور بچے کی ماں سے زیادہ شوہر کی خدمت کی جاتی ہے۔ وہ دونوں ایک کمرے میں رہتے ہیں۔

کسی مہمان یا بڑے آدمی کا استقبال کرنا ہو، تو دیہات کی بدصورت ترین عورتیں گاؤں کے داخلے پر توؤں میں ستو لیے جمع ہوتی ہیں۔ دمامہ والے بھی ساتھ ہوتے ہیں۔ جب مہمان ان کے پاس آتا ہے تو ڈوقپا عورتیں جھک جاتی ہیں۔ پھر دستور کے مطابق مہمان کو راستہ دیا جاتا ہے۔

داہانو کے لوگوں نے قدیم تہذیب اور معاشرے اب بھی قائم رکھی ہے اور اس میں کوئی تبدیلی

نہیں آئی ہے۔ (آج کل بڑی تبدیلیاں آئی ہیں)

چنگپا قبیلہ میں جب کوئی سخت بیمار ہوتا ہے تو اس کو ایک کھڈ میں رکھا جاتا ہے اور پہلے مقام سے دور خیمہ نصب کیا جاتا ہے۔ دو یا تین آدمی بیمار کو دیکھنے اور تیمارداری کے لیے رکھے جاتے ہیں۔ اگر بیمار ٹھیک ہوتا ہے تو اہل خانہ سے آملتا ہے۔ اگر مر جاتا ہے تو اس کھڈ میں پرندوں اور جانوروں کے لقمے بننے کے لیے چھوڑ دیا جاتا ہے۔

مصنف کے زمانے میں لیہہ میں لوسر یا سال نو کا تہوار اچھی طرح منایا جاتا تھا اور راجہ پرانی رسم کے مطابق اس میں شرکت کرتا تھا۔ بودھی تیسویں رات راجہ دعوت دیتا تھا اور دوسرے روز لوگ راجہ کے پاس تحائف لے کر سلام کے لیے جاتے تھے۔ راجہ کے سامنے ٹاقشوس خواتین ناچ پیش کرتی تھیں۔ دوسرے روز راجہ کی قیادت میں سواریاں بازار میں آتیں۔ راجہ بازار میں واقع اپنی قیام گاہ میں جاتا تھا اور گھوڑ دوڑ ہوتی تھی۔ اس دن راجہ اپنا تاج پہنتا تھا۔ تین روز گھوڑ دوڑ جاری رہتی تھی۔ پھر سارے گھوڑ سوار راجہ کو ایک جلوس میں محل لے جاتے تھے۔ وہاں ٹاقشوس دوبارہ اپنا رقص پیش کرتی تھیں۔ یہ ناچ تین بجے سے چھ بجے تک دس روز جاری رہتا تھا۔ اس طرح لوسر اختتام پذیر ہوتا تھا۔ ٹاقشوس خواتین رقاصاؤں کا گروپ ہے۔

اسی طرح مذہبی تہوار دسمو چھے کے دوسرے روز راجہ کی قیادت میں گھوڑوں پر جلوس نکالا جاتا تھا اور 'ستورما' یا بلا کی علامت ایک پتلے کو نذر آتش کیا جاتا تھا۔ اس کے بعد تین روز تک بازار میں گھوڑ دوڑ رہتی تھی۔

ان دنوں ستورلوق میلہ کو پوجا کنگیور ستنگیور کہا جاتا تھا۔ اس موقعے پر لیہہ میں ۴۰ لامے جمع ہوتے تھے اور چار روز میں بودھوں کی مذہبی کتب کنگیور اور ستنگیور کی ساری پوتھیاں ختم کرتے تھے۔ یہ پوجا پھیانگ کے بڑے لاما کی قیادت میں ہوتی تھی۔

مصنف کے زمانے میں پوجا مہاراجہ کی درازیٔ عمر اور حکومت کی بقا کے لیے ہوتی تھی۔

لداخی شادی میں 'اوم رین' یعنی دودھ کی قیمت' لینے کی رسم ہے۔ ماں بچی کو اپنی چھاتی کا دودھ

پلا کر پروان چڑھاتی ہے۔اس کے عوض دُلہن کی ماں دُولہا کے والدین سے تھوڑی سی رقم مانگتی ہے۔

مصنف رقم طراز ہے: 'لداخ میں لاش گھر میں (پوجا کے لیے) زیادہ سے زیادہ تیس روز اور کم سے کم چار روز رکھی جاتی ہے۔ یہ موسم اور کنبے کی حیثیت پر منحصر ہے............ایک انوکھی بات یہ ہے کہ مردے کو اس کے رشتہ داروں یا قریبی آدمیوں کو دیکھنے کی اجازت نہیں ہے۔ یا شوہر ہے تو بیوی کو نعش دیکھنے کی اجازت نہیں ہے۔ صرف 'پھس پون' ہی لاش کو دیکھ اور چھو سکتے ہیں۔ پھس پون برادری کے آدمی ہوتے ہیں جو شادی غمی میں مدد اور کام کرتے ہیں۔

اُن دنوں سرکاری ملازموں، سیاحوں اور تاجروں کی سہولت کے لیے ریس اور بیگاری کا نظام تھا جس کا بوجھ کسانوں اور عام لوگوں پر پڑتا تھا جس کے تحت ہر پڑاؤ پر گھوڑے اور قلی رکھنے پڑتے تھے۔ مصنف نے ریس سسٹم کا یوں نقشہ پیش کیا ہے:

پڑاؤ کے نام	موسم گرما میں گھوڑے یازو	گرما میں قلی	سرما میں گھوڑے یازو	سرما میں قلی
دراس	۸۰	۲۰	—	۱۲۵
کرگل	۵۰	۲۰	۳۰	۳۰
مولبیک سے نیموں	۴۰	۲۰	۲۰	۲۰
لیہہ	۵۰	۲۰	۳۰	۳۰

پڑاؤ پر ریس رجسٹر تھا اور متعلقہ شخص کو تفصیل سے اندراج کرنا پڑتا تھا۔ جنوری اور فروری میں زوجی لا پر آمد و رفت برائے نام تھی اس لیے ان دو مہینوں کے دوران دراس میں قلی رکھنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔

ہر شکاری کو درخواست دینے پر شکار کے لیے مخصوص بلاک فراہم کیا جاتا تھا۔ نیان کے ۱۴ اور شاپو کے ۶ ابلاک تھے۔ ایک شکاری کو نیان اور شاپو کا ایک ایک بلاک الاٹ کیا جاتا تھا۔

شکاریوں کو تحریری گارنٹی دینا پڑتی تھی کہ وہ مشرقی ترکستان اور تبت کی سرحدیں پار نہیں کریں گے۔

برٹش جوائنٹ کمشنر نے مچوئی سے سپتک تک ہر ڈاک بنگلہ میں مسافروں اور سیاحوں کے پڑھنے کے لیے ناول رکھے تھے جو وہ عاریتاً ایک ڈاک بنگلہ سے دوسرے ڈاک بنگلہ میں لے جاسکتے تھے۔اناج کی فراہمی کے لیے دراس، کرگل، لامایورو، سسپول، پنامیک اور لیہہ میں سرکاری کوٹھیاں تھیں۔

شکایات کے لیے صرف برٹش جوائنٹ کمشنر سے رجوع کیا جاسکتا تھا۔

ہمس گنپہ کے پاس یورپیوں کے لیے ایک بنگلہ بنایا گیا تھا۔ میلے پر یوروپیوں اور مہمانوں کے لیے گنپے میں چھمز دیکھنے کے لیے دریچے مخصوص کیے جاتے تھے،لیکن کرسیوں کا انتظام اُنھیں خود کرنا پڑتا تھا۔ان دنوں بھی گنپہ کو نذرانہ دینے کی رسم تھی۔

مصنف نے کوشوق چھولیٹم نیماں کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اُنھوں نے ریزونگ گنپہ میں سخت ضابطے بنائے ہیں جن کے تحت گنپہ کے احاطہ میں گوشت،تمباکو اور شراب لانے کی اجازت نہیں ہے۔جب کسی بیمار لاما کو طبیب گوشت تجویز کرے تو ایک خصوصی قاصد کے ذریعے لیہہ سے منگایا جاتا ہے۔گنپہ میں مساوات ہے۔سب کا ایک لباس اور کھانا ہے۔کھانا دن میں صرف ایک مرتبہ کھایا جاتا ہے۔لوگ تحفے تحائف پیش کریں،تو وہ گنپے کا مشترکہ ورثہ ہوتے ہیں۔

امرناتھ نے لیہہ قصبہ کے اہم مقامات اور یادگاروں کے احوال بھی دیئے ہیں۔وہ لکھتا ہے کہ لیہہ محل کا دربار ہال قابل دید ہے۔لیہہ قلعہ میں ہندوؤں کے دو مندر دیوی دوارا اور مہابیر مندر ہیں اور مسلمانوں کی ' پنج پیر' مسجد ہے۔وزیر کے بنگلہ پرتاپ بھون میں مہاراجہ کا جھنڈا نصب ہے جب کہ کرزو باغ میں جوائنٹ کمشنر کی کوٹھی کے سامنے یونین جیک لہراتا ہے۔ نیا بازار وکٹوریا بازار کہلاتا ہے۔لیہہ قصبہ کے پرسکون ماحول کے لیے وہ شیکسپیئر کے ذیل کے اشعار کا حوالہ دیتا ہے۔

درختوں کی زبانیں ہیں	Tongues in trees
بہتی ندیاں کتابیں ہیں	Books in running brooks

Sermon in stones	پتھروں میں اُپدیش چھپے ہیں
And good in every thing	یہاں کی ہر چیز اچھی ہے

دوسرے سیاحوں اور مشاہدوں کی طرح مصنف نے بھی لداخی کردار کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے۔ 'اگرچہ یہ نہایت ہی غریب ہیں لیکن اپنی قسمت کو کوسنے کے بجائے یہ لوگ اپنی خستہ حالی پر ہنستے ہیں۔ یہ خوش وخرم، خوش مزاج، تعاون کے لیے آمادہ اور بڑے راست باز ہیں۔ جب تک سخت مجبوری نہ ہو، یہ شاذونادر ہی مقدمہ بازی میں اُلجھتے ہیں۔'

گلانسی کمیشن

۱۹۳۰ء کی دہائی کے دوران لداخ کے بودھوں میں جاگرتی لانے کے لیے ایک مہم چلی۔ اس کی شروعات سری نگر کے چند نو بودھوں سے ہوئی۔ اُنھوں نے ۱۹۱۷ء میں کشمیر راج بودھی مہاسبھا کے نام سے ایک تنظیم قائم کی تھی۔ ان کی نظر میں لداخ ہندوستان میں بدھ مت کی آخری جنت تھا۔ پنڈت شمبو ناتھ اس کا صدر تھا اور کوشوق ستنسق سنگ راسپا اس کے مربی بنے۔ ایک رسالہ مہابودھی نکلتا تھا جس میں لداخی بودھوں کے مسائل اور مطالبات چھپتے تھے۔

مہاراجہ ہری سنگھ نے ۱۲ نومبر ۱۹۳۱ء کو ریاست کے لوگوں کے مطالبات پر سفارشات کرنے کے لیے برطانوی ہند کے ایک افسر بی جی گلینسی کی صدارت میں ایک کمیشن قائم کیا۔ اسی نسبت سے اس کا نام گلانسی کمیشن رکھا گیا۔ کمیشن میں صوبہ جموں اور کشمیر وادی سے دو دو نمائندے لیے گئے۔ کشمیر راج بودھی مہاسبھا نے کمیشن کو ایک یادداشت پیش کی۔ لداخیوں نے کمیشن کو خطے کے مڈل اسکولوں کو ہائی اسکول کا درجہ دینے، حرفتی اسکول کھولنے، بودھی پڑھانے کا بہتر انتظام کرنے، ریس سسٹم بند کرنے یا ریس کے مزدوروں کو پوری اُجرت دینے، گنپے، مسجدیں، گرجے بنانے اور قبرستان کے لیے زمین کی فراہمی وغیرہ کے مطالبات کیے تھے۔

اپریل ۱۹۳۲ء میں کمیشن نے اپنی رپورٹ اور اپنی سفارشات پیش کیں۔

لیہہ اور کرگل کے مڈل اسکولوں کو ہائی اسکولوں کا درجہ نہیں دیا گیا اور نہ حرفتی اسکول کھولے گئے۔ البتہ کمیشن کی سفارش پر ۱۹۳۹ء میں ایک نو بودھ شری دھر کول ڈولو کو لداخ وزارت میں تعلیم کو فروغ دینے کے لیے اسسٹنٹ انسپکٹر آف اسکولز کے عہدے پر فائز کیا گیا اور کالج میں زیر تعلیم ایک لداخی طالب علم صنم نربو کو انجینئرنگ کی ٹریننگ کے لیے انگلستان بھیجا گیا۔ شری دھر ڈولو نے بطور تعلیمی افسر ۱۲ سال تک لداخ میں اپنی خدمات سرانجام دیں۔

چھنگ نوسی کے انسداد کے لیے حکام کی تجویز کو کمیشن نے یہ کہہ کر قبول نہیں کیا کہ چھنگ کے عادی لوگوں کا کہنا ہے کہ سرد آب وہوا کی وجہ سے ہلکی نشہ آور شراب کا استعمال عیش میں نہیں آتا، بلکہ اس کی بڑی ضرورت ہے۔ کمیشن نے پولینڈری کی قانونی ممانعت کی سفارش اس لیے نہیں کی کہ عام لوگ اس رسم کو ختم کرنے کے حق میں نہیں تھے۔

جولائی ۱۹۳۳ء میں بودھ فرقہ میں حصول تعلیم کے لیے شعور اور جاگرتی پیدا کرنے کے لیے لیہہ میں لداخ بدھسٹ ایجوکیشن سوسائٹی کے نام سے ایک تنظیم کا قیام عمل میں آیا۔ راجہ جگمت ڈاڈول نمگیل اس کے صدر، کالون لبزانگ چھوانگ نائب صدر، نونو چھیتن پنچگ سکریٹری، منشی صنم چھوانگ اسسٹنٹ سکریٹری، ماسٹر موروپ گیالچن اسسٹنٹ سکریٹری اور نونو سکلزانگ شاہ خزانچی مقرر ہوئے۔

راہول سنکر واتسائن اُن ہی دنوں دوبارہ لیہہ پہنچے۔ ۱۵ جولائی ۱۹۳۳ء کو اُنھوں نے اپنے بھائی آنند کو ایک خط میں لکھا کہ 'آج لداخ بودھ شکشا سمیتی قائم ہوئی ہے۔' یہ خط 'یاترا کے پنے' کے نام سے ان کے خطوط کے مجموعہ میں شامل ہے جو اُن کے ۱۹۳۳ء کے سفر سے متعلق ہے۔ اس کے پیش لفظ میں دوشبد کے عنوان سے اُنھوں نے لکھا ہے۔ 'بھارت اور تبت کے جن تہذیبی انمول خزانوں کو میں لداخ کے مٹھوں میں دیکھ آیا تھا، اب وہاں ان کے قدردان پیدا ہوگئے ہیں'۔

اسی سال راہول سنکر واتسائن نے بدھ مت اختیار کیا۔ چند مقامی بودھوں نے ان سے درخواست

کی کہ وہ ان کے لیے کچھ کام کریں۔ اُنھوں نے تین لداخی ریڈرز اور گرامر تالیف کی۔ اس کام میں چھیتن پنچگ نے ان کی مدد کی۔ اسی دوران مہاراجہ کو ایک یادداشت بھیجی گئی، جس میں بودھی کو ذریعہ تعلیم بنانے، اُردو کو اختیاری مضمون قرار دینے، بودھ طلبا کے حق میں خصوصی وظیفہ منظور کرنے، لداخ میں بودھ اسسٹنٹ انسپکٹر آف اسکولز کی تقرری اور لیہہ مڈل اسکول میں سنسکرت استاد کی تقرری شامل تھی۔

راہول سنکرواتسائن سری نگر سے ہوکر آئے تھے۔ مولبیک گاؤں سے آگے کئی گاؤں میں مسلم آبادی دیکھ واتسائن کو تشویش ہوتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں: 'ادھر گاؤں میں بھی جگہ جگہ مسلمان پہنچ گئے ہیں۔ بودھ گاؤں میں ایک مسلمان کا گھر بھی بسنا، بودھوں کی تباہی کے لیے کافی ہے۔' ایسے ہی خیالات کا اظہار چند مغربی اسکالروں نے بھی کیا ہے۔ اس پر اپنے ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے۔ ہاورڈ یونیورسٹی کے ایک سابق لداخی طالب علم صدیق وحید نے ایک جریدہ Himal میں لکھا تھا کہ مغربی نظریہ کے مطابق تبتی یا لداخی تہذیبی دھارا میں لداخی مسلم کو کوئی حق نہیں ہے۔ اُنھوں نے اس طرح لداخی بودھوں اور مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنے کی کوشش کی ہے۔

واتسائن آگے لکھتے ہیں: 'خلسے میں دو عیسائی کنبے ہیں، جو پینتیس سال کی تبلیغ کا نتیجہ ہے۔ بزگو میں سولہ مسلم گھرانے ہیں۔ ان کو آباد ہوئے ۴۰ سال ہوئے ہیں۔'

راہول سنکرواتسائن بودھ معززین (Elite) سے مایوس تھے۔ ان کا خیال تھا کہ لداخ بدھسٹ ایجوکیشن سوسائٹی کے ممبران کاہل ہیں، فعال نہیں۔ اُنھیں اپنے مشن کے طریقۂ کار کا احساس نہیں۔ چنانچہ واتسائن بددلی سے لکھتا ہے۔ 'مجھے بہت کم ہی امید ہے کہ سو سال بعد یہاں کوئی بودھ رہ جائے گا۔'

واتسائن دو لداخی اسکالر جوزف گیرگن اور چھیتن پنچگ کے مداح ہیں اور رقم طراز ہیں: 'ان دونوں کے بغیر لداخ میں کوئی عالم نہیں ہے۔ یہی دو پڑھے لکھے ہیں۔' جوزف گیرگن سے اس کی ملاقات ۱۹۲۶ء میں ہوئی تھی۔ تب گیرگن لداخی تاریخ اور ثقافت پر تحقیقی کام کررہے تھے۔ گیرگن مذہباً عیسائی تھے۔ ستمبر ۱۹۳۴ء میں چھیتن پنچگ نے بھی عیسائیت اختیار کی۔

راہول سنکرواتسائن تخلیقی کام میں مگن رہتے تھے۔ وہ آنند کو ایک خط میں لکھتے ہیں: 'میری قسمت

میں آرام نہیں ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں، ٹھنڈے پہاڑ پر آرام کرتا ہوگا لیکن یہاں ایک دو بجے اور کبھی ۴ بجے رات تک چراغ کے سامنے قلم لے کر بیٹھے رہنا پڑتا ہے۔'

لکھنے پڑھنے والوں کے لیے لیہہ کا ڈاک خانہ اہم تھا۔ دیر سے سہی، لیکن اخبارات و رسائل اور کتابیں آجاتی تھیں'۔

واتسائن کے علاوہ پنڈت نیلا کنٹھ، لیہہ مڈل اسکول کا ہیڈ ماسٹر گوبندلال شاہ اور پنڈت شمبھوناتھ وغیرہ لداخی بودھوں کے حقوق کے حصول اور سماجی خرابیوں کے خاتمے کے لیے کوشاں تھے۔ گوبندلال شاہ نے پولینڈری کو غیر قانونی قرار دینے کے لیے یادداشت لکھی جسے جگمت ڈاڈول نمگیل نے حکومت کو پیش کیا۔ بعد میں شری دھر کول، جو ڈولو کے نام سے جانا جاتا تھا، بودھوں کے ایک لیڈر کی حیثیت سے اُبھرا۔

مہاراجہ کی قائم کردہ پرجا سبھا میں دو بودھوں کو نشستیں ملیں۔ لداخی نمائندے زبان نہیں جانتے تھے۔ سری نگر کے بودھوں نے اپنی طرف سے ایک نمائندہ نامزد کرنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہیں ہوئے۔

کئی ملکی اور غیر ملکی مبصرین نے تیس کی دہائی میں بودھوں کی تحریک کا ذکر کیا ہے۔ ان کے مطابق بودھوں کی سماجی زندگی اور تعلیمی حالت میں معمولی سی بہتری آئی۔ آج کل تعلیمی میدان میں بودھ پیش پیش ہیں۔ ان کے لگ بھگ سو فیصد بچے زیر تعلیم ہیں۔

لاما انگاریکا گووِندا

لاما انگاریکا گووِندا ایک نو بودھ جرمن تھا۔ وہ ۱۹۳۳ء کے موسم بہار میں کشمیر سے بلتستان، لداخ سے ہوتا ہوا مغربی تبت گیا۔ سری نگر سے کرگل تک وہ راہول سنکر واتسائن کا ہم سفر تھا۔ لداخ میں وہ کئی گنپے گیا، جہاں اس کی خوب پذیرائی اور مہمان نوازی کی گئی۔ اس کے ساتھ دو لداخی اور ان کے دو ٹٹو تھے۔ لداخ سے وہ مغربی تبت گیا۔ اپنی کتاب The way of the white clouds

میں وہ رقم طراز ہے: 'اُن دنوں لداخ اور تبت کے درمیان کوئی سرحد نہیں تھی۔ یہ دُنیا کے ان مقامات میں سے ایک مقام تھا جہاں انسان اور فطرت کے درمیان انسان کے بنائے ہوئے قوانین اور حکومتیں حائل نہیں تھیں۔ یہاں انسان کے داخلی ضمیر اور فطرت کے طبعی قانون کی فرماں روائی تھی'۔

مصنف کا دل اس احساس سے بڑا شاداں وفرحاں تھا۔

لیہہ میں لاما انگاریکا گووندا کی آمد سے متعلق موراوین مشن کے پادری بشپ پیٹر کے حوالے سے دو یوروپی اسکالر تھائیری ڈوڈین اور کارین اندرے نے لکھا ہے کہ ۱۹۳۳ء میں ایک نو جرمن بودھ انگاریکا گووندا لداخ آیا اور اسی سال راہول سنکرواتسائن نے لیہہ میں بدھ مت اختیار کیا۔ مقامی مسلمانوں نے ایک مغربی نو مسلم کو لداخ لانے کی کوشش کی۔ اس سے ایک سال پہلے ۱۹۳۲ء میں ایک Siamese نے مقامی آبادی کو بودھ دھرم سے روشناس کرنے کے لیے لیہہ میں ایک مشن قائم کیا لیکن مقامی زبان نہ جاننے کی وجہ سے وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوا۔ فادر پیٹر کے بیانات سے لگتا ہے کہ ان کو یہ صورت حال اچھی نہیں لگی۔

لوسینو پیٹیک

لوسینو پیٹیک پہلا یوروپی تھا، جس نے لداخ کی شاہی تاریخ گیالرپس (Ladakh Chronieale) پر ریسرچ کیا اور ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ ایسا لگتا ہے' اس سلسلے میں وہ دو مرتبہ لداخ گیا۔ لداخ میں ان کی ملاقات ڈاکٹر فرانکی سے ہوئی، جن سے کئی نکات پر پیٹیک کو اختلاف تھا۔ تاہم فرانکی کے لداخ اور اس کی یادگاروں وغیرہ پر بے لوث تحقیقی کام کے لیے پیٹیک نے ڈاکٹر فرانکی کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

لداخ کی شاہی تاریخ موجودہ صورت میں ۱۶۴۶ء میں معاہدہ تمسگام پر دستخط ہوتے وقت مرتب کی گئی تھی۔[۱]

لوسینو پیٹیک نے ۱۹۳۵ء اور ۱۹۳۶ء میں روم کی یونیورسٹی میں لداخ پر اپنا ریسرچ جاری رکھا۔

لوسینو پیٹک کلاسیکل بودھی جانتا تھا۔

۱۹۸۰ء کی دہائی میں پیٹک نے The kingdom of Ladakh لکھی جو لداخ پر سب سے مستند اور معتبر تاریخ سمجھی جاتی ہے۔ کتاب شائع ہونے سے پہلے وہ ایک دفعہ پھر لداخ آیا۔

جے ہاکس اور ایچ ڈی ٹیرا

۱۹۲۴ء میں دو یوروپی محققوں جے ہاکس اور ایچ ڈی ٹیرا کو کرگل میں ایک ڈھلوان جگہ پتھر کا ایک اوزار ملا۔ اُنھوں نے یہ اندازہ لگایا کہ کشمیر سے آئے ہوئے کچھ مسافر یہ اوزار اپنے ساتھ لائے ہوں گے اور وہاں چھوڑ دیا ہوگا۔ کشمیر میں اس سے پہلے برزہ ہما کے مقام پر پتھر کے اوزار اور قدیم مٹی کے برتن ملے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ لداخ انسانوں کے بسنے کے لیے موزوں جگہ نہیں ہے اور اس نے کبھی پتھر کا زمانہ دیکھا نہیں ہوگا، لیکن ان کا مفروضہ غلط ثابت ہوا۔ ۱۹۷۹ء میں محکمہ آثار قدیمہ کے چند ماہرین کو لداخ کے کئی گاؤں میں پتھر کے تیشے اور کلہاڑیاں ملیں۔ ۱۹۸۵ء میں جیولوجیکل سروے آف انڈیا کی ایک ٹیم کو کرگل کے گردونواح پشکیوم اور کئی گاؤں میں پتھر کے مزید اوزار اور آلات ملے۔ جن سے یہ تصدیق ہوگئی کہ لداخ نے پتھر کا زمانہ دیکھا ہے۔

مارکو پالیس (Marco Pallis)

انگریز سیاح مارکو پالیس ۱۹۳۶ء میں لداخ آیا۔ ان کے ہمراہ ڈاکٹر رابرٹ روف تھا۔
مارکو پالیس نے اپنی کتاب Peaks and Lamas میں اس سفر کے احوال لکھے ہیں۔
زوجی لا سے لیہہ آتے ہوئے مچوئی سے آگے مصنف نے مختلف قسموں کے جنگلی پھول دیکھے۔
دراس میں اسکول کے بچوں نے اُنھیں ڈرل دکھائی۔ راستے میں ایک تبتی عورت ملی، جس کا خاوند لداخی تھا۔ اس کے ساتھ بیس کتے تھے جنھیں وہ انگریز عورتوں کو بیچنے کشمیر لے جا رہی تھی۔
مارکو پالیس لکھتا ہے کہ وہ تبتیوں سے جلدی مانوس ہوتا ہے اور کبھی ان کی صحبت میں اجنبیت

محسوس نہیں کرتا۔

کرگل سے متعلق وہ لکھتا ہے: 'قصبہ کرگل کشمیر سرکار کے افسر اعلیٰ کے رہنے کا ایک مرکز ہے۔ جس کے ذمہ دوسرے فرائض کے علاوہ لیہہ جانے والے مسافروں کے پروانہ راہداری کی جانچ پڑتال کرنا ہے۔ یہ تیز رو دریائے سورو کے ساتھ ایک کھلی جگہ پر واقع ہے۔ یہاں خوش حالی کی فضا ہے اور دراس کے آس پاس کے خستہ حال گاؤں کے سفر کے بعد ایک خوشگوار تبدیلی کا احساس ہوتا ہے۔ کرگل کے بازار کی دکانوں میں ہندوستان اور ترکستان سے لایا ہوا مال ملتا ہے۔' مارکو پالیس نے کرگل کو ایک چھوٹا قصبہ کہا ہے جب کہ اس سے پہلے فلپی نے اسے ایک چھوٹا گاؤں اور بیلیو نے (بڑا گاؤں) کہا تھا۔

لداخی عورتوں کی آزادی اور اختیارات سے متعلق مارکو پالیس کا مشاہدہ ہے کہ لداخ میں بیوی گھر کی حقیقی حکمراں ہے۔

پالیس رقم طراز ہے۔ لداخی عورت چاہے بیٹھی ہو یا چل رہی ہو، اون کات رہی ہوتی ہے۔ یوروگنپہ دیکھ کر مارکو پالیس ٹینڈل بسکو کی طرح جذباتی ہو جاتا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے۔ 'یوروگنپہ پہلی نظر میں ایک ناقابل فراموش تجربہ ہے۔'

گاؤں کے محدود وسائل سے متعلق وہ رقم طراز ہے: 'راستے میں اگر ایک گاؤں سے متعدد مسافر گزریں تو اشیائے خوردنی کی قلت پڑ جاتی ہے۔'

سفر کے دوران جب وہ علاقہ لائن میں پہنچتا ہے تو مارکو پالیس سوچتا ہے کہ ان گاؤں کے باشندے یقیناً کرۂ ارض پر سب سے زیادہ چند شادماں لوگوں میں ہوں گے۔' وہ لکھتا ہے: 'یہاں ہر آدمی اپنا خود معمار ہے۔'

لیہہ میں ان کا قیام غلام محمد دار وخان کے خوبصورت باغ میں ہوتا ہے۔ لیہہ بازار میں لوگ ان سے پوچھتے ہیں کہ کیا وہ لہاسہ سے آئے ہیں؟

لیہہ کی جامع مسجد کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے 'لیہہ کی مسجد محل کے نیچے ہے۔ یہاں

مسلمانوں کی ایک بڑی آبادی ہے۔ مسجد کا فن تعمیر لداخی طرز پر ہے۔ بعد میں ہمارا یہ روز کا معمول بن گیا کہ ہم شام کو وہاں چلے جاتے تھے اور موذن کی اذان کا انتظار کرتے تھے۔'

لیہہ سے متعلق پالیس نے یہ تاثر قلم بند کیا ہے 'لیہہ اپنی جگہ ایک چھوٹی دُنیا ہے........... یہ لداخ کا Nerve Centre (اعصابی مرکز) ہے۔ ہر لحاظ سے یہ ایک راجدھانی لگتا ہے........... یہاں کے سرکردہ شہریوں کا دور افتادہ ملکوں سے رابطہ ہے۔'

مارکو پالیس کو لیہہ بازار کا منظر بڑا جاذب نظر لگتا ہے۔ وہ یہاں لمبے پتلے اور لمبی باز جیسی ناک والے کشمیری، گٹھیلے بدن والے بلتی، لمبی قامت، چھوٹی آنکھیں اور سپید رنگت والے ترکی اور مخصوص لباس میں ان کی برقع پوش عورتوں کو گھومتے دیکھتا ہے۔

لداخی کلچر میں مارکو پالیس نے اپنی انفرادیت پائی جیسا کہ وہ لکھتا ہے: 'بادیٔ النظر میں لداخی چائے دانی اور بھوٹان یا تبت کے برتنوں میں کوئی فرق نظر نہیں آتا لیکن غور سے دیکھا جائے تو ایک آدمی تبت، بھوٹان اور لداخ کے برتنوں میں فرق کو پہچان سکتا ہے۔''

اسی طرح وہ خطے کی دوسری باتوں میں بھی ایک کھرا پن پاتا ہے جو صرف لداخ سے مخصوص ہے۔

دوسرے سیاحوں کی طرح اس نے بھی لکھا ہے کہ لداخی جھوٹ بولنا نہیں جانتے۔ یہاں جرائم نہیں ہوتے۔

مصنف نے لداخی گھروں کی تعریف کی ہے خاص کر لکڑی پر مصوری کے کام کو خوبصورت بتایا ہے۔

مسلمانوں کے لباس سے متعلق وہ لکھتا ہے۔ 'مسلمان پگڑی اور سرخ رومی ٹوپی (فیض کیپ) پہنتے ہیں۔ تاہم لباس لداخی ہے۔'

'اقسقال خان محمد الدین نے ہمیں اپنے دفتر میں چائے پر مدعو کیا جہاں قصبہ کے بڑے تاجر موجود تھے،' وہ لکھتا ہے۔ 'ان میں حاجی محمد صدیق اور نونو تنییت شاہ تھے۔ حاجی محمد صدیق کی لہاسہ اور گرتوق سے تجارت تھی۔ وہ بڑے ہنس مکھ اور خوش مزاج انسان تھے۔ اُنھوں نے ہمیں اپنے گھر پر دعوت دی۔'

ہمارے قیام کے دوران ریزیڈنٹ کرنل ایل ای لنگ لیہہ آئے۔ سبھی سرکردہ شہری ان کے

سواگت کے لیے سپتیک گئے۔ اسکول کے بچوں اور لاموں نے لیہہ میں ان کا روایتی طور پر استقبال کیا۔ کرنل نے دربار منعقد کیا، جس میں سرکردہ شہریوں نے شرکت کی۔

لداخ میں اپنے قیام کے دوران مارکو پالیس اور ڈاکٹر رابرٹ روف نے ہمس، پھیانگ اور دوسرے کئی گنپے دیکھے۔ مصنف کو لداخی بدھ مت خاص کر مذہبی آرٹ سے بڑی دلچسپی تھی۔

ڈاکٹر رابرٹ روف آدھی صدی کے بعد دوبارہ لداخ آیا۔ ۱۹۸۹ء میں اُنھوں نے برسٹل (انگلستان) میں لداخ سے متعلق منعقدہ ایک کانفرنس میں لداخ تب اور اب کا تقابلی مطالعہ کرتے ہوئے کہا کہ ۱۹۳۶ء میں لیہہ آج کے مقابلے میں بہت چھوٹا قصبہ تھا اور شاندار نظارہ پیش کرتا تھا۔

مور کرافٹ نے ۱۸۲۰ء میں لداخ میں جو دیکھا تھا، ۱۹۳۶ء میں ہم نے اس میں بہت کم تبدیلیاں دیکھیں۔ زراعت معیشت کا سب سے بڑا سہارا تھی۔ مقامی دست کاریاں، لکڑی، لوہے کا کام، اون کتائی اور بنائی عام تھی۔ تقریباً ہر چیز مقامی طور پر بنتی تھی۔ سڑکیں، گاڑیاں، مشین کا سامان، نل کا پانی، بجلی، ٹیلی فون اور جدید زندگی کی چیزیں نہیں تھیں۔

لیہہ میں جوزف گیرگن بڑے عالم تھے۔ پھیانگ گنپہ میں لاما قونچگ گیالچن ایک قابل مصور تھے۔ حاجی محمد صدیق اور نونو تنیت شاہ سرکردہ تاجر تھے۔

روف کی دوبارہ لداخ آمد کے وقت نونو تنیت شاہ حیات تھا اور رابرٹ روف ان سے ملنے ان کے گھر گیا۔

۱۹۳۶ء میں لوگوں کی صحت کا ذکر کرتے ہوئے رابرٹ روف نے لکھا ہے۔ بچے صحت مند تھے۔ بوڑھوں میں موتیا بند اور دل کے امراض دیکھنے میں آئے۔

وزیر حشمت اللہ

وزیر حشمت اللہ نے لداخ بلتستان، گلگت اور چترال میں زندگی کا بڑا حصہ گزارا اور اس دوران خطے کی تاریخ و رسوم اور ثقافت پر ہمہ گیر تحقیقی کام کیا۔ بعد میں وہ لداخ وزارت کا وزیر بنا۔ ۱۹۳۷ء

میں اُنھوں نے تاریخ جموں، کشتواڑ، تبت، لداخ بلتستان، گلگت وغیرہ کے نام سے ایک ہی ضخیم مجموعہ میں ان خطوں کی تاریخیں قلم بند کیں، جو اپنے موضوع پر ایک مستند، مبسوط اور اہم تصنیف ہے۔

'بودھوں کے رسم ورواج'، کے ذیلی عنوان سے اُنھوں نے لداخی بودھوں کی وراثت، شادی، طلاق، پیدائش، موت وغیرہ پر سیر حال تبصرہ کیا ہے۔ اسی طرح گنپوں کے میلوں اور بودھوں کے تہواروں پر بھی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ ایک مقالہ میں ان کا احاطہ کرنا اور حوالہ دینا مشکل ہے۔ زمانہ حال میں لداخی بودھوں نے وراثت، شادی وغیرہ میں کئی تبدیلیاں لائی ہیں اس لیے یہاں وزیر حشمت اللہ کی تحریروں کا اختصار سے حوالہ دیا جاتا ہے تاکہ ماضی کی رسومات کی جانکاری اور بصیرت حاصل ہو۔

وراثت: بودھوں میں وراثت صرف بڑے بیٹے کو ملتی ہے۔ اگر بیٹا نہ ہو، تو بڑی بیٹی وارث ہوگی۔ اگر دوسرے گھرانے میں اس کی شادی ہو تو دوسری بڑی بیٹی حق دار ہوگی۔ اگر ساری بیٹیوں کی دوسرے گھرانوں میں شادیاں ہوں، تو سبھی وراثت سے محروم ہوں گی۔ اور وراثت دوسرے درجے کے وارث کو پہنچے گی۔ جو شخص لاولد ہوں تو عموماً اپنے قریبی رشتے داروں میں کسی لڑکے یا لڑکی کو گود لیا جاتا ہے۔

شادی— وہ شخص جس کا سلسلۂ نسب باپ یا ماں کی طرف سے سات پشت کے اندر مل جاتا ہو، ایک دوسرے سے شادی نہیں کرتے۔ معززین مجبوری کی حالت میں پانچ پشت سے زیادہ لحاظ نہیں کرتے اور راجاؤں کے درمیان کا پانچ پشت کا بھی بعض اوقات لحاظ نہیں رکھا جاتا۔ معمولی درجہ کے آدمی سات پشت سے زیادہ کا لحاظ رکھتے ہیں۔ 'پھس پون' باہمی طور پر شادی نہیں کرتے۔

لداخی میں 'چوری' یا خفیہ شادی کی رسم بھی ہے۔ عموماً فریقین کو اس کا علم ہوتا ہے لیکن شادی کے اخراجات وغیرہ سے بچنے کے لیے 'چوری' کی شادی ہوتی ہے۔ اس کے مطابق لڑکی کے ایک عزیز کی وساطت سے اس کو لڑکے کے گھر لیا جاتا ہے اور دوسرے روز لڑکی کے ماں باپ سے رسمی طور پر معافی

مانگی جاتی ہے اور باقاعدہ شادی کے لیے ان کی منظوری اور خوشنودی حاصل کی جاتی ہے۔

طلاق — اگر بیوی سے نباہ نہ ہو تو شوہر کو ہر وقت طلاق دینے کا اختیار ہے۔ اس سے ایک گائے یا اس کے برابر قیمت بطور معاوضہ دینی پڑتی ہے اور جس قدر جہیز بیوی کے ساتھ آیا ہے، وہ واپس کرنا پڑتا ہے۔ اگر بیوی طلاق کی خواہش مند ہو تو اس وقت تک شوہر کو طلاق کے لیے مجبور نہیں کر سکتی، جب تک شوہر کی بدسلوکی اور بد چلنی ثابت نہ کرے۔

کثیر الازدواج — مرد کو اختیار ہے کہ اپنی پہلی بیوی کی موجودگی میں اور بیوی یا بیویاں رکھے۔ مگر ایک ساتھ یا ایک وقت تین سے زیادہ بیویاں رکھنے کا دستور نہیں ہے۔ شوہر کو بیوی کی بہنوں پر بھی حق شوہری حاصل ہے۔

وصیت، ہبہ اور وقف لداخ میں نفی کے برابر ہیں۔ وصیت کا بالکل رواج نہیں ہے۔ ہبہ کا دستور بھی بہت کم ہے۔ وقف خاص حالات میں گنپوں کے حق میں کیا جاتا ہے۔

پیدائش — جب اولاد پیدا ہو تو زچہ کے سرہانے ایک چھوٹی میز کے اوپر ایک برتن غلہ سے بھر کر رکھ دیتے ہیں اور اس پر ایک تیر نصب کیا جاتا ہے اور میز کے اوپر ایک ریشمی رومال 'خادقس' آویزاں کرتے ہیں۔ رشتہ دار اور ہمسایہ کھانے کے ساتھ مبارک باد دینے آتے ہیں اور 'خادقس' ریشمی رومال تہنیتی طور پر پیش کرتے ہیں۔

ذی حیثیت لوگ چھ ماہ یا ایک سال بعد بچے کی پیدائش کی تقریب مناتے ہیں۔ تب ناچ گانے اور ضیافت ہوتی ہے۔ لوگ باگ تحائف لاتے ہیں۔ کچھ لوگ سال دو سال بعد کو شوق سے نام رکھواتے ہیں اور بعض خود ہی نام رکھ لیتے ہیں۔

موت — جب تک میت گھر میں رہتی ہے لامے مذہبی مقدس کتابیں پڑھتے ہیں۔ متوفی کے زیورات، لباس وغیرہ کا ایک حصہ اور دوسری اشیا حسب حیثیت لاموں کو پیش کیا جاتا ہے۔ تین سال تک کی عمر کے بچے کی میت کو جلانے کا دستور نہیں ہے۔ اسے مٹی کے برتن میں رکھ کر پہاڑ میں دفن کر دیتے ہیں۔ بچہ بہت چھوٹا ہو، تو گھڑے میں ڈال کر گھر کی دیوار میں چنائی کر دیتے ہیں۔

وزیر حشمت اللہ نے سال نو (لوسر) اور دوسمو چھے کی تقریبات کا قدرے تفصیل سے ذکر کیا ہے جب لداخ کا راجہ بذات خود شامل ہو کر تقریب کی رونق دوبالا کرتا تھا۔ اب یہ داستان پارینہ بنی ہے۔

وزیر کے مطابق لداخ کے قومی تہواروں میں لوسر سب سے بڑا تہوار ہے۔ زمانۂ قدیم میں یہ نوروز کے دن منایا جاتا تھا.......... معززین اور ممتاز اشخاص گیالپو کی خدمت میں سال نو کی مبارکباد دینے اور اپنی عقیدت کے اظہار کے لیے حاضر ہوتے ہیں۔ گیالپو اپنے اہل خاندان سمیت حسب مراتب کمرہ دربار میں رہتا ہے.......... جونگ سونگ لہاسہ کو بھی اسی موقع پر گیالپو کی خدمت میں شرف باریابی حاصل ہوتا ہے اور تحفے پیش کرتا ہے۔

دوسمو چھے سے متعلق وزیر لکھتا ہے۔ 'لداخ کے بودھوں کے عقائد کے مطابق جب کبھی کوئی شخص کسی تکلیف میں مبتلا ہو تو اس کو رفع کرنے کے لیے نجومیوں کے حساب کے مطابق ایک چیز تیار کی جاتی ہے جس کو دوس کہتے ہیں.......... تمام ملک لداخ پر جو تکالیف آئندہ سال آنے والی ہوں، ان کے رفع کرنے کے لیے اس خیال کے مطابق دوسمو چھے یعنی بڑا دوس تیار کیا جاتا ہے۔

والٹر اسبو

والٹر اسبو لداخ میں کام کرنے والے پادریوں میں ایک اہم نام ہے۔ وہ ۱۹۳۷ء میں لداخ آئے اور ملک کی آزادی سے کچھ عرصہ پہلے لداخ سے واپس چلے گئے۔ دُنیا کے مختلف ملکوں سے اسبو کو دلچسپ اور انوکھے خطوط آتے تھے۔

جرمنی سے ایک آدمی نے اسبو کو ایک موم بتی، ایک چھوٹی سی رسی، ایک مرتبان میں شربت اور چند اسفنج بھیجے تھے۔ اس نے اسبو سے درخواست کی تھی کہ وہ ان چیزوں کو لے کر آدھی رات کے وقت اٹھارہ ہزار فٹ بلند ایک گلیشیر تک جائے۔ اسفنجوں کو رسی پر باندھ کر شربت میں ڈبو دیا جائے، پھر لالٹین کی بتی جلا دیں۔ اسی وقت گلیشیر میں سے ایک نادر اور نایاب تتلی نکلے گی۔ اس تتلی کے پر سفید

ہوں گے اور کناروں پر سرخ داغ ہوں گے۔ یہ تتلی یوروپ میں پچاس ڈالر میں فروخت ہوگی۔ اس نے مزید لکھا تھا کہ تتلی برف اور یخ میں رہتی ہے جہاں ایک مضبوط انسان بھی سردی سے ٹھٹھر کر مر جائے گا۔

ایک انگریز نے اپنے خط میں لکھا تھا کہ وہ لیہہ سے چند میل دور ایک مقام پر جائے اور رسی کی مدد سے ایک چٹان پر چڑھے۔ چٹان پر ایک کھوہ میں کالے رنگ اور سرخ چونچ کے ایک نایاب پرندے نے انڈے دیئے ہوں گے۔ اگر انڈے پانچ ہوں تو ان کو اٹھالیں۔ اگر صرف چار ہوں تو ان کو اپنی جگہ رہنے دیں کیوں کہ یہ اصلی پرندے کے انڈے نہیں ہو سکتے اور انتظار کر کے دیکھیں کہ وہ مادہ پانچواں انڈا دیتی ہے یا نہیں۔

بمبئی سے ایک پروفیسر نے ایک خاص قسم کی چند پلیٹیں پارسل سے بھیجی تھیں اور استدعا کی تھی کہ ان کو اٹھارہ ہزار فٹ بلند ایک مقام پر چند ماہ رکھ کر اسے واپس ممبئی بھیج دیں تا کہ وہ ان پلیٹوں پر کائناتی شعاعوں کا اثر دیکھ سکیں۔

ایک امریکی خاتون نے جس کا بھائی معذور تھا، اسبو کو ہمالیائی ریت بھیجنے کی فرمائش کی تھی۔

ایچ آر ایچ پیٹر

ماہر بشریات (Anthropologist) ایچ آر ایچ پیٹر ۱۹۳۸ء میں لداخ آیا۔ وہ یونان اور ڈنمارک کے شاہی خاندان سے تعلق رکھتا تھا اور پرنس پیٹر کے نام سے مشہور تھا۔ اُنھوں نے لیہہ کی سماجی زندگی کا مطالعہ کیا اور قصبے کے چھ کنبوں کا معاشی، سماجی اور ثقافتی طور پر سروے کیا جس کا ذکر اوپر آیا ہے۔ لداخی مکان سے متعلق پیٹر لکھتا ہے: 'یہ تبتی طرز پر پتھروں سے بنا پختہ ہوتا ہے۔ چھت چپٹی، دیواروں پر سفیدی اور دروازوں اور کھڑکیوں پر پینٹ کیا ہوا ہوتا ہے۔ نچلی منزل میں مویشی رکھتے ہیں۔ لداخ میں ہر مکان پر ٹیکس لگتا ہے۔'

۱۹۳۸ء میں لیہہ کی آبادی ۲۳۷۷ تھی۔ اس آبادی میں بودھ ۱۲۸۷، مسلمان ۹۹۱، سکھ اور ہندو

۴۳ اور عیسائی ۵۶ تھے۔ مسلمان ارغون، بلتی، کشمیری، یارقند اور اُوگیور پر مشتمل تھے۔ ان میں ۴۴۷ مرد اور ۴۴۵ عورتیں تھیں۔ پیٹر نے شاید لیہہ میں تب موجود ترکی، کشمیری اور بلتی تاجروں کو بھی مسلمان آبادی میں شامل کیا ہے۔

۱۲۸۷ بودھ آبادی میں ۶۵۰ مرد اور ۶۳۷ عورتیں تھیں۔ ہندوؤں اور سکھوں میں ۳۰ مرد اور ۱۳ عورتیں تھیں۔ لیہہ اور آس پاس کے دیہات میں ۹۰ فی صد شادیاں پولینڈری پر مبنی تھیں۔ بقایا ۱۰ فیصد میں ایسے کنبے تھے، جن کا ایک ہی بیٹا تھا۔

پرنس لکھتا ہے: 'لوگوں کا بڑا پیشہ کھیتی باڑی ہے۔ مرد عموماً ہل جوتتے ہیں یا گھوڑوں کے ساتھ چلتے ہیں اور تجارتی مال فروخت کرتے ہیں۔ عورتیں گائے اور زومو کے دودھ دوہتی ہیں۔ اُنھیں گھاس چارہ کھلاتی ہیں اور کھیتی باڑی میں مردوں کی مدد کرتی ہیں۔

جان سنیلینگ (John Snelling)

وسط ایشیا سے وقتاً فوقتاً اوگیور ترکی، دونگن، قزاق، کرغیز وغیرہ خطے میں سیاسی اُتھل پتھل اور بغاوتوں کی وجہ سے لداخ پناہ لینے آتے تھے جہاں سے یہ کشمیر کے راستے مختلف علاقوں میں نوآبادکاری کے لیے جاتے رہے ہیں۔

نومبر ۱۹۴۱ء میں تین ہزار کرغیز قزاق مغربی تبت میں لوٹ کھسوٹ کے بعد لداخ میں داخل ہوئے۔ وہ ۱۹۳۸ء میں سوویت وسط ایشیا سے اپنے گھروں سے نکلے تھے اور مشرقی ترکستان سے ہوتے ہوئے تبت پہنچے تھے جہاں اُنھوں نے گرمائی صدر مقام گرتوق اور سرمائی صدر مقام غارگونسا میں عمارتوں کو تباہ کیا۔ جان سنیلنگ اور کرغیز کازا کی نے ان کا ذکر کیا ہے۔ اُنھوں نے نیپال میں داخل ہونے کی کوشش کی لیکن گورکھا سرحدی محافظوں نے اُنھیں روک لیا۔ وہ لگ بھگ مسلح تھے اور ان کے پاس ۵۰۰ بندوقیں تھیں۔ انتظامیہ اور ڈوگرہ فوج نے ان کو حکمت عملی سے کام لے کر غیر مسلح کیا۔

لداخ سے اُنھیں کشمیر بھیجا گیا جہاں بہت سارے برفانی زوجی لا پر مر گئے۔ جو بچے ان کو بعد میں ہزارہ میں آباد کیا گیا۔

اے این سپرو

۱۹۴۰ء میں اے این سپرو لیہہ کا تحصیل دار تھا۔ اُنھوں نے لیہہ کا معاشی سروے کیا، جو ۱۹۴۱ء میں شائع ہوا۔ سپرو سے متعلق یہ لکھا گیا ہے کہ لداخ آنے والے دوسرے سرکاری ملازموں کے برعکس وہ لداخیوں کا بڑا ہمدرد تھا اور سود خوروں اور سرکار کی زیادتیوں سے اس کا دل کڑھتا تھا۔ وہ لکھتا ہے۔ 'لداخ کے بغیر قرضوں کے بوجھ سے دبے ہوئے خطّے کا تصور کرنا مشکل ہے اور اس کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ روئے زمین پر ایک غریب ترین خطہ میں سود کی شرح سب سے زیادہ ہے............ایک کسان مقروض پیدا ہوتا ہے۔ مقروض جیتا ہے اور مقروض مرتا ہے۔' جیسا کہ اوپر ذکر آیا ہے کہ سپرو نے لداخی قرض خواہ کو شائیلاک اور میکابر سے تشبیہ دی ہے۔ میکابر، ڈکنز کے ناول ڈیوڈ کوپر فیلڈ کا ایک کیریکٹر تھا۔

سپرو کے سروے کے مطابق لداخ کے متعدد گاؤں قرضوں کے بوجھ میں دبے تھے۔ سپرو نے ان کے اعداد و شمار دیئے ہیں۔

دوسری جنگ عظیم کے دوران لداخ کی حیثیت بڑی خراب تھی۔ وہ لکھتا ہے: 'اس دوران یارقند سے کارواں آنا بند ہو گیا ہے اور لیہہ ''مردوں کا شہر'' لگتا ہے۔ ادھر جنگ کی وجہ سے یوروپ سے سیاح بھی نہیں آرہے ہیں اس لیے لوگوں کی معاشی حالت پر برا اثر پڑا ہے۔'

ایسا ہی لداخیوں کا ایک ہمدرد اہل کار شری دھر کول ڈولو تھا جس کا ذکر اوپر آیا ہے۔ وہ بطور تعلیمی افسر ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۸ء تک لداخ میں رہا۔

جان اے جیکسن (John A. Jackson)

ہندوستان آزاد ہونے سے دو سال پہلے ۱۹۴۵ء میں جان اے جیکسن لڑاکو ہوابازوں کی ایک پارٹی کے ہمراہ کرگل آیا جہاں سے وہ لیہہ کی طرف مولبیک گیا۔ اس نے اپنے سفر کی روداد زیادہ نہیں لکھی ہے۔

دراس کی کڑاکے کی سردی سے متعلق وہ لکھتا ہے 'سردیوں میں لوگ جلے ہوئے اوپلے کے پاس کھانا پکاتے ہیں اور پہلے سے اسٹاک کی ہوئی خوراک استعمال کرتے ہیں'۔

وہ انداز رقم طراز ہے: 'شاید یہاں (دراس) کی خاموشی کو بیچ بیچ میں بھیڑیئے کی غراہٹ (Marmot) میٹھی سیٹی اور برفانی چیتے کی کرخت آواز توڑتی ہوگی'۔

ان دنوں کرگل میں سوئزرلینڈ کی ایک مشنری کام کر رہی تھی جس میں دانیال برگر پادری تھے۔

کرنل شومبرگ (Colonel Rcf Schomberg)

۱۹۴۷ء میں کرنل شومبرگ لداخ آیا۔ اپنے قیام کے دوران لداخی راجہ سمیت مختلف لوگوں سے ان کا رابطہ رہا۔ شومبرگ نے لداخ اور وسط ایشیا میں ہزاروں فوٹو کھینچے۔ بہت سارے یادگاری فوٹو آکسفورڈ یونیورسٹی کے Pit Rivers میوزیم اور رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن میں محفوظ ہیں۔ راقم الحروف نے ۲۰۰۱ میں آکسفورڈ میں لداخ سے متعلق ان کی بہت سی نادر تصویریں دیکھیں۔ ان میں لوپچق مشن کے ارکان، لداخ کے راجہ اور رانی، لیہہ بازار، اور گنپوں کی تصاویر شامل تھیں۔ ان کی نمائش کا اہتمام آکسفورڈ میں لداخ پر منعقدہ ایک سیمینار کے دوران کیا گیا تھا۔

کرنل شومبرگ لداخ کے راستے چینی ترکستان گیا تھا، جہاں اُس نے پانچ سال گزارے۔ انھوں نے چار کتابیں اور متعدد مضامین قلم بند کیے ہیں۔ رایل جیوگرافیکل سوسائٹی نے کرنل کو ان کی علمی خدمات کے لیے گل میموریل ایوارڈ سے نوازا۔

نکول اسمتھ (Nicol Smith)

آزادی سے پہلے لداخ آنے والے آخری سیاح نکول اسمتھ اور مورین تھے۔ یہ امریکی تھے۔ ہندوستان آزاد ہونے سے ایک روز پہلے یہ لداخ وارد ہوئے۔ کرگل میں لوگوں نے جب اُنھیں سلام کیا تو اپنا ردعمل اُنھوں نے ان الفاظ میں ظاہر کیا۔ 'نیویارک کے ففتھ ایوینو میں کسی نے آج تک مجھے سلام نہیں کیا۔'

کرگل میں نیوزی لینڈ کا ایک مشنری کام کرتی تھی جہاں مس ڈریو اور رائے کام کرتے تھے۔ ان کے ہاں سات سے چودہ سال کی عمر کے سولہ شاگرد تھے جو سبھی عیسائی تھے۔

دراس سے آگے مصنف نے دیکھا کہ ایک بیمار لڑکے کو چار آدمی ایک چارپائی پر ایک کھردرے کمبل میں لپیٹے علاج کے لیے سری نگر لے جا رہے تھے۔ یہ کئی روز سے سفر کر رہے تھے۔ اُنھوں نے مصنف سے دوا مانگی لیکن ان کے پاس کوئی دوا نہیں تھی۔

نکول اسمتھ لکھتا ہے: 'لداخی لڑکیاں اجنبیوں کی طرف دیکھتی ہیں جب کہ کشمیری اور بلتی لڑکیاں اجنبیوں کو نہیں دیکھتی اور پیٹھ موڑ لیتی ہیں۔'

موراوین مشن کے پادری والٹر اسبو نے نکول اسمتھ کو بتایا کہ اُنھوں نے کسی لداخی کو گھوڑے یا کتے کو مارتے ہوئے نہیں دیکھا۔ اسبو نے کہا کہ یہ بدھ مت کی تعلیم کا اثر ہے۔ یہ جوں تک کو مارنا گناہ سمجھتے ہیں۔ والٹر اسبو دس سال سے لیہہ میں مقیم تھے۔

اسمتھ رقم طراز ہے: 'آج جس طرح ہوائی جہاز کا انتظار کیا جاتا ہے۔ اُن دنوں لداخی اور دوسرے لوگ سری نگر سے ڈاک ہرکارہ کی آمد کے منتظر رہتے ہیں۔'

لیہہ میں ایک ہندو فوٹو گرافر تھا۔ وہ ایک فوٹو کے لیے چار ڈالر لیتا تھا۔

اسبو نے لداخی راجہ سے مصنف کا تعارف کرایا۔ مصنف کو پہلے اپنے کانوں پر بھروسہ نہیں ہوا۔ اور سوچا کہ اسبو مذاق کر رہے ہیں۔ اسبو نے بتایا کہ راجہ صبح ان کے پاس ۵ روپے ادھار مانگنے آئے

تھے۔ وہ سال میں کئی دفعہ اپنے ستوق کے محل میں پوجا پاٹ کراتے ہیں اور ان پر تقریباً ان کی ساری آمدنی چلی جاتی ہے اور راجہ کو روپیہ پیسہ کی تنگی رہتی ہے۔

راجہ نے لیہہ کے کرزو باغ واپس کرنے کے لیے حکومت کو درخواست دی ہے لیکن اس کی شنوائی نہیں ہوئی۔ کرزو میں گرمیوں میں برٹش جوائنٹ کمشنر کچھ مدت قیام کرتا تھا۔

اسبو نے بتایا۔ راجہ سال میں دو دفعہ پرجا سبھا کے اجلاس میں شرکت کرنے کے لیے سری نگر جاتے ہیں۔ وہ اُس سے جلدی تنگ آ گئے تھے۔ وہاں جا کر حکومت کے اشارے پر ہاتھ اُٹھانا پڑتا تھا۔ ایک دفعہ بیماری کے بہانے وہ کرگل سے لوٹے تھے۔

اسمتھ نے ایک روز دیکھا کہ والٹر اسبو سے ایک لداخی نے تھوڑی دیر بات چیت کی تو اس نے اپنے منہ پر ہاتھ رکھا۔ نکول اسمتھ نے والٹر اسبو سے اس کا سبب دریافت کیا۔ اسبو بولے۔ 'اس کو ڈر ہے کہ کہیں دوسرے کی روح اس کے بدن میں داخل ہو کر اس کو نقصان نہ پہنچائے'۔

ان دنوں لداخی گونا گوں توہمات کے شکار تھے اور ان کے خیالات انوکھے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ کبھی اپنا فوٹو نہ لینے دو۔ اس سے عمر چھوٹی ہوتی ہے۔

آپس میں بات چیت کرتے ہوئے منہ پر ہاتھ رکھو تا کہ دوسروں کی روح جسم میں داخل ہو کر نقصان نہ پہنچائے۔

کسی عورت کے چہرے پر مونچھ داڑھی ہو تو اس عورت کو خوش قسمت سمجھا جاتا تھا۔ کسی جگہ پاگل ہو تو وہ اس بستی کے لیے نیک شگون سمجھا جاتا تھا۔ جسم پر کالا داغ خوش قسمتی اور ترقی کی علامت مانی جاتی تھی۔ کسی کے بدن سے بساندھ آئے تو اس پر دیوی دیوتا کا احسان سمجھا جاتا تھا۔ دودھ، گوشت وغیرہ کو بری نظروں سے محفوظ رکھنے کے لیے اسے کسی چیز سے ڈھک لیتے تھے۔

مذکورہ چند توہمات کے پیچھے عقل مند آدمیوں کی ذہانت کارفرما نظر آتی ہے۔ جنھوں نے یہ کلیہ اس لیے گھڑ لیا تا کہ سماج میں ایک پاگل، مونچھ داڑھی والی عورت، جسمانی داغ یا بو والے کو حقارت کی نظر سے نہ دیکھا جائے۔

اُن دنوں ملک میں فرقہ وارانہ فسادات زوروں پر تھے اور لیہہ میں طرح طرح کی افواہیں گرم تھیں۔ لاہول سے آئے ہوئے تاجروں کے ایک قافلے کلو میں ہو رہے فرقہ ورانہ فسادات کی خبر لائے تھے۔ اکا دکا شرنارتھی لیہہ پہنچے تھے۔

نکول اسمتھ اس روز سری نگر سے ہوائی جہاز میں پرواز کرتا ہے، جس روز قبائلیوں کا سامنا کرنے کے لیے ہندوستان فوج سری نگر ہوائی اڈہ پر اترتی ہے۔

ینگ مینز بدھسٹ ایسوسی ایشن

۱۹۴۸ء میں جب لداخ خبر آئی کہ گلگت پر حملہ ہوا ہے، تو پریزیڈنٹ ینگ منز بدھسٹ ایسوسی ایشن کلون چھوانگ کزین نے نیشنل گارڈز قائم کرنے کے لیے حکومت سے درخواست کی۔ .... بعد میں ۷۰۰ خچروں پر ہتھیار، گولا بارود اور راشن لے کر ۱۵۰ گورکھے لیہہ پہنچے۔

ینگ منز بدھسٹ ایسوسی ایشن کا قیام ۱۹۳۸ء میں عمل میں آیا۔ بعد میں تنظیم کا نام لداخ بدھسٹ ایسوسی ایشن رکھا گیا۔

صنم نربو کی کہانی، وید مہتہ کی زبانی

۱۹۴۸ء کے پر آشوب دور میں لداخ کے سرکردہ انجینئر صنم نربو نے لیہہ کا ہوائی اڈہ تعمیر کیا۔ صنم نربو سری نگر کے ہوائی مستقر کا انچارج تھا۔ فروری میں اُنھوں نے زوجی لا عبور کیا اور لیہہ آ کر اپنا کام شروع کیا۔ لیہہ کی سلامتی کو خطرہ لاحق تھا۔ جن خطرناک حالات میں نربو نے اپنی جان جوکھم میں ڈال کر زوجی لا پار کر کے لیہہ کا ہوائی اڈہ تعمیر کیا، اس کی روداد ہندوستانی نژاد کے ایک امریکی ادیب وید مہتہ کو سنائی، جو لداخ آیا تھا۔ ہم یہاں وید مہتہ کا انٹرویو اختصار کے ساتھ پیش کرتے ہیں جو اس نے اپنی کتاب Portrait of India میں شامل کیا ہے۔

"میں ایک رات صنم نربو سے ان کے دفتر میں ملا۔ میں نے نربو سے سوال کیا کہ لیہہ کے ہوائی

اڈہ کی تعمیر کے محرکات کیا تھے؟' زبو بولے 'اکتوبر ۱۹۴۷ء میں جب قبائلی کشمیر پر قبضہ جمانے کے لیے آئے تو ریاستی سرکار کو تشویش ہوئی کہ لداخ پر حملہ ہوگا۔ میں ان دنوں سری نگر کے ہوائی مستقر کا انچارج تھا جو کشمیر میں ہندوستانی فوج کی نقل و حرکت کا واحد اڈہ تھا۔ دسمبر کا مہینہ اور سنہ ۱۹۴۷ء تھا۔ ایک دن ڈی پی درنے جو ہوم سکریٹری تھا، مجھ سے پوچھا۔ 'زبو' کیا آپ لیہہ تک فوج کے افسروں اور جوانوں کی ایک پارٹی کی قیادت کریں گے؟ وہاں آپ کو ایک ہوائی اڈہ تعمیر کرنا ہے۔ اس موسم میں لیہہ سفر کرنا انتہائی خطرناک تھا۔ تاہم میں نے درسے کہا۔ 'میں یہ ذمہ داری قبول کرتا ہوں۔'

میں ۷ افروری کو فوجی گاڑیوں کے ایک بڑے قافلے کے ساتھ روانہ ہوا۔ کرنل عبدالعزیز ان کی قیادت کررہے تھے۔ اس سے ایک روز پہلے دو فوجی افسر لیفٹیننٹ کرنل پرتھوی چند اور لیفٹیننٹ کرنل ہوسا جن چند جوانوں کے ہمراہ زوجی لا روانہ ہوئے تھے۔ ہم سری نگر سے صرف ۱۸ میل دور گاندربل پہنچے تھے کہ سخت برف باری شروع ہوگئی۔ چنانچہ بڑی مشکل سے ہم ۱۵ میل آگے سفر جاری رکھ سکے۔

کرنل عزیز مجھ سے بولے 'میری ساری گاڑیاں برف میں پھنس گئی ہیں۔ آپ کا کیا ارادہ ہے؟'

'میں پیدل روانہ ہوتا ہوں۔' میں نے کہا۔ 'میرا ہراول نگہبان دستہ یہاں سے ۱۲ میل دور گونڈ میں میرا انتظار کررہا ہوگا۔'

'ہراول دستہ حسب توقع گونڈ میں ہمارا منتظر تھا۔ زبردست برف پڑ رہی تھی۔ ہم گونڈ میں سات دن اور سات راتیں پھنسے رہے۔ میں نے ۱۵۰ قلیوں کو مزدوری پر لیا تھا۔ آٹھویں روز ہم سونمرگ پہنچے۔ ریاستی ملیشیا کے بریگیڈیئر فقیر سنگھ ہمارا انتظار کررہے تھے۔ بریگیڈیئر بولے۔ 'آگے جانا ممکن نظر نہیں آتا۔'

'لیکن ہمیں جانا ہوگا۔' میں نے کہا۔

'دوسری صبح میں ڈھائی بجے اُٹھا۔ میں نے تمام قلیوں کو جگایا اور ان کو اپنا سامان اُٹھانے کے لیے کہا۔ اُنھوں نے چیخنا چلانا شروع کر دیا۔ 'کیا آپ ہم کو موت کے منہ میں دھکیلنا چاہتے ہیں؟' میں نے التجائیں کیں اور دھمکیاں دیں۔ برف بھری بھری تھی۔ ہم ایک قدم برف پر رکھتے اور گلے تک برف میں دھنس جاتے۔ ہم اس برف میں سفر کرتے رہے اور بالتال تک ۸ میل کا سفر مسلسل ۱۶ گھنٹوں میں طے کیا۔ میں بالتال کے ڈاکیہ سے ملا اور اس کو کہا کہ وہ ہمیں محفوظ ترین راستے سے زوجی لا پار کرنے میں مدد کرے۔ قلیوں نے ساری رات آہ وزاری میں کاٹی۔ تاہم ہم نے صبح ساڑھے تین بجے سفر شروع کیا۔ آندھی کے بگولے بار بار چلنے لگے۔ کئی دفعہ ہم ہاتھوں اور گھٹنوں کے سہارے اور کبھی پیٹ کے بل رینگ کر چلنے لگے۔ ۱۱ بجے سب صحیح وسلامت زوجی لا کی بلندی پر پہنچے۔ پھر ایک بڑی پسی گری، جو قلیوں کے سامنے سے گزر گئی۔ اور کسی قلی کو آنچ نہیں آئی۔ یہاں سے کچھ آگے میں نے کشمیر کی طرف سے آئے ہوئے قلیوں کو چھٹی دی اور قریب کے دیہات سے نئے قلی لیے۔'

'آپ کب لیہہ پہنچے؟' میں نے نربو سے پوچھا۔

'۸ مارچ کو ہم لیہہ پہنچے اور ہم نے فوری طور پر ہوائی اڈہ کی تعمیر کا کام شروع کیا۔ ڈیڑھ ماہ میں ہوائی اڈا مکمل کرنا تھا۔ میں روزانہ مسٹر در سے پوچھتا تھا کہ وہ کب آزمائشی اُڑان کے لیے لیہہ طیارہ بھیج رہے ہیں؟ جب قبائلی لیہہ سے صرف ۱۵ میل دور رہ گئے مجھے مسٹر در کا یہ پیغام ملا کہ اس روز ایک ہوائی جہاز ہوائی اڈے پر اُترنے کی کوشش کرے گا۔ مئی کی ۲۴ تاریخ تھی۔ موسم سہانا تھا۔ ہوائی جہاز اُترا۔ دروازہ کھلا اور اس میں سے ہوا باز ایئر کموڈور مہر سنگھ اور جرنیل کے ایس تھمایا نکلے۔

۲۷ مئی کو پانچ جہاز اُترے۔ ہوائی جہاز لداخیوں کے لیے لوہے کے اُڑان گھوڑے تھے۔ لداخیوں کا ایک ہجوم ٹوکریوں میں گھاس لائی تھی۔

ویدمہتہ نے لکھا ہے: If we lose our airstrips then we lose Ladakh

دوسرے لفظوں میں صنم نربو نے ہوائی اڈہ نہ بنایا ہوتا تو لداخ کا دفاع نہیں ہو سکتا تھا۔

۱۹۴۸ء میں لداخ کے فوجی کمانڈر ایچ ایس پرب نے لیہہ میں ایک وزارتی کونسل بنائی۔ پادری نارمن ڈرائیور کو وزیراعظم اور مسز ڈرائیور کو وزیر صحت بنایا۔ تین مقامی سرکردہ افراد کلون چھوانگ رگزین کو وزیر دفاع، خواجہ عبداللہ شاہ کو وزیر داخلہ اور ایلی ایز رجولدن کو وزیر تعلیم بنایا۔ تاہم یہ کابینہ برائے نام تھا۔ دو مہینے بعد وزیراعظم مستعفی ہوا۔

مہندر بھال

مہندر بھال بھارتی فضائیہ میں غالباً ہواباز تھا۔ غالباً ۱۹۴۸ء میں لداخ آیا تھا۔ وہ اپنی کتاب I was on the Kashmir Front مطبوعہ ۱۹۴۸ء میں لکھتا ہے:

'لداخ فرشتوں کا دیش ہے۔ میرے لیے یہ دُنیا میں ایک ایسی جگہ ہے، جس کو میں زندگی میں دوبارہ دیکھنا چاہوں گا۔ جگہ کی خوبصورتی کے لیے اتنا نہیں، جتنا لوگوں کے لیے، جو وہاں رہتے ہیں۔ ان دوستوں کے لیے، جن سے میں نے وہاں دوستی کی ہے۔..........آپ توقع نہیں کر سکتے کہ انسان فرشتے ہوں گے۔ بھلا کون بے داغ انسان ہوں گے؟ لیکن ایک معاشرہ رواداری، دیانت داری اور بھائی چارہ جیسی خصوصیات کا مظاہرہ کرے اور عورتوں کا بڑا احترام کرے، اس فسادزدہ دُنیا میں اس پر رشک کیا جانا چاہیے، اور یہ لداخ ہے۔

جب میں لداخ سے نکلا میرا دل چاہنے لگا کہ میں اپنے آپ کو ایک بودھ کہوں۔ میں کبھی مذہبی نہیں تھا لیکن لداخ نے مجھے بدھ مت کے جوہر کا مداح بنا دیا۔

کرنل پی این کول

فروری ۱۹۴۹ء میں کرنل پی این کول نے ستائیسویں جے اینڈ کے ملیشیا کے بٹالین کمانڈر کی

حیثیت سے لیہہ میں اپنا عہدہ سنبھالا۔کول نے Frontier Callings کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے، جو اس زمانے کی سماجی زندگی اور سیاسی حالات پر مختصر روشنی ڈالتی ہے۔

وہ لکھتا ہے: 'جب شام کا دھندلکا ہوتا تو لوگ لیہہ بازار میں ایک گھنٹہ کے لیے پہنچتے۔اندھیرا چھا جانے سے پہلے کچھ انسانی سرگرمیاں ہوتیں'۔

قصبہ میں ملنے کی ایک اہم سماجی جگہ کرزُوچھومیک (چشمہ) تھی۔چشمہ جانے والی تنگ گلی Lovers Lane کوئے جاناں کے نام سے جانی جاتی تھی۔شام کو قصبے کی لڑکیاں گاگرلے کر یہاں پانی لینے آتیں'۔

کول لکھتا ہے: 'اگست ۱۹۵۰ء میں پہلی جیپ لیہہ پہنچی۔(یہ ہوائی جہاز میں لائی گئی تھی) پاکستانی فوج کا ایک پلاٹون لڑائی کے بعد زنسکار میں پھنس گیا تھا۔کرنل کول نے اس پلاٹون کو جنگ بندی کے چھ ماہ بعد واپس سکردو بھیج دیا۔

کول رقم طراز ہے: 'چین میں کمیونسٹ برسراقتدار آنے کے بعد ۱۹۵۰ء میں مشرقی ترکستان سے کئی ہزار مسلمان بھاگ کر لیہہ آئے جنھیں بذریعہ ہوائی جہاز سری نگر بھیجے گئے جہاں سے وہ بعد میں مشرق وسطیٰ اور ترکی چلے گئے۔ہندوستانی کونسل جنرل ۱۹۵۰ء میں کاشغر سے لیہہ پہنچا۔اسی طرح اُرمچی سے امریکی کونسل جنرل اور کاشغر سے انگریز نائب کونسل لیہہ پہنچے۔

۱۹۵۹ء میں مصنف بھارتی کونسل جنرل کی حیثیت سے لہاسہ روانہ ہوا۔وہاں درجنوں لداخی لاما تھے جو زیادہ تر ٹھکسے اور پھیانگ گنپوں سے تعلق رکھتے تھے۔چینی وزارت خارجہ کو کئی احتجاجی مراسلے لکھنے کے بعد ان میں سے اکثر کو لداخ واپس جانے کی اجازت دی۔

آزادی کے بعد لداخ کو سیاحوں کے لیے بند کر دیا گیا۔تاہم چند سیاح گاہے گاہے لداخ وارد ہوئے۔ان کے لکھے گئے سفرنامے دستیاب ہیں۔لداخ آنے کے لیے اکثر نے غالباً حکومت سے اجازت لی ہوگی۔بلا اجازت آئے ہوئے چند سیاحوں کو کرگل سے واپس کیا گیا تھا۔

ولیم ڈوگلس

اگست ۱۹۵۱ء میں ایک امریکی جج ولیم ڈوگلس لداخ کی سیاحت پر آیا۔اس نے اپنے سفرنامہ Beyond the High Himalayas میں لداخ کی مختصر تاریخ، بدھ مت اور پولینڈری کے تذکرے کے علاوہ چند لداخی گیتوں کا انگریزی ترجمہ دیا ہے۔

لداخ کے سودخوروں کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے کہ ان کے احوال سن کر اُن سے بڑے لالچی قرض دہندوں کو بھی جھرجھری آئے گی۔

وہ رقم طراز ہے۔'میں ٹنٹناتی گھنٹیاں باندھے خچروں کے ساتھ جنوبی پھاٹک سے لیہہ میں داخل ہوا تھا جہاں سے پرتگال کے پادری اذے ویڈو اور ڈی اولیویرا داخل ہوئے تھے۔خچروں کی گھنٹی کی آواز سن کر ہر ایک دوڑتا ہوا آیا۔ جراب بننے والی ایک عورت، شلغم اور انڈے بیچنے والی عورت.......... حیرت سے مجھے دیکھنے لگیں۔

ولیم ڈوگلس نے ذیل کے ایک لداخی گیت کا ترجمہ کیا ہے۔

میں جب شہر کے پھاٹک پر پہنچا	اُنھوں نے اُسے میرے سامنے بند کیا
اے لداخ کے گلاب	میں تجھے سلام کرتا ہوں
میں اپنی زندگی تیری	دھرتی پر نچھاور کرتا ہوں
اے لداخ کے گلاب	میں تجھے سلام کرتا ہوں

لداخیوں سے متعلق وہ اپنے تاثرات یوں بیان کرتا ہے: 'لیہہ کے لوگ ان تفکرات سے نابلد لگتے ہیں، جن کا میں ذکر کرتا ہوں۔اُن کے پاس بہت کم چیزیں ہیں۔وہ زیادہ کی توقع بھی نہیں رکھتے۔وہ اپنی قسمت پر شاداں ہیں۔وہ دوست منش، خوش وخرم، سادے اور سیدھے لوگ ہیں۔

اس نے لیہہ کی آبادی چار ہزار بتائی ہے اور قصبے میں طوائف کی موجودگی اور ان کی تعداد بتائی

ہے۔ایک لداخی لڑکی ذیلہ مصنف کو ایک رومانی گیت سناتی ہے جس میں عاشق پوچھتا ہے کہ کیا تم نے میری محبوبہ کو نہیں دیکھا؟ اجنبی جواب دیتا ہے۔ میں تمہاری محبوبہ کو نہیں جانتا۔ عاشق پوچھتا ہے۔'چھرنگ سکیت کو نہیں جانتے جس کی زُلفیں دراز ہیں۔عاشق اسی طرح اجنبی کے ساتھ سوال وجواب میں محبوبہ کی ستواں ناک،سروقد اور موتی جیسے دانتوں کا ذکر کرتا ہے۔

انتونیا ڈیکوک (Antonia Deacock)

۱۹۵۸ء میں تین جوان یو۔ڈپی عورتیں اینی(Anne)،ایو(Eve)اور مصنفہ انتونیا ڈیکوک منالی سے لداخ کے علاقہ زنسکار پہنچیں۔انتونیا نے اپنی کتاب میں زنسکار کے قدرتی مناظر کی تعریف کی ہے جہاں کہیں کہیں جنگلی پھول بکثرت اُگتے ہیں۔تاہم سفر کو وہ مشقت خیز اور صبر آزما بتاتی ہے۔

وہ لکھتی ہے:'زنسکار میں کھانے پینے کی چیزوں کی دستیابی بڑی مشکل ہے۔کچھ انڈے ملے،جنھیں ہم نے بڑی احتیاط سے استعمال کیے..........لوگ دوائیاں مانگتے ہیں۔علاج ومعالجہ کے لیے مریضوں کو ۸ دن کی مسافت طے کر کے کرگل لے جانا پڑتا ہے..........لوگوں میں غیر ملکیوں کو دیکھنے کا بڑا تجسس ہے۔ہمارے کیمپ پر بڑی بھیڑ لگتی ہے۔لداخ کے دوسرے علاقوں کی طرح زنسکار میں بھی جرائم نہیں ہوتے یا شاذ ونادر ہی ہوتے ہیں۔

پیرسے گرویس (Pearce Gervis)

۱۹۵۴ء میں پیرسے گرویس نام کا ایک سیاح لداخ وارد ہوا۔

عام لداخیوں سے متعلق اُس نے اپنے تاثرات یوں قلم بند کیے ہیں:

'آج یہ اپنی قسمت پر قانع ہیں۔ایک دن جب یہ نیند سے جاگیں گے اور اس سنگلاخ بنجر زمین غریب دیش میں دولت کی فراوانی ہوگی تو مجھے یہ خیال آتا ہے کہ کیا یہ آج سے زیادہ خوش ہوں گے؟

پیر سے کا خیال ہے کہ لوگوں کی سوچ اور عمل کی تشکیل میں مذہب کا بڑا ہاتھ ہے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے: 'مذہب لوگوں کی زندگی میں سب سے بڑی طاقت ہے (جسے) ان میں بڑی خوبیاں ہیں۔'

مارچ ۱۹۵٦ء اور اکتوبر ۱۹۵۷ء کے درمیان چین نے لداخ کے علاقہ اُکسائی چین میں سڑک بنائی۔ ہندوستان نے اپنے دعوے میں تاریخی شہادت پیش کی کہ یہ علاقہ ہندستان کا رہا ہے۔ یہ سڑک دمجوق کے پاس سے مغربی تبت جاتی ہے۔

لوبزانگ جیواکا

لوبزانگ جیواکا اندازاً ۱۹۵۹ء میں لداخ آیا۔ وہ ایک انگریز ڈاکٹر تھا۔ لداخ کے ایک گنپہ ریزونگ میں بطور ایک نوآموز بھکشو''گیڑول'' تین ماہ رہا۔ ۱۹٦۲ء میں لبزانگ جیواکا نے An English Buddhist in Rizong Monastery کے نام سے اپنی کتاب میں اپنے مشاہدات اور تجربات کو پیش کیا ہے۔ کتاب میں کہیں اصلی نام نہیں دیا ہے۔ اس سے پہلے ورانسی میں اس کی ملاقات ایک لداخی بھکشو لامابزانگ سے ہوئی جنھوں نے تبتی بدھ مت کے تئیں جیواکا کی دلچسپی دیکھ کر اس سے لداخ کے ریزونگ گنپہ میں نوآموز بھکشو بننے کی صلاح دی۔ گنپہ اپنے نظم وضبط کے لیے مشہور ہے۔ کوشوق بکولا کی سفارش پر، جوان دنوں ریاست جموں وکشمیر کی کابینہ میں وزیر تھے، جیواکا کو لداخ جانے کی اجازت ملی۔ لامابزانگ نے لداخ کے سفر میں اس کا ساتھ دیا۔ اسے پہلے ایک بڑے لامالوچس رینگیو چھے نے اس کو لامابرادری میں شامل کیا تھا۔

ریزونگ گنپہ سے ۴کلومیٹر دور ایک سنسان جگہ پر سرراہ سامان رکھ کر جب لامابزانگ ریزونگ گنپہ کی طرف روانہ ہوئے تو جیواکا قدرے حیرت سے لاما کو دیکھنے لگا۔ لامالبزانگ بولے۔ 'سامان کوئی لینے آئے گا تب تک یہاں رہے گا۔ لداخ میں کوئی چوری نہیں کرتا۔ یہ دوسرے مقامات کی طرح نہیں، جہاں پلک جھپکنے میں چیز غائب ہو جاتی ہے۔'

اس کے ساتھ اس کا اسٹیتھسکوپ، جراحی کے چند چھوٹے اوزار، فرسٹ ایڈ کا سامان تھا۔

لوبزانگ جیوا کا نے پہلے ہی کہا تھا کہ وہ ایک غیر ملکی ڈاکٹر ہونے کے باوجود کسی مراعات کا خواہاں نہیں ہے۔ دوسرے روز گنپہ کے بڑے لاما راس رینگبو چھے نے جیوا کا کو گنپہ کے باورچی خانہ میں رکھا جہاں اس کو عام باورچی کی طرح کام کرنا پڑتا تھا جس میں پانی لانا اور لکڑی ڈھونا شامل تھا۔ باورچی خانے میں ۳ بچے سمیت ۱۸ افراد تھے۔

ایک صبح جیوا کا کو اچانک لندن کلب کی آسائشیں یاد آئیں جہاں آرام دہ بستر تھا اور ٹرالی پر ٹوسٹ، مربہ، انڈا اور bacon (سور کا نمکین خشک گوشت) پر مشتمل لذیذ ناشتہ لایا جاتا تھا۔ وہ لکھتا ہے: 'میں خوابوں کے اس طلسم سے فوراً باہر آیا اور لندن کلب بھول گیا۔'

خوش اخلاقی اور ایک دوسرے کو قدرے جھک کر کورنش بجالانا گنپہ کے قواعد اور ضوابط میں شامل تھا۔

لوبزانگ جیوا کا ناگواری سے لکھتا ہے کہ اس کے چھوٹے سے کمرے میں دوسرے ساتھی بن بلائے گھس آتے، گپ شپ کرتے۔ اس سے سوال پوچھتے۔ اونچی آواز میں کتاب پڑھتے اور اس کی پڑھائی میں مخل ہوتے تھے۔ ایسے ماحول میں کام کرنا مشکل تھا۔ اس نے ایک لاما گیلونگ سمستن کو اپنی بپتا سنائی۔ اُس سے کچھ فرق پڑا۔

گنپہ کے لاما ہر فن مولیٰ تھے۔ ضرورت کے مطابق گنپہ میں بطور ترکھان، درزی، مصور، معمار، باربردار، محرر اور گھریلو نوکر کام کرتے تھے۔ لوبزانگ جیوا کا چھ فٹ لمبا گیلونگ جمیانگ کا خصوصی طور پر ذکر کرتا ہے اور لکھتا ہے۔ وہ انگریز فلم اداکار ریکس ہریسن سے مشابہت رکھتا تھا۔ وہ سب سے طاقت ور تھا اور رینگبو چھے اور دوسرے کو شوق کا پانی بھرا پیتل کا بڑا برتن اوپر کی منزل تک لے جاتا تھا۔

جیوا کا ہمس شوکپا چن کے سفر کا ذکر کرتا ہے، جہاں رینگبو چھے سمیت متعدد لاما جاتے ہیں اور اچھی فصل کے لیے پوجا کی جاتی ہے۔ جیوا کا نے گاؤں کے پست دروازوں کا ذکر کیا ہے، جن سے اس کے سر اور پیشانی کی خوب مرمت ہوتی ہے۔

ایک روز گیلونگ سمستن اس کو ایک چلتا ہوا استارہ سے متعلق بتاتا ہے۔ مصنف کے خیال میں یہ اُڑان طشتری ہے۔ تاہم عام خیال یہ ہے کہ یہ روس کا ایک خوف ناک جاسوسی طیارہ ہے۔ لیکن گمپہ کے لاما روس سے زیادہ چین سے خوف زدہ ہیں۔

ایک روز جیوا کا نے تازہ خوبانی سے انگریزی کھانا بنانے کی اجازت مانگی۔ خوبانی اُبالنے کی بات سن کر سبوں کو اچنبھا ہوا۔ پہلے اس نے رینگبو چھے اور کوشوق کو ان کا حصہ پیش کیا۔ اُنھوں نے ایک ایک لقمہ لیا اور واپس کیا۔ جیوا کا کے الفاظ میں ایک لاما تشی نے اسے انسانی استعمال کے لیے نا قابل سمجھ کر پھینک دیا۔

جیوا کا نے گیلونگ سمستن کو کاغذ بناتے ہوئے دیکھا اور پھر لکڑی کے بلاک پر سیاہی پوت کر اس کی تحریروں کو کاغذ کے صفحات پر چھاپتے دیکھا۔

ایک روز ڈاکٹر کرن سنگھ کی علالت کی خبر سن کر جیوا کا لیہہ روانہ ہوا۔ ڈاکٹر کرن سنگھ ان دنوں صدر ریاست تھے اور لیہہ دورے پر آئے تھے۔ سری نگر میں جیوا کا سے اُن کی ملاقات ہوئی تھی۔

لیہہ سے واپسی پر ایک فوجی افسر یوسف علی نے جیوا کا کو اپنی جیپ میں لفٹ دی۔ یوسف علی نے انگلستان میں تعلیم حاصل کی تھی۔ وہ یوسف علی سے ایک ساتھ کئی سوالات پوچھتا ہے۔ 'کیا چرچل زندہ ہے؟' ان تین ماہ کے دوران کیا خاص واقعہ پیش آیا؟ تین ماہ پہلے جب سے میں نے کشمیر چھوڑا، کوئی اخبار نہیں دیکھا۔'

وہ خاص کر متحرک اور رواں دواں ستارے سے متعلق دریافت کرتا ہے اور پوچھتا ہے—

'کیا وہ کوئی اُڑان طشتری ہے؟'

'ارے، وہ تو سپوتنیک تھا۔ روسی یا امریکی، مجھے یاد نہیں' یوسف علی بولا۔

اسی اثنا میں لداخ میں اس کے رہنے کے ویزا کی معیاد ختم ہو جاتی ہے اور پولیس اس کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔ اور جیوا کا جانے کی تیاری کرتا ہے۔

اگلی بہار میں جیوا کا دوبارہ ریزونگ گنپہ آنے کا متمنی ہے کوشوق کہتے ہیں۔ اگلی دفعہ جب وہ آئے گا تو اس کا رُتبہ بڑھا کر اس کو گنپہ کی لائبریری میں رکھا جائے گا۔'

جیوا کا ریزونگ سے لیہہ آیا۔ سپتک میں اس کو لداخ میں پہلی دفعہ کھانے کو گوشت ملا۔ جس کا ذکر وہ بڑے چاؤ سے کرتا ہے۔

لو بزانگ جیوا کا کی پرانی پھٹی ہوئی چپل اس کے لیے تکلیف دہ تھی۔ سپتک میں اس نے رینکبو چھے کو اپنی چپل دکھائی اور لداخی پاپوش خریدنے کے لیے ۲۵ روپیے اُدھار مانگے۔ رینکبو چھے نے تیس روپیے دیئے۔

ایک فوجی طیارے میں وہ لیہہ سے لوٹا۔ کوشوق بکولا اور اس رینکبو چھے نے اس سے الوداع کیا۔

۱۹۷۴ء میں لداخ کو سیاحت کے لیے واگزار کیا گیا۔ اور ملکی اور غیر ملکی سیاحوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہوا۔ لیکن ملکی سیاحوں کی تعداد گزشتہ دو دہے کے دوران بہت کم رہی۔ ۱۹۷۴ء میں جہاں ۵۵۱ غیر ملکی سیاح آئے، ملکی سیاحوں کی تعداد ۲۷ تھی۔ دو سال بعد ۱۹۷۶ء میں ملکی سیاحوں کی تعداد ۲۵۳ تھی، اس کے برعکس غیر ملکی سیاحوں کی تعداد ۴۵۸۰ تھی۔ اس کے بعد سیاحوں کی تعداد میں بتدریج اضافہ ہوا۔ کشمیر میں نقص امن کو وجہ سے سیاحوں کی تعداد میں جمود کی حالت بھی رہی۔ سندھو درشن کی تقریبات کے انعقاد سے ملکی سیاحت کو تقویت ملی ہے۔ ۱۹۰۶ء کے دوران محکمہ سیاحت کی رپورٹ کے مطابق ۴۰ ہزار سے زیادہ سیاح لداخ آئے۔ ان میں تقریباً آدھے گھریلو سیاح تھے۔ ۱۹۰۹ء میں سیاحوں کی تعداد لگ بھگ اسّی ہزار تک پہنچی ہے، جن میں زیادہ تر ملکی سیاہ ہیں۔

لداخ آنے والے غیر ملکی سیاحوں میں ریسرچ اسکولر، عالم، ادیب، تاریخ دان، سائنس دان وغیرہ ہوتے ہیں۔ جنھوں نے لداخ پر تحقیقی کام کیا ہے اور لداخ کی تاریخ، تمدن اور ثقافت کو دُنیا کے سامنے بہتر طور پیش کیا ہے۔ اُنھوں نے ان موضوعات پر بھی کام کیا ہے، جن پر ماضی میں لداخ آنے والے محققوں اور سیاحوں کی نظر نہیں پڑی تھی۔ کئی سماجی کارکنوں اور محققوں نے لداخ کے موجودہ مسائل کی نشان دہی کی ہے اور ان کے حل پیش کیے ہیں۔ کئی خطے کی تعمیر و ترقی میں عملی طور پر شریک کار ہوئے ہیں۔ اُنھوں نے ماحولیات کے تحفظ، آثار قدیمہ کی تجدید، تعلیم، صحت

وغیرہ کے لیے تکنیکی اور مالی امداد فراہم کی ہے۔ تقریباً ہر سال کوئی نہ کوئی ریسرچ اسکالر لداخ آتا ہے، جو اپنے تھیسس کے لیے موضوع انتخاب کرتا ہے۔ چند موضوعات بڑے دلچسپ اور انوکھے ہوتے ہیں۔

اسی دوران ملکی اسکالر بھی لداخ آئے۔ جنھوں نے لداخ پر تحقیقی کام کیا، تھیسس لکھے اور لداخ کے عصری مسائل میں دلچسپی لی۔ ان اسکالروں میں چند اہم نام ڈاکٹر روہیت وہرا، ڈاکٹر منیشا احمد، ڈاکٹر روینہ اگروال اور پروفیسر ہرجیت سنگھ ہیں۔

اس ضمن میں خطے کو سیاحت کے لیے کھولنے سے پہلے ایک اہم نام ڈاکٹر سنیو گتا کوشل ہے۔ جنھوں نے لداخی عام بول چال زبان پر ریسرچ کی اور اس موضوع پر کئی کتابیں لکھیں۔ جن میں بول چال لداخی کی لغت اور گرامر شامل ہیں۔

ہیلنا نوربرگ-ہوج (Helena Norberg–Hodge)

ہیلنا نوربرگ ہوج ۱۹۷۴ء میں لیہ آئی، جب لداخ کو سیاحوں کے لیے کھولا گیا۔ اس نے Ladakh Ecological Development Group اور Women Alliance کے نام سے یکے بعد دیگرے لیہہ میں دو غیر سرکاری تنظیمیں قائم کیں۔ یہ تنظیمیں خطے میں بڑی کامیاب ہیں اور ان سے ہزاروں لوگ وابستہ ہیں۔ ہیلنا کے تاثرات اور نجی خیالات قابل غور ہیں۔ اس کی مقبول کتاب Ancient Futures Learning from Ladakh یہ بتاتی ہے کہ لداخ کا ماضی اس کے مسرت ناک مستقبل کا ضامن ہے۔ وہ لکھتی ہے: 'جب میں پہلے پہل لداخ پہنچی تو لداخ مغرب سے متاثر نہیں ہوا تھا۔ لیکن بڑی تیزی سے تغیر و تبدل آیا۔ اس سال ۱۹۹۱ء میں میں نے لداخ اور سپین کے دور اُفتادہ پہاڑوں میں ایک جیسی کھلونوں کی دُکانیں دیکھیں۔ دونوں مقامات پر خوب صورت نیلی آنکھوں والی Barbie گڑیائیں اور مشین گن اُٹھائے Rambos فروخت ہوتے ہیں۔'

بقول مصنفہ لداخی صدیوں سے جمع کردہ اپنا علم ختم کررہے ہیں۔ وہ رقم طراز ہے: 'لداخ میں ایک ایسا سماج تھا جہاں کوئی چیز ضائع نہیں ہوتی تھی۔ ایک ایسا سماج جس میں عملی طور پر جرم نہیں ہوتا تھا۔ لوگ مضبوط اور صحت مند تھے۔ کثافت نہیں تھی۔ وہ اس صورت حال کو مغرب کی اندھا دُھند پیروی قرار دیتی ہے۔ دُنیا میں دیہی علاقوں میں لاکھوں نوجوانوں کو جدید مغربی کلچر اپنی ثقافت سے بہتر نظر آتا ہے۔ اس میں تعجب کی بات نہیں ہے۔ وہ اوپر اوپر سے جدید دُنیا کے مادّی رُخ کو دیکھ سکتے ہیں۔ جس کے لیے مغربی کلچر کو فوقیت حاصل ہے۔ اچانک مغرب کے اثر کی وجہ سے خاص کر لداخی نوجوانوں میں احساس کمتری آیا ہے۔ وہ اپنے کلچر کو کلی طور پر مسترد کرتے ہیں اور اس کی جگہ نئے کلچر کو سینے سے لگاتے ہیں۔ وہ جدیدیت کی علامتوں جیسے دھوپ چشمہ، واک مین اور بلیو جنز کے پیچھے دوڑتے ہیں.........اس لیے نہیں کہ جنز زیادہ دلکش یا آرام دہ ہیں بلکہ یہ جدید زندگی کی علامتیں ہیں۔

وہ گاؤں کے ایک نوجوان داوا کی مثال دیتی ہے۔ جب وہ گاؤں میں رہتا تھا۔ تب وہ پندرہ سال کا تھا۔ سیاح آئے تو وہ گائڈ بنا۔ پھر اپنی ٹورسٹ ایجنسی کھولی۔ ایک روز مصنفہ نے داوا کو لیہہ بازار میں دیکھا۔ دھوپ چشمہ، ٹی شرٹ، جس پر امریکی روک بینڈ کا اشتہار تھا۔ تنگ جنز اور باسکٹ بال جوتا پہنا تھا۔

'میں نے مشکل سے پہچانا؟' میں نے لداخی زبان میں داوا سے کہا۔

'کیا تھوڑا سا بدلا ہوں؟' اس نے فخر سے انگریزی میں جواب دیا۔

ہم ریستوران میں گئے۔ داوا انگریزی میں بات چیت کرنے کے لیے مصر تھا۔

داوا ہیلنا کو فخر سے بتاتا ہے کہ وہ خوب روپیہ کمارہا ہے۔ پھر وہ اپنی گرل فرینڈ کا ذکر کرتا ہے، جو ہالینڈ کی رہنے والی ہے۔

ہیلنا لکھتی ہے: 'آج لداخی کسانوں کو نیپالی یا ہندوستانی قلیوں پر انحصار رکھنا پڑتا ہے۔ آپسی تعاوُن کا زمانہ ختم ہوا ہے۔ ایک کسان کو اس بدلتی معیشت میں کام کرنا مشکل ہوتا ہے۔ اُجرت زیادہ

بڑھی ہے۔امیروں اور غریبوں کے درمیان تفاوت بڑھا ہے۔ اپنوں میں مروّت ختم ہوگئی ہے۔
آج اسکولوں میں اُن لوگوں کی کتابیں سیکھنی پڑتی ہیں۔ جنھوں نے لداخ میں کبھی قدم نہیں رکھا ہے۔لداخ کا بالکل اَتہ پتہ نہیں ہے۔

جب میں پہلی مرتبہ لیہہ آئی۔ یہ ایک پیارا قصبہ تھا۔صرف دو بازاروں میں تارکول لگے تھے اور شاذ و نادر ہی کوئی گاڑی نظر آتی تھی۔صرف گاڑیوں کی بھیڑ بھاڑ سے آمد و رفت میں رُکاوٹ آتی تھی۔ فضا بالکل صاف ستھری تھی۔ اتنی صاف ستھری تھی کہ وادی میں بہت دور بیس میل یا اُس سے زیادہ فاصلے پر واقع برفانی چوٹیاں اتنی پاس نظر آتی تھیں کہ گویا اُنھیں چھولیں۔ قصبے کے مرکز سے ہر طرف پانچ منٹ چلنے کے بعد بڑے بڑے فارم مکانوں کے ساتھ جو کے کھیت ادھر ادھر بکھرے نظر آتے تھے۔لیہہ سے ایک گاؤں کا گمان ہوتا تھا۔ ہر ایک ایک دوسرے کو جانتا تھا اور سلام کلام کرتا تھا۔پچھلے سولہ سالوں میں میں نے اس گاؤں کو ایک پھیلتا ہوا شہر بنتا دیکھا ہے۔بے روح کال کوٹھریوں والی ہاؤسنگ کالونیوں نے سر سبز کھیتوں کو ہڑپ کیا ہے۔

صدیوں تک لیہہ ایک پائیدار معیشت کا ضامن تھا۔شہری اور دیہی معیشت میں فعال توازن تھا۔
نئی تہذیب کی بیماریاں جن سے لوگ روایتی طور پر تقریباً اَن جان تھے۔اب عام ہوگئی ہیں۔ ان میں کینسر، ذیابیطس اور فالج شامل ہیں۔

مصنفہ کے مطابق ذرائع ابلاغ اور سیاحت ایک فرد کے لیے نئی شبیہ پیش کر رہی ہے۔ڈائننگ ٹیبل پر کھانا کھانا، کار رکھنا، واشنگ مشین استعمال کرنا، جدید کچن اور باتھ روم سماجی مرتبہ کی علامات ہیں..........صارفیت (Consumerism) مرکزی کردار ادا کرتی ہے۔ یہ دیکھ کر دل ٹوٹتا ہے کہ لوگ چاہتے ہیں کہ چیزیں خریدنے کے لیے ان کی تعریف کی جائے۔عزت کی جائے اور آخر میں ان سے محبت کی جائے۔

حالیہ سالوں میں روایتی بھائی چارہ کو جوزک پہنچی ہے۔اس سے متعلق وہ لکھتی ہے: 'میں نے لوگوں کو بہت سارے معاملات میں تقسیم ہوتے دیکھا ہے۔بوڑھے اور جوان، مرد اور عورت، امیر

اور غریب اور بودھ اور مسلم میں خلیج پیدا ہو رہی ہے۔ لیہہ کے ماڈرن باشندے اپنے رشتہ داروں کے مقابلے میں دہلی یا کلکتہ کا باشندہ جیسے لگتے ہیں.......... پہلے انفرادی طور پر ناچاقی کی وارداتیں ہوتی تھیں۔ اجتماعی نہیں۔ جب میں اپنے پہلے پہل لداخ پہنچی تو بودھوں اور مسلمانوں میں باہمی احترام اور اشتراک عمل دیکھ کر بڑی متاثر ہوئی۔ میں نے پہلی مرتبہ ۱۹۸۶ء میں فرقہ وارانہ تناؤ دیکھا۔ جب میں نے لداخی دوستوں سے سنا کہ وہ انسانوں کو بودھ اور مسلم کے خانوں میں تقسیم کر رہے ہیں۔'

ماضی میں لداخ کے معاشی حالات پر مصنفہ نے یوں تبصرہ کیا ہے: 'پہلے لداخ خود کفیل تھا۔ گزشتہ ایک ہزار سال کے دوران لداخی معیشت نے لوگوں کی ضروریات کو پورا کیا ہے۔ روایتی طور پر لداخیوں نے اپنے وسائل ذہانت اور مہارت سے استعمال کیے ہیں اور ہم نے آرام اور سلامتی سے رہنا سیکھا ہے۔ پہلے جو کچھ ان کے پاس تھا، وہ اس پر مطمئن تھے لیکن آج جتنا زیادہ ان کے پاس ہے، وہ اس پر قانع نہیں۔'

ہیلنا کا خیال ہے کہ لداخیوں میں اصلاح لانے کے لیے مغربی پیمانہ استعمال کرنا غلط ہے اور اس ضمن میں لکھتی ہے۔ 'لداخ شاید جو سب سے اہم سبق دے سکتا ہے' وہ خوش رہنا ہے۔ یہ ایک ایسا سبق ہے، جو میں نے دیر سے سیکھا.......... جن لداخیوں نے مغرب کا سفر کیا ہے، وہ وہاں بزرگوں کے تئیں بے اعتنائی کے بھیانک واقعات سناتے ہیں۔ عمر رسیدہ لوگ اکیلے رہتے ہیں۔ کسی سے بات چیت کرنا ان کے نصیب میں نہیں۔ دادی امائیں اپنے پوتے پوتیوں سے چند گھڑیوں کی ملاقات کے لیے مہینوں ان کی راہ دیکھتی ہیں۔ اور آخر کار ایک لداخی اسکالر گیلونگ پلدن کے الفاظ میں گالوں پر ایک بوسہ پاتی ہیں۔

بقول ہیلنا موجودہ کلچر نے ماحولیاتی مسئلہ پیدا کیا ہے۔ اگر اس کا سد باب نہ کیا گیا تو ناقابل تلافی نقصان ہوگا۔

ایک اور مضمون میں وہ رقم طراز ہے۔ 'آج کل لیہہ کے لوگ اپنے لیے خود کچھ بھی پیدا نہیں کرتے..........لداخ کا بڑا مفاد مغربی طرز کے urbanization (شہری ترقیات) کے خاتمہ

میں ہے۔.......... ابھی بھی لوگوں کی اکثریت روحانی، ثقافتی اور اقتصادی طاقت اپنی جائے سکونت سے حاصل کرتے ہیں۔ مغربی صنعتی کلچر آنے سے پہلے لوگ اپنے گیت گاتے، اپنی زبان بولتے اور اپنی خوراک کھاتے تھے۔

ہیلنا نوربخ کے تبصرے قدرے طویل ہوئے ہیں لیکن یہ قابل غور ہیں۔ تاہم کئی نکتوں پر لداخی تاریخ دان، دانش ور اور اکثر لوگ ہیلنا سے اختلاف رکھتے ہیں۔ ہیلنا نے لداخ کے ماضی کو Rosy Picture دکھایا ہے۔ لداخی ہر معاملہ میں خود کفیل نہیں تھا۔ بہت سارے لوگ فاقہ کشی کرتے تھے۔ کسان امیر زمین داروں اور سودخوروں کے رحم وکرم پر تھے۔

ہیلنا پر دوسرا اعتراض یہ ہے کہ کثافت اور ماحول کی آلودگی کے نام پر وہ جدید ترقیات کے خلاف ہے۔

کار رکھنا، واشنگ مشین استعمال کرنا اور جدید کچن یا باتھ روم بنانا سماجی مرتبہ کی علامت نہیں اور نہ عیاشی اور اوباشی ہے بلکہ زندگی کی بنیادی ضرورت ہیں۔

ایک بڑا طبقہ یہ بھی سوچتا ہے کہ ہیلنا نے مذکورہ دو تنظیموں کی اساس فرقہ واریت پر رکھی ہے۔ ان تمام اختلافات کے باوجود اس امر سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ لگ بھگ ۳۵ سال پہلے سمندر پار سے آئی ہوئی ایک بدیشی لڑکی نے اپنے قول وعمل سے لداخیوں کو ترقی کی نئی راہیں دکھائی ہیں، جن سے بہتوں کا بھلا ہوا ہے۔

ساؤتھمپٹن یونیورسٹی کے تین ریسرچ اسکالروں نے ۱۹۷۶ء اور ۱۹۸۰ء کے درمیان لداخ کے چند علاقوں میں ۲۴۰ قسموں کے پرندوں کی نشان دہی کی۔ اُن میں ۱۴۰ پرندے ایسے تھے، جن کو ریکارڈ نہیں کیا گیا تھا۔ کم سے کم ایک ایسا پرندہ تھا، جو ہندوستان کے کسی اور حصے میں پایا نہیں جاتا۔ اُنھوں نے بہت سارے پرندوں کو کڑے پہنائے۔

۱۹۷۷ء میں کیمبرج انڈر گریجویٹ کی ایک ٹیم نے لداخ کے ایک گاؤں ماتھو میں ثقافت اور آثار قدیمہ کا مطالعہ کیا۔ اُنھوں نے گاؤں میں سات ہفتے گزارے اور ماتھو گنپہ کے دو oracles کا

قدرے تفصیل سے ذکر کیا ہے۔

انڈریو ہاروے (Andrew Harvey)

انڈریو ہاروے ۱۹۸۱ء میں لداخ آیا تھا۔ اس کا سفرنامہ A Journey to Ladakh میں نے بہت سال پہلے پڑھا تھا۔ کتاب میں سری نگر سے لیہہ بس میں سفر کرتے ہوئے سیاحوں کے وہ بیانات دلچسپ لگے، جب وہ راستے میں مختلف چٹانوں پر کئی ہیئتوں کا حلیہ، ہیولا اور شکل وشباہت دیکھتے ہیں۔ مصنف لکھتا ہے: 'بس کی کھڑکی سے دیکھتی ہوئی ایک جرمن خاتون بولی — 'وہ دیکھو، کارڈینل آف میونخ لگتا ہے۔ لامایورو پہنچنے سے پہلے درہ کے اوپر وہ بیتھون کو دیکھتی ہے۔ ہیبر نے بھی ایسی ہی شبیہیں دیکھی تھیں۔ خود اینڈریو ہاروے کو جج کوک برن کی اصلی مورت اور کارڈینل وولزے کا خاکہ نظر آتا ہے۔

لوئس برنی (Louis Berney)

واشنگٹن پوسٹ کے ایک نامہ نگار لوئس برنی نے ۱۹۸۵ء میں جب جب لداخ کا سفر کیا تو اس کو محسوس ہوا کہ وہ پچھلی صدی کا لداخ دیکھ رہا ہے۔ بہت سارے لداخی روایتی لباس پہنتے تھے۔ اخبار میں ۱۰ مارچ ۱۹۸۵ء کو لداخ سے متعلق لوئس کا ایک مضمون چھپا ہے۔ اس کا اختصار اور لب لباب ملاحظہ ہو: 'لداخ تبّتی بدھ مت کے اسکالروں کے لیے تجربہ گاہ بنا ہے۔ گاؤں اور لیہہ میں گزرتا ہوا مجھے اکثر محسوس ہوا کہ میں پچھلی صدی میں پہنچا ہوں۔ لوگوں کا لباس جداگانہ اور ظریفانہ نظر آتا ہے۔ گرم ترین موسم میں بھی یہ اونی اور مخمل کے لباس پہنتے ہیں ....عورتیں بکری کی کھال اور سرخ کنٹوپ پہنتی ہیں۔ جن پر زری کا کام ہے۔ زیورات بہت استعمال کرتی ہیں۔ لیہہ میں سبزیاں بیچنے والی عورتیں گاہکوں کے انتظار میں اون کاتتے اور گپ شپ میں مگن ہیں..........لداخی عورتیں ہندوستان میں اپنی مسلم اور ہندو بہنوں کے مقابلے میں اجنبیوں سے زیادہ گھلتی ملتی ہیں۔ جولے ان کی زبان پر ہوتا ہے۔ جو سلام، ہیلو،

الوداع اور اظہار تشکر کے لیے استعمال ہوتا ہے۔'

لوئس کے نظریے کے مطابق یہاں فطرت اور انسان میں بقائے باہم کا اُصول کارفرما ہے۔

روہیت ووہرا

روایتی طور پر لداخ میں دو قبیلے مشہور ہیں —— درد اور چانگپا —— ان کی اپنی لمبی تاریخ ہے اور دلچسپ تمدن ہے۔ جو بیرون لداخ کے سیاحوں کے لیے باعث کشش ہے۔ روہیت ووہرا نے ۱۹۷۹ء اور ۱۹۸۰ء کے دوران لداخی بودھ درد قبیلہ (ڈوقپا) پر ریسرچ کیا اور دو کتابیں لکھیں۔ درد لائن آف کنٹرول کے ساتھ واقع وادیٔ سندھ کے چند گاؤں میں آباد ہیں۔ اپنے منفرد رسم ورواج، اعتقادات، لباس، شکل وصورت اور نسلی اعتبار سے درد دوسرے لداخیوں سے جدا ہیں۔

روہیت ووہرا کے مطابق درد ایک قدیم قوم ہے۔ مہابھارت، یونان اور ہندوستان کے قدیم سنسکرت ادب میں دردوں کا ذکر ہے۔ یونانی مورخ ہیروڈٹس نے، جن کو دُنیا کا پہلا مورخ کہا جاتا ہے، دردوں کو ہندوستان میں سب سے جنگ جو قوم کہا ہے۔ کشمیر کے چک حکمران درد نسل کے تھے۔

لداخ میں درد، گلگت، چیلاس اور ان کے آس پاس کے علاقوں سے آئے تھے۔ آبادی میں اضافہ، کھیتی باڑی اور چرائی کے لیے زمین کم پڑنے سے وہ نئی زمین کی تلاش میں گھر سے نکلے تھے۔ کئی گیت ان کے سفر کے راستوں کی نشان دہی کرتے ہیں۔ روہیت ووہرا نے متعدد گیتوں کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔ ایک گیت کہتا ہے:

ہم گلگت کے بروکسل نالے سے نکلے
اور گلگت کی رقص گاہ پہنچے
پھر تورمیک کے سردار کے محل کی کھڑکی کے پاس سے گزرے
پھر بسو بسو پہنچے لشکر کندب پہنچے
جہاں سے سکردو اور خپلو پہنچنے کا ذکر ہے۔

دوسرے گیت میں مولبیک، لامایورو، تیاہ تینگ موگنگ سے ہوتے ہوئے ہمس شوکپا چن پہنچنے کا ذکر ہے۔ جہاں سے وہ لیہہ اور شے پہنچے۔

درددوں کے ایک پرانے گیت میں گلگت سے ان کی لداخ آمد کا ذکر ہے۔ درد آج بھی یہ گیت گاتے ہیں۔ گیت کا بول ملاحظہ ہو۔

آپ لوگ کہاں سے آئے ہیں؟

ہم گلگت سے آئے ہیں۔

آپ کا مذہب کیا ہے؟

ہم دیوی دیوتاؤں کو پوجتے ہیں۔

آپ کی نسل کیا ہے؟

ہم گالو، مےلو اور ڈولو کی اولاد ہیں۔

آپ کا پیشہ کیا ہے؟

ہم سونا جمع کرتے ہیں۔

روہیت ووہرا کے ریسرچ کے مطابق درددوں کے سماج میں تین اہم افراد ہیں۔ ایک پجاری، دوسرا پرانے بھجن اور گیت گانے والا اور تیسرا کاہن، جسے 'لہا' کہا جاتا ہے۔ پجاری مذہبی فریضہ ادا کرتا ہے۔ گلوکار تقریبات میں پرانے گیت گاتا ہے۔ لہا یا کاہن وجد کے عالم میں پیش گوئیاں کرتا ہے اور سائیلوں کے مسائل کے حل کے لیے وسائل بتاتا ہے۔

درد ارواح خبیثہ، بھوت پریت، ٹونے ٹوٹکے اور تعویذ گنڈے پر اعتقاد رکھتے ہیں۔ یہ "لو" نام کی ایک غیر مرئی ہستی کو مانتے ہیں۔ جس سے متعلق یہ اعتقاد ہے کہ یہ پانی میں رہتا ہے اور چشمہ کے تازہ اور صاف پانی کا محافظ ہے۔ وہ لو کو اشتعال دینے سے سخت گھبراتے ہیں۔

درد اصول آلودگی Principle of Pollution کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ رسوئی کا چولھا ان کے لیے مقدس ہے۔ اس کے پاس ان کے گھر کا دیوتا "سب دق" رہتا ہے۔ جس کا بظاہر کوئی وجود نہیں۔ کسی اجنبی کو چولھے کے پاس پھٹکنے نہیں دیتے۔ آلودگی کا مسئلہ ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں

پر حاوی ہے۔ درد اکثر جوینپر کے پودے کی دھونی سے اپنے جسم کی تطہیر کرتے ہیں۔ کھانا کھانے سے پہلے وہ کھانے کے ٹکڑے تین مرتبہ ''سب دق'' کی مفروضہ جگہ کی طرف پھینکتے ہیں۔

روہیت وو ہرانے دردوں کے تیوہاروں کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ بونونو تیوہار ہر تیسرے سال اپنے آباواجداد کی یاد میں منایا جاتا ہے اور کئی روز تک جاری رہتا ہے۔ ساکا بیج بوائی کا تہوار ہے۔ سنولا آغاز بہار میں منایا جاتا ہے اور اچھی فصل کے لیے دُعا مانگی جاتی ہے۔ نئی فصل ملنے پر فصل کٹائی کا تہوار ہوتا ہے۔ مرنے والوں کی یاد میں ممانی تہوار منعقد کیا جاتا ہے۔ کسی کی عمر میں ۱۲ سال پورا ہونے پر گاؤں میں ایک اجتماعی میلہ لگتا ہے۔ رقص و سرود ہر تیوہار کی خصوصیات ہے۔

پانسہ کھیلنا دردوں کا محبوب مشغلہ ہے۔ کئی دفعہ کوئی سنجیدہ کام کرنے سے پہلے وہ پانسہ پھینک کر دیکھتے ہیں کہ وہ کام کرنا چاہیے یا نہیں۔

دردوں کی زندگی میں آج بھی چرائی اور زرعی زندگی کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ مرد اون بانٹتے ہیں۔ عورتیں تکلی پر اون کاتتی ہیں۔ تاکہ سردیوں کے لیے گرم اونی کپڑے تیار کریں۔

روہیت وو ہرا کی کتابیں اپنے موضوع پر گہری اہمیت کی حامل ہیں۔ تاہم روہیت وو ہرانے دردوں کی ان رسموں اور عقاید کا ذکر نہیں کیا ہے، جن پر وہ ماضی قریب تک عمل کرتے تھے۔ جن کا ذکر مغربی اسکالروں نے کیا ہے۔ وہ انڈے، مرغی اور مچھلی نہیں کھاتے تھے۔ گائے کا دودھ اور مکھن استعمال نہیں کرتے تھے۔ نہانا دھونا بھی ان کے نزدیک گناہ تھا۔

منیشا احمد

جہاں روہیت وو ہرانے درد قبیلے پر کام کیا ہے، منیشا احمد نے لداخ کے دوسرے قبیلے خانہ بدوش چانگپا پر دوررس کام کیا ہے۔ خانہ بدوشوں کی زندگی کا مطالعہ کرنے کے لیے وہ ان کے ساتھ خیموں میں رہی ہے اور سفر کیا ہے۔ منیشا نے ڈاکٹریٹ کے لیے اپنا تھیس لکھنے کے علاوہ چانگپاؤں کی دست کاریوں پر ایک کتاب لکھی ہے۔ ذیل میں ہم منیشا کی نگارشات سے چند اقتباسات پیش

کرتے ہیں:

'لداخ کا چانگپا قبیلہ اپنے تمدن، پیشہ، رہن سہن اور تاریخی پس منظر کے لحاظ سے ایک روایتی قبیلے کی تمام خصوصیات رکھتا ہے۔ چانگپا بڑے جفاکش ہیں۔ یہ کٹھن اور سخت زندگی بسر کرنے کے عادی ہیں۔ منیشا نے خانہ بدوش چانگپا کی روزمرہ زندگی، رہن سہن اور ثقافت کو اُجاگر کیا ہے۔ جو لداخ کے سرد اور بلند مقامات رُوپشو، کورزوق اور خرنق میں بستے ہیں۔

منیشا احمد کی تحقیق کے مطابق خانہ بدوش چانگپا ایک جگہ ایک ماہ یا اسے کم یا اُسے زیادہ مدت رہتے ہیں۔ اس کا انحصار چراگاہ میں گھاس کی دستیابی اور نایابی پر ہے۔ سردیوں کے تین چار ماہ وہ اپنے خاندان کے تمام افراد کے ساتھ اکٹھے گزارتے ہیں۔ اپنے مال مویشیوں کے لیے سردیوں میں استعمال کے لیے گھاس کا اسٹاک رکھتے ہیں۔

سفر میں وہ اپنا گھریلو سامان ساتھ لیتے ہیں۔ یاک کو عموماً سواری اور بھیڑ بکریوں کو باربرداری کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ ایک بھیڑ عموماً دس سے پندرہ کلو تک بوجھ اُٹھاتی ہے۔

خانہ بدوش چانگپا تنبو میں رہتے ہیں۔ تنبو یاک یا بکری کے بالوں یا دونوں ملا کر بنایا جاتا ہے اور اس کا رنگ کالا ہوتا ہے۔ وہ اس میں کھانا پکاتے ہیں۔ سوتے ہیں اور پوجا کرتے ہیں۔ اس کے اندر طاقچے بنے ہوتے ہیں۔ جن پر مکھن، پنیر اور گوشت رکھتے ہیں۔

ہر تنبو کے اندر پتھروں کا ایک چھوٹا سا چبوترہ بنا ہوتا ہے۔ جس پر بدھ کی چھوٹی مورتیاں یا تصویریں رکھی جاتی ہیں۔ تنبو کو دھارمک جھنڈوں اور یاک کی دموں سے سجاتے ہیں۔ ایک تنبو کی اوسط لمبائی ۱۰ فٹ، چوڑائی ۴ فٹ اور اونچائی ۶ فٹ ہے۔ آج کل روپشو میں سو تنبو ہیں۔ سفید رنگ کا تنبو بھی آج کل استعمال ہونے لگا ہے۔ یہ پیراشوٹ کے کپڑے یا مضبوط سوتی کپڑے سے بنایا جاتا ہے۔

خانہ بدوش چانگپا پشمینہ بکریاں پالتے ہیں۔ پشمینہ کا اچھا دام پاتے ہیں۔ پشمینہ سے شالیں بنتی ہیں۔ کشمیر میں بنی پشمینہ کی شالیں بڑی عمدہ ہوتی ہیں اور ان کی قیمت بھی زیادہ ہوتی ہے۔ زیادہ تر پشمینہ کشمیر برآمد کیا جاتا ہے۔

بھیڑوں سے اون حاصل ہوتی ہے اور گوشت کے لیے بھیڑیں قصابوں کو فروخت کی جاتی

ہیں۔ بکری کے بال یا پشمینہ کاٹتے ہوئے ایک گیت بنا ہے۔ منیشا احمد نے اس گیت اور دوسرے کئی گیتوں کو انگریزی کا جامہ پہنایا ہے۔

اے بکری! ابھی تم نے جو گھاس کھائی

اس کے لیے ہمیں کچھ پشمینہ دو

اے بکری! اس پانی کے لیے جو تم نے ابھی پیا

ہمیں کچھ اچھا پشمینہ دو

اے بکری! گھاس پر چپ چاپ بیٹھ جاؤ

ہمیں پشمینہ حاصل کرنے دو

پشمینہ اور اون کاتنے سے پہلے جیوتشی سے استدعا کرتے ہیں کہ کٹائی کے لیے ایک اچھا دن بتائے۔ کٹائی کا کام عموماً مرد کرتے ہیں۔ اگر کسی کنبے میں مرد کم ہو، تو عورتیں ہاتھ بٹاتی ہیں۔

چرواہے عام طور پر آٹھ نو سال کے لڑکے لڑکیاں ہوتے ہیں۔ چرواہا سے وابستہ ایک گیت پیش ہے:

چرواہا یہاں نہیں بیٹھو، چرواہا، اٹھو اپنی بھیڑوں کے ساتھ جاؤ

چرواہا! پہلے لاما کے پاس جاؤ اور آداب بجالاؤ

گرمیوں میں گرمی سے نہ گھبراؤ، سرخ رنگ کا مہین سوتی کپڑا پہنو

سردیوں میں سردی سے نہ گھبراؤ، موٹے چمڑے کا لباس پہنو

مال مویشیوں کو پہاڑ پر گھاس چرنے کے لیے لے جانے کے بعد عورت مرد باڑے میں جمع ہوتے ہیں۔ دھوپ میں بیٹھ کر نمکین چائے خوب پیتے ہیں۔ گپ شپ ہوتی ہے۔ چمچی میں ستو لے کر منہ میں پھانکتے ہیں۔ اور کتائی بنائی میں جٹ جاتے ہیں۔ عمر رسیدہ عورتیں اون دھنتی ہیں اور کتائی کرتی ہیں۔ جب کہ جوان عورتیں پٹو بنتی ہیں۔ مرد بٹائی کرتے ہیں۔ لڑکیاں کم سنی سے ہی کتائی اور دُھنائی میں ماں کا ہاتھ بٹاتی ہیں اور ۱۵، ۱۶ سال تک ٹھیک سیکھ لیتی ہیں۔ مرد عموماً ۱۷، ۱۸ سال تک بٹائی اور بنائی سیکھتے ہیں۔ لڑکیاں پہلے پٹو بننا اور لڑکے تنبو بننا سیکھتے ہیں۔ مرد خورجین

اور کمبل بنتے ہیں۔ جو یاک اور بکری کے بالوں سے بنائے جاتے ہیں۔ بنائی (Saddle Bag) کے لیے ہاتھ کرگھا استعمال کیا جاتا ہے، جو آسانی سے اُٹھایا جاسکتا ہے۔ عورتیں اُسے کمر سے باندھ کر بنائی کرتی ہیں۔

روپشو میں کہا جاتا ہے کہ جو لڑکیاں بنائی میں مصروف رہتی ہیں۔ ان کے دل و دماغ میں برے خیالات نہیں آتے۔

کرگھے کی تعریف میں خانہ بدوش چانگپاؤں کا ایک گیت سنیے:

کرگھا کو انمول سمجھو، یہ اچھی بات ہے، کرگھا کو لاما کی مقدس

عبادت گاہ سمجھو، یہ اچھی بات ہے،

کرگھا کو بدھ کا تیرتھ سمجھو، یہ اچھی بات ہے

کرگھے کے پرزے ایک ماں کے بارہ بچوں کی طرح ہیں

کرگھا کو دھارمک کتاب سمجھو، یہ اچھی بات ہے

کرگھے کی آواز کو ایک لاما کی آواز سمجھو، یہ اچھی بات ہے

ریوڑ کے ساتھ ایک محافظ کتا جاتا ہے، جو بھیڑوں کی حفاظت کرتا ہے۔ چرواہا اپنے ساتھ گوپھن لیتا ہے اور اسے ہلا ہلا کر جانوروں کو ہانکنے کے لیے آواز پیدا کرتا ہے۔

ستمبر اور اکتوبر کے مہینوں میں روپشو والے اکٹھے چھو کریا سفید جھیل سے نمک نکالتے ہیں۔ سبھی کدال، بیلچے اور ایک ٹین لے کر جھیل میں جاتے ہیں۔ ٹین کے پیندے میں سوراخ بنے ہوتے ہیں۔ جس میں سے فاضل پانی نکل جاتا ہے اور نمک موجود رہتا ہے۔ ایک دن نمک کو سکھایا جاتا ہے۔ پھر خورجین میں ڈال کر بھیڑ یا بکرا پر لاد کر منزل تک پہنچایا جاتا ہے۔

یاک چانگ تھنگ کا ایک اہم مفید جانور ہے۔ یہ یخ پر آرام سے چل سکتا ہے۔ گھاس چارہ کے بغیر برفانی علاقے میں کئی روز رہ سکتا ہے۔ اس کو بہت کم سردی لگتی ہے۔ اس لیے یاک کو ہمالیائی اونٹ کہا جاتا ہے۔

چھولو یا پانسہ کا کھیل خانہ بدوشوں میں مقبول ہے۔ وہ مختلف کاموں کے لیے بطور قرعہ اندازی پانسہ استعمال کرتے ہیں۔

سرکار نے ان کے لیے گشتی اسکول اور گشتی ڈسپنسری کا انتظام کیا ہے۔ پشمینہ، اون اور بھیڑوں کی فروخت سے اچھی آمدنی ہے۔ لیکن ایک خانہ بدوش کی زندگی مشکل اور سخت محنت طلب ہے۔ آب وہوا ناساز گار ہے۔ گھاس کی قلت رہتی ہے۔ برف وباد وغیرہ سے بھیڑ بکریاں مرجاتی ہیں۔ اس لیے بہت سے خانہ بدوش لیہہ اور آس پاس نقل مکانی کر کے بس گئے ہیں۔ اور اکثروں نے متبادل پیشے اختیار کیے ہیں۔ جسے خاص کر پشمینہ کی پیداوار کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔

ستیش بترا

۱۹۸۵ء میں اُردو کے جانے پہچانے افسانہ نگار ستش بترا لداخ آئے۔ اُنھوں نے ''جو لے لداخ'' کے نام سے اپنا سفر نامہ لکھا ہے۔

کرگل سے متعلق وہ رقم طراز ہیں: 'کرگل شہر کے بازار میں دو خوب صورت مسجدیں ہیں۔ اور ایک امام باڑہ ہے۔ چار سو سال پرانی مسجدیں ایرانی فن تعمیر کا نادر نمونہ ہیں۔ اکثر مسلمان سیاہ قبا اور پگڑیاں پہنے گھومتے نظر آتے ہیں۔ مسلمان عورتیں برقعہ اوڑھتی ہیں۔ شہر میں داخل ہوتے ہی جس چیز نے ہمیں فوری متاثر کیا، وہ جگہ جگہ لگے ہوئے امام خمینی کے پوسٹر تھے۔ بھائی صاحب کو جو اپنے بحری سفروں کے دوران ایران گھوم آئے تھے۔ یکا یک ایسا معلوم ہوا، جیسے وہ ایک بار پھر ایران پہنچ گئے ہوں۔ ظاہر تھا کہ مقامی لوگوں کے لیے امام خمینی کی شخصیت بے حد پر کشش تھی'۔

کرگل سے وہ درد گاؤں گئے جہاں بقول مصنف 'سفید بکریوں کی کھالیں اوڑھے، بالوں اور ٹوپیوں میں جنگلی پھول سجائے، رنگین واسکٹوں اور کرتوں میں ملبوس، کمر میں پٹکا باندھے دوشیزاؤں اور بانکے نوجوانوں نے ہمیں خوش آمدید کہا۔ ان کے شاداب چہرے، اُجلی رنگت اور تیکھے نقش آریائی حسن کا عمدہ نمونہ تھے۔ پچھلے زمانے کی کوہ قاف کی پریاں اپنی خوب صورتی کے لیے بے حد مشہور تھیں۔ اب وہی خوب صورتی یہاں موجود دوشیزاؤں کے انگ انگ میں رچی معلوم ہوتی تھی'۔

لیہہ قصبہ کے محل سے متعلق ستش بترا لکھتا ہے۔ 'یہ محل لیہہ شہر کی پہچان بن گیا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے لندن کے ٹاور برج، پیرس کے ایفل ٹاور یا دہلی کے ساتھ قطب مینار جیسی عمارتوں کی وابستگی طے شدہ امر ہے۔'

جدید لیہہ کے عنوان سے وہ رقم طراز ہے: 'آج لداخ میں ہر اچھی کوٹھی، مکان وحویلی ہوٹل یا گیسٹ ہاؤس میں تبدیلی ہو چکی ہے۔ یہاں بڑھیا فور اسٹار ہوٹل بھی ہیں.........لیہہ میں کوئی باقاعدہ سینما گھر نہیں ہے لیکن جگہ جگہ ویڈیو پارلر موجود ہیں۔ جہاں دن کے چار یا پانچ شو میں مختلف ہندوستانی اور انگریزی فلمیں دکھائی جاتی ہیں.........فلموں کی دُنیا سے آپ باہر آئیں لیہہ کے دربار روڈ سے لگتی چھنگ گلی آپ کی منتظر ہے.........چھنگ لداخیوں کا قومی مشروب ہے۔ (اب اس گلی میں چھنگ کی فروخت بند کی گئی ہے۔ چھنگ جو سے بنی شراب ہے)

ہوٹل سے باہر نکلنے پر دو منظر دکھائی دیتے ہیں۔ بازار یا پھر نلوں پر پانی کے انتظار میں ٹین، المونیم، کانسی یا پیتل کے ہر وضع کے برتنوں کی لمبی قطاریں ہیں۔ یہ منظر کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے دہلی میں کسی دودھ کے ڈپو کے کھلنے سے پہلے خالی بوتلوں کی قطاریں دکھائی دیا کرتی تھیں۔

لداخیوں سے متعلق مصنف کے تاثرات: 'لداخی بہت زندہ دل ہیں۔ دراصل وہ زندگی کی اہمیت کو بہت اچھی طرح جانتے ہیں.........موسیقی، گانے اور رقص کے دل دادہ، اُن کی جوشیلی آوازیں اور فراخ قہقہے ان کی زندہ دلی کا ثبوت ہیں۔'

کتاب کے آخری باب کا عنوان ہے۔ 'الوداع لداخ! پھر ملیں گے۔' لیکن اس سفر کے کچھ عرصہ بعد ستش بترا نہیں رہے اور اُنھوں نے زندگی کو الوداع کہا۔

جینت رضوی

جینت رضوی گزشتہ تیس سال سے لداخ پر تحقیقی کام کر رہی ہیں۔ دو کتابوں کے علاوہ اُنھوں نے متعدد مضامین لکھے ہیں۔ وہ آئیر لینڈ سے تعلق رکھتی ہیں۔ ایک آئی اے ایس افسر سید سجاد رضوی سے شادی کرنے کے بعد وہ ہندوستان میں بس گئی ہیں۔

جینت رضوی نے Native Genius (مقامی صلاحیت) کے عنوان سے لکھا ہے کہ لداخ کے لوگوں کا کلچر تبّتی اور غیر تبّتی عناصر کا امتزاج ہے۔ لداخی بودھوں پر تبت کے بودھ دھرم کا گہرا اثر ہے۔ مذہبی ارٹ اس لحاظ سے ایک زندہ روایت ہے کہ یہ آج بھی قائم ہے۔ لکڑی تراشی اور دھات کی برتن سازی کے ہنر کے سوا لداخ میں کسی اور فنی دست کاری کی روایت کو فروغ نہیں ملا۔ لکڑی کا کام فن تعمیر کے لیے ضروری ہے.........لکڑی کے ستونوں، کڑیوں اور محرابوں پر آرائشی نقش ونگار بنے ہوتے ہیں۔

دھات کا کام بھی بہت ضروری ہے۔ ہر گاؤں میں لوہار ہیں۔ سنار لداخی عورتوں کے لیے زیور بناتے ہیں۔

تبّتی بدھ مت کے علاوہ لداخ پر خاص طور پر اسلام کا اثر پڑا اور کچھ حد تک مشترکہ کلچرل خصوصیات نے نشو ونما پائی.........مکانوں اور گنپوں کی عمارات تبت جیسی ہیں۔ فن تعمیر پر دونوں خطوں کی آب وہوا اثر انداز ہوئی ہے۔ تاہم لداخی ایک مضبوط ثقافتی پہچان کے وارث ہیں اور تبت سے بہت کم لیا ہے۔

لداخ کے سماجی ناچ اور موسیقی تبت سے بالکل جداگانہ ہیں۔ سرنائی اور دمامہ تبت سے لداخ گئے ہیں.........لداخی موسیقی کی مختلف شکلیں ہیں۔ لہرنا یا دیوتا سے منسوب موسیقی کی ۳۶۰ دُھنیں ہیں.........شادی کے گیتوں کی تعداد بھی ۳۶۰ بتائی گئی ہے۔

لداخ میں آنے والی تبدیلیوں کا ذکر کرتے ہوئے جینت رضوی نے لکھا ہے: 'لداخ میں دوسری تبدیلیاں آچکی بھی ہیں اور اب بھی آرہی ہیں۔ کچھ تبدیلیوں کے سبب لداخ اور بیرونی دُنیا سے نئے رابطے قائم ہوئے ہیں۔'

مصنفہ لکھتی ہے: 'ترقیات، مقامی وسائل، مقامی علم اور مقامی تصوّرات کی اساس لیے ہونی چاہیے.........لداخیوں کی روایتی زندگی اور روّیہ میں سب سے زیادہ تغیر وتبدل بلاشبہ سیاحوں نے لائے ہیں.........کون سی تبدیلیاں قرین مصلحت ہیں اور کون سی نہیں۔ ان پر لداخیوں اور لداخ پر نظر رکھنے والوں میں گرما گرم بحث چل رہی ہے۔

جینت نے لداخ میں کام کرنے والی غیر سرکاری تنظیموں کی کارگزاریوں کا ذکر کیا ہے اور لداخ پہاڑی خودمختار ترقیاتی کونسل کے ممبران سے یہ اُمید رکھتی ہے کہ وہ صدیوں پرانی جمع شدہ دانائی، ماضی کی روایات اور جدید تقاضوں میں ایک توازُن برقرار رکھیں گے۔

جینت رضوی رقم طراز ہے: 'تبت پر چین کے قابض ہونے کے بعد لداخ بہت ساری قدروں سے محروم ہوگیا ہے۔ آج بہت سارے لداخی پہلے سے زیادہ خوش حال ہیں۔ اور دُنیاوی طور پر وہ اپنے آباواجداد سے زیادہ عقل مندی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔'

جینت کی لداخ کی تاریخ، تجارت اور کلچر پر گہری نظر ہے۔ اس ضمن میں ان کی دو کتابیں بڑی مستند سمجھی جاتی ہیں۔

جینت لکھتی ہے: 'آزادی سے پہلے نمک لداخ میں تجارت کا ایک اہم ترین خوردنی شے تھا۔ یہ جنوبی تبت کی کھاری جھیلوں سے نکالا جاتا تھا اور چنگپا قبیلہ ہزاروں بھیڑوں پر لاد کر لداخ لاتے تھے۔ نمک کا گندم، جو، خوبانی وغیرہ سے تبادلہ ہوتا تھا۔ کشمیری چاول اور بلتستان کی سوکھی خوبانی خریدنے کے لیے نمک سکے کا کام دیتا تھا۔ ہر سال ۴۰ ہزار سے ۶۰ ہزار بھیڑیں لداخ پہنچتی تھیں۔ ایک سیر نمک کو ایک سیر گندم اور ایک سیر خوبانی ملتی تھی۔

تجارت پر جینت کے علاوہ دوسرے کئی اور اسکالروں نے بھی لکھا ہے۔ کشمیر سے لداخ پشمینہ خریدنے کے لیے تاجر آتے تھے۔ ان کو تبت بقال یا تبت سے تجارت کرنے والے کہا جاتا تھا۔ روانگی سے پہلے 'قل' پڑھ کر آبدیدہ آنکھوں سے تاجر کو الوداع کیا جاتا تھا اور بے شمار دُعاؤں کے ساتھ یہ سفر شروع ہوتا تھا۔ کیوں کہ راستہ بڑا دُشوار گزار، سفر بڑا کٹھن اور جان لیوا تھا۔

ایک تاجر محمد عبداللہ تبت بقال کشمیر کا ایک سرکردہ موسیقار، داستان گو اور ایک خوش آواز گلوکار تھا۔

ماضی میں لداخ میں کسی ملازم کی تبدیلی سزا سمجھی جاتی تھی۔ معتوب ملازموں کو کشمیر اور جموں سے بطور سزا لداخ تبدیل کیا جاتا تھا۔ کہتے ہیں، کشمیر سے کسی ملازم کو لداخ بھیجا جاتا تو اس اندیشے

سے کہ واپس لوٹ نہ پائے، وہ وصیت لکھ کر لداخ روانہ ہوتا تھا۔ یہ صورت حال گزشتہ صدی کے وسط تک رہی۔

ڈاکٹر روینہ اگروال

ڈاکٹر روینہ اگروال نے لداخی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر تحقیقی کام کیا ہے۔ لداخی زبان، ادب اور لداخیوں پر ریڈیو کے اثر کا مطالعہ اور تجزیہ کیا ہے۔ لداخی زندگی پر مطبوعہ کہانیوں اور گیتوں کا ترجمہ کیا ہے۔ جو لداخی سماج، لوگوں کے ذوق اور میلان طبع کی عکاسی کرتے ہیں۔

روینہ لکھتی ہے۔ 'لداخی زبان کی کئی کہاوتیں سماج میں مرد اور عورت کے روایتی مقام کو اُجاگر کرتی ہیں۔ جیسے ایک کہاوت ہے۔ مرد کے لیے سفر کرنا اور عورت کے لیے گھر پر رہنا بہتر ہے۔ ایک اور کہاوت ہے۔ 'مرد کے لیے مرنے کی کوئی جگہ نہیں۔ عورت کے لیے بالکل نہیں۔' اس کا مطلب یہ ہے کہ مرد ہمیشہ سفر میں رہتا ہے اور عورت کی شادی کہاں ہوگی' اس کا کسی کو پیشگی علم نہیں ہوتا ہے۔ موت کہیں بھی ہو سکتی ہے۔

روینہ کا خیال ہے کہ سیاحوں کی آمد سے نوادرات کی چوری اور لداخی ثقافت پر جو منفی اثر پڑا ہے۔ اس کی خوب صورت ترجمانی ایک لداخی شاعر کی ایک نظم کا ذیل کا بند کرتی ہے:

میڈونا لداخ پہنچی اور مصوری کے شہ پارے دساور پہنچے

روینہ نے لداخ کے گاؤں اچینا تھنگ کے ایک مسلمان ماسٹر کریم کے حوالے سے لکھا ہے کہ ماضی میں کھربو وغیرہ میں عید پر مسلمانوں کو گاؤں کے بودھ چھنگ سے تواضع کرتے تھے اور اسے عید چھنگ کہا جاتا تھا۔ مسلمان تہواروں پر بودھوں کے ساتھ ناچتے گاتے تھے۔

اسی طرح لداخی مورخ کاچو سکندر خان مرحوم نے لکھا ہے۔ اس زمانے میں علاقہ کرگل میں مرد بھی کان چھدایا کرتے اور پیتل کی بالیاں پہنا کرتے تھے۔ یہ کہاوت عام تھی کہ اگر دُنیا میں کان نہ چھدائے گئے تو قیامت میں لوہے کے بڑے اوزاروں سے چھیدے جائیں گے اور سخت عذاب

ہوگا۔ایک دن ماں نے کاچوصاحب کو ان کے بچپنا میں ایک بڑھیا کے پاس کان چھدانے لیا۔ بڑھیا نے ہاتھ کی صفائی دکھائی اور سوئی سے بڑی پھرتی سے ان کا دایاں کان چھید لیا اور سوراخ سے دھاگا گزارا۔اور ہدایت کی کہ دھاگے کو گاہ بگاہ کھینچتے رہنا۔ چنانچہ ہفتہ دو ہفتہ تک ایسا ہی ہوتا رہا اور اچھا خاصا سوراخ بن گیا۔ ماں نے چھدے ہوئے کان میں پیتل کی چھوٹی بالی پہنائی جو دس بارہ سال کان میں لگی رہی۔

صرف کوکشو میں ہی نہیں، کاچو سکندر خان کے مطابق چیکتن سوت وغیرہ میں ایسے بزرگ ہیں، جن کے آدھے نام مسلمان اور آدھے نام بودھ ہیں۔ناموں کا مفہوم ٹھیک ہے، جیسے چھرنگ کا مطلب درازئ عمر اور سکیت زوم سے مراد خوش حال اور خوش نصیب ہے۔

جان بیرے (John Bray)

لداخ کی تاریخ اور تمدن پر جان بیرے کی گہری نظر ہے۔بیرے نے مختلف موضوعات پر متعدد مضامین لکھے ہیں۔تاریخ لداخ اور ہندوستانی قومیت کے عنوان پر وہ ایک مضمون میں لکھتا ہے۔

'اگرچہ لداخ نے اپنی کلچرل روایت کو فروغ دیا ہے جو تبت اور ہم سایہ علاقوں سے مختلف ہے لیکن لداخی قومی پہچان کا مشترکہ احساس نہیں پایا جاتا۔لداخی کسان اپنے گاؤں، اپنی گھاٹی اور شاید اپنے گنپے سے منسلک ہوں، پورے خطے سے مجموعی طور پر منسلک نہیں تھے۔اسی طرح بودھ لاما اور مسلم تاجر میں لداخی شناخت کا فقدان تھا۔یہ اس لیے نہیں کہ وہ حد سے زیادہ متعصب تھے..........لاما اپنے تبتی لاموں سے مساوی طور پر وابستہ تھے۔سری نگر، کاشغر اور لہاسہ میں مسلم تاجروں کے رشتہ دار تھے اور ان میں آپسی تجارت تھی۔'

حالیہ برسوں میں فرقہ وارانہ کشیدگی کی روشنی میں وہ لکھتا ہے۔'ماضی کے فرقہ وارانہ اتحاد کی بنیاد منہدم ہوگئی ہے اور ایک نئی شناخت کی بڑی ضرورت ہے۔جس میں دوسرے فرقوں کے لیے تحفظ شامل ہو۔ یہ تب تک حاصل نہیں ہوسکتا، جب تک بودھ، مسلمان اور چھوٹی اقلیت عیسائیوں میں

مشتر کہ طور پر تاریخی بصیرت نہ ہو۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ دانائی اور لداخ کی تمام مذہبی روایات کا پاس ہو' جان بیرے نے لداخ میں موراوین مشن کی تاریخ اور یوگ دان پر بہت کچھ لکھا ہے۔

پروفیسر جان کروک: ایک اور مغربی دانش ور پروفیسر جان ایچ کروک کے مطابق روپیہ بنانے والی سیاحت سے لداخ کی روایتی قدروں کو خطرہ ہے۔ سیاحوں نے لداخیوں میں احساس کمتری پیدا کیا ہے۔ کروک نے تعلیم پر زور دیا ہے اور اسکولوں میں مادری زبان میں مقامی تاریخ، فلسفہ وغیرہ پڑھانے کی تجویز کی ہے۔ تاہم جان بیرے کا خیال ہے کہ آزادی کے بعد سماجی انقلاب فوج، مرکزی حکومت اور ریاستی سرکار کے ترقیاتی منصوبوں، غیر سرکاری تنظیموں کی اضافی کاوشوں اور خطے کو سیاحت کے لیے واگزار کرنے کی رہین منت ہے۔

نکی گریسٹ (Nicky Grist)

نکی گریسٹ نے کرگل کی وادی سورو پر اپنا تھیسس قلم بند کیا ہے۔ جو مسلم آبادی والے اس علاقے کی سیاست، سماجی زندگی، آپسی اختلافات اور نئی صورت حال میں بچوں کی تعلیم کے تئیں دلچسپی پر روشنی ڈالتا ہے۔ لداخی مسلمانوں سے متعلق بودھوں کے مقابلے میں بہت کم لکھا گیا ہے۔

راجگان لداخ کے دور میں سماجی تفریق پر نکی نے یوں روشنی ڈالی ہے:

'لباس لداخ میں سماجی مرتبہ کی علامت تھی۔ سکوٹق یا رؤسا رنگے ہوئے لباس پہنتے تھے جب کہ عام لوگ سادہ کپڑے پہنتے تھے۔ جب عام لوگ بھی رنگے ہوئے سرخ کپڑے پہننے لگے تو روسا بیرونی ممالک سے درآمد کیے ہوئے قیمتی کپڑے استعمال کرنے لگے۔ ان میں چین کے کم خواب اور وسط ایشیا کی مخمل شامل تھی۔ کمخواب اور زربفت کے کپڑے صرف رؤسا پہن سکتے تھے۔ اسی طرح سونے کے زیورات صرف رؤسا کی بیویاں استعمال کرسکتی تھیں۔ وسط ایشیا سے درآمد شدہ مخمل اور جوتے پر بھی رُؤسا کی اجارہ داری تھی۔ عام لوگوں کے لیے ان کے استعمال پر پابندی تھی۔

نکی گریسٹ سیاحت کے لیے واگزار کرنے کے بعد شروع میں لداخ آنے والوں میں تھی

اور آخری دم تک وہ لداخ کے بارے میں لکھتی رہی۔

ڈاکٹر مارٹین وین بیک (Martijn Van Beek)

مارٹین وین بیک نے اپنے جامع اور دلچسپ تھیسس میں تاریخی تناظر میں لداخ کی سیاسیات، سماجی جاگرتی، بودھ مسلم تعلقات کے نشیب وفراز اور غیر لداخیوں کے کردار کو معروضی طور پر پیش کیا ہے۔

مارٹین نے لداخ کی تاریخ، ثقافت اور تمدن کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔

عالمی سطح پر گرمی کی حدت بڑھنے (Global Warming) سے دُنیا میں آب وہوا میں جو تغیر وتبدل آرہا ہے۔ اس کا برا اثر لداخ پر پڑ رہا ہے۔ لداخ میں عمومی طور پر آب پاشی اور پینے کے پانی کا انحصار اونچے پہاڑوں پر موجود گلیشیروں کے پانی پر ہے۔ جو تیزی سے پگھل رہے ہیں۔ اگر یہ صورت حال رہی، تو وہ دن دور نہیں، جب کوئی گلیشیر نہیں ہوگا۔ مارٹین اور لداخ سے دلچسپی رکھنے والے مغربی ملکوں کے ہمدردوں اور خیر خواہوں کو یہی اندیشہ ہے۔

ڈاکٹر کرسٹوفر بریکس برٹیلسن (Kristoffer Brix Bertelsen)

ڈنمارک کے ایک ریسرچ اسکالر کرسٹوفر نے لداخ میں پائدار ترقیات، ماحولیات کے تحفظ، پولینڈری وغیرہ پر مضامین لکھے ہیں۔ اپنے تھیسس میں تاریخی اور سیاسی تناظر میں بودھ مسلم منافرت اور بودھوں کی فرقہ وارانہ نمائندگی کا جائزہ لیا ہے۔ وہ لکھتا ہے۔ بودھوں کی پہچان آزادی سے پہلے ہوئی تھی۔ جب تیس کی دہائی میں ینگ مین بدھسٹ ایسوسی ایشن اور کشمیر راج بودھی مہا سبھا نے مہا راجہ کو بودھوں کی پسماندگی اور غریبی سے متعلق یادداشتیں پیش کی تھیں۔

وہ رقم طراز ہے: '۱۹۳۰ء کی دہائی سے بودھوں کو فعال بنانے کے لیے تحریک چلی۔ ۱۹۸۹ء میں ایجی ٹیشن نے تشدد کی راہ اختیار کی اور پہلی دفعہ بودھوں اور مسلمانوں میں خلیج پیدا ہوئی'۔

ہر سال مغرب سے طلبا تعلیمی دورے پر لداخ آتے ہیں اور کبھی کبھی لداخی طلبا کے ساتھ تعلیمی

دوروں کا تبادلہ ہوتا ہے۔ یونیورسٹیوں سے ہر سال ایک یا ایک سے زیادہ ریسرچ اسکالر اپنی پی ایچ ڈی کے موضوعات پر تحقیقی کام کرنے کے لیے لداخ پہنچتے ہیں۔ قلم کاروں اور ریسرچ اسکالروں نے گوناگوں موضوعات پر کام کیا ہے اور مضامین اور کتابیں تصنیف کی ہیں۔ صوفی ڈے نے ۱۹۹۰ء، ایمیلی شینک نے ۱۹۹۳ء پیٹرک کپلانین نے ۱۹۹۵ء اور ایسا بیلیے ریابوف نے ۱۹۹۷ء میں لداخ کے لہا، لہا مو (Oracles) پر تحقیقی کام کیا۔ نیل ہاورڈ نے وادیٔ سندھ اور زنسکار کے قلعوں کے کھنڈرات پر ریسرچ کیا ہے اور ان کی تفصیلات منظر عام پر لائی ہیں۔ مارک ٹریوین نے موسیقی، ڈیوڈ نیل گرو اور سکورپسکی نے ثقافتی ورثہ، پاسکل ڈولفس نے تمدن، اوٹو فنشر نے پرندوں، جوزف فوکس، ستیہ پی سنہا اور آر ایس چنداوات نے جنگلی جانوروں، چارلس گینوڈ، مدن جیت سنگھ، روجر گوئپر اور مارکو پالیس نے آرٹ، ستیس چندر سکسینہ اور جینت رضوی نے تجارت اور جوڈی اینے سٹرنر نے بلندی کے اثرات پر تحقیقی کام کیا ہے اور ان علوم وفنون سے متعلق کارآمد معلومات فراہم کی ہیں۔ روبرٹو وٹالی اور لوسینوپٹیک نے لداخ کی تاریخ میں نئی اور اہم معلومات کا اضافہ کیا ہے۔ گیرارڈ ایمر نے لداخی مسلمانوں سے انگریزی دان قارئین کو روشناس کیا ہے۔ وبھا کرشن سود نے سیاحت سے لداخ کے سماجی، معاشی، کلچر، ماحولیات وغیرہ پر جو منفی اثر پڑا ہے، اس کو ابھارا ہے اور اس کے مداوا اور پائیدار سیاحت کے لیے اپنی تجاویز پیش کی ہیں۔ سمرتی سری نواس نے تاریخی پس منظر میں یہ بتایا ہے کہ ایک دیرینہ نظام کے تحت لوگ کھیتی باڑی، شادی، غمی وغیرہ میں کس طرح ایک دوسرے کا ہاتھ بٹاتے ہیں۔ اس ضمن میں سمرتی سری نواس نے نوبراہ کے دو گاؤں ہندو اور ٹاغر انتخاب کیے ہیں۔ محمد آمین پنڈت نے اپنی نئی کتاب Ladakh Land of Possessive Powers and Charm میں لکھا ہے کہ لداخ ایک نیا دور میں داخل ہوا ہے۔ یہ خطہ اب ویرانی کا نقشہ پیش نہیں کرتا، بلکہ یہ زندگی اور سرگرمیوں سے بھرپور ہے.......... دشوار گزار راستے واگزار ہونے کے بعد نئی تہذیب یہاں پہنچی ہے.......... صدیوں تک الگ تھلگ رہنے کے بعد لداخ میں رسائی اب آسان ہوگئی ہے۔

Gabriele Reifenberg نے لداخ کچن کے نام سے اپنی کتاب میں لداخی ماکولات اور مشروبات کی تفصیلات اوران کے بنانے کے طریقے بتائے ہیں۔

پادری والٹراسبو نے ایک ہزار لداخی کہاوتوں کوانگریزی کا جامہ پہنایا ہے اور غیرلداخیوں کو پہلی دفعہ ان سے لطف اندوز اور مستفید ہونے کا موقعہ دیا ہے۔لداخی عالم جوزف گیرگن نے اس ضمن میں اُن کواپنا تعاوُن دیا ہے۔

Kim Gutschow نے ایک لداخی بھکشونی کی زندگی کو اُجاگر کیا ہے۔فرانسیسی، جرمنی، انگریزی، چینی، جاپانی اورکئی زبانوں میں لداخ پر گائیڈ بک لکھی گئی ہیں۔

الختصر بیرون لداخ کے محققوں، عالموں اور سیاحوں کی بدولت آج لداخ دُنیا کے سامنے ایک کھلی کتاب کی طرح ہے۔

• • •

کتابیات

اُردو کتابیں

کتاب	سال	مصنف
احوال ملک لداخ (قلمی نسخہ)	تقریباً ۱۸۶۹ء	محمد خان
سفرنامہ مہتہ شیر سنگھ (قلمی نسخہ)	تقریباً ۱۸۶۷ء	مہتہ شیر سنگھ
تاریخ جموں، کشتواڑ تبت، لداخ بلتستان، پوریگ، گلگت، مظفر آباد	۱۹۳۷ء	حشمت اللہ خان
افکار پریشاں	دسمبر ۲۰۰۱ء	کاچو سکندر خان
جوے لداخ	۱۹۹۰ء	ستیش بترا
جموں، کشمیر اور لداخ، قدیم تذکروں اور سفرناموں کی روشنی میں (شیرازہ، شمارہ ۶ تا ۹ اور ۶ تا ۱۱ خصوصی نمبرات)		مختلف قلم کار
'آفیون'، ماخوذ از خلاصۃ التواریخ (اقتباس)		مرزا سیف الدین
لداخ میں عیسائی مشنری کی سماجی اور علمی خدمات (شیرازہ)	۲۰۰۶ء	عبدالغنی شیخ
کشمیری مسلمانوں کی سیاسی جدوجہد (۱۹۳۱-۱۹۳۹)	۱۹۹۱ء	مرزا شفیق حسین
آئین اکبری	۱۵۹۵ء	ابوالفضل
شاہ جہاں نامہ (۱۶۲۷-۱۶۵۸)	۱۹۹۰ء	عنایت خان
یاترا کے پنّے (ہندی)	۱۹۳۳ء	راہول سنکرواتسائین
میری لداخ یاترا (ہندی)	۱۹۲۶ء	راہول سنکرواتسائین
محمد عبداللہ تبت بقال	۱۹۸۷-۸۸ء	سید قیصر قلندر

'ہمارا ادب' شخصیات نمبر چودھری خوشی محمد ناظر ۱۹۸۷		عبدالاحد رفیق
۱۹۸۶ء 'ہمارا ادب' شخصیات نمبر —		
لداخ — تہذیب وثقافت	۲۰۰۶ء	عبدالغنی شیخ

انگریزی کتابیں (English Books)

The Adventures of a lady	1850	Mrs. Harvey
Kashmir in Sunlight and Shadow	1896	Tyndle Biscoe
The Pamirs	1892	Earl of Dunmore
Kashmir and Kashghar	1875	H.W. Bellew
Bullet and Shot in Indian Forest	1900	E.M. Russel
The Rifle in Cashmere	1862	Arthur Brinck Man
The Tourists and Sportman's Guide to Kashmir and Ladakh	1896	A.E. Ward
Shooting in the Himalayas	1854	Col. Fred Markham
A tour in the Himalayas and Beyond	1898	Sir Reginald Rankin
Travels Ladakh, Tartary and Kashmir	1862	Lt. Colonel Torrens
In Himalayan Tibet	1912	A. Heber and Kathleen, M. Heber
Ladakh	1853	Alexander Cunningham

Gazetter of Kashmir and Ladakh	1890	Compiled by G. M. G
More than Mountains	1955	John A. Jackson
Kashmir Papers–British Intervention in Kashmir (3Papers)	1868,1870 &1890	1. Arthur Brinckman, 2. Robert Thorp 3. William Digby
The Road to Lama Land	1928	M.L.A. Gompertz
The J&K Territories	1876	Frederic Drew
Sports in the High Lands of Kashmir	1898	H.Z. Darrah
The Abode of Snow	1873	Andrew Wilson
Where Three Emipires Meet	1891	E.F. Knight
Kashmir		J.P. Ferguson
Diary of a Pedestrian in Kashmir and Tibet	1869	W.H. Knight
The Western Himalayas and Kashmir	1852	Andrew Leith Adhms
Recent Resarch on Ladakh (6 families of Leh)	1938,1981	Prince Peter Prof. J. Crook, T. Shakya
Tresspassers on the Roof of the World	1982	Peter Hopkirk
The unnoticed Muslims on the top of the World	1999	Dr. Gerhard Emmer

High Altitude Adaptations: Physiology and culture in the Andes and the Tibetan Plateau	1985	Judith Anne Sterner
Travels of Tibetan Pilgrims in the Swat Valley	1940	Giuseppe Tucci
A Study of the Chronicles of Ladakh	1930	Lucino Petech
Ruins of Desert	1912	M. Aurel Stein
New Light on the Tibet-Ladakh-Mughal war of 1679–84	1968	Zahir-ud-din Ahmad
Trade in Ladakh (suring Dogra Period (1842–1947)	2006	Satish Chandra Saxena
The role of trade in Pre Indipendence Ladakh		Janet Rizvi
When Men and Mountains Meet The explorers of the Western Himalayas (1820–25)	1977	John Keay
The Moravian Archive of Hernhut as a source for the Modern History of Ladakh	2000 Ladakh Studies No. 13	Karin Andre and Thiery Dodin

Corvee Tranport labour in 19th and early 20th Century Ladakh: A Study in Continuity and Change		John Bray
Ladakh–Land of Possessive Powers and Charm	1997	M. Amin Pandit
An Ethnography–The Buddhist Dards of Ladakh	1989	Rohit Vohra
The Religion of the Dards in Ladakh	1989	Rohit Vohra
Living Fabric–Weaving among the nomads of Ladakh Himalaya	2002	Monisha Ahmed
Ladakh–Vast Land of Spectacle	1985	Louis Berney
Recent Research on Ladakh: An Introductory Survey	1998	John Bary
Between Baltistan and Ladakh	1913–14	Giotto Dainelli
Into Little Tibet	1923	Helen Mary Boulnois
No Purdah in Padum: The Story of the Women's Overland Himalayan Expedition 1958	1960	Antonia Deacock
Ladakhi History and Indian Nation Hood	1997	John Bray

The Complexity of Polyandry on the Changing Nature of Ladakhi Culture	1996	Kristoffer Brix Bertelsen
Himalayan Headstones from Ladakh, Kashmir	2002	Eileen Hewson
Tibet and Turkistan	1903	Q.T. Crosby
Our Man in Ladakh	1947	Col: RCF Schomberg
Leh and People of the Himalaya	1968	Prof. Sabodh Chandra Bose
The history of Christianity in Ladakh		George Mampillil
Routes in Jammu and Kashmir	1897	Le Marquis De Bourbel
Cambridge under Graduate Ladakh Expedition 1971	1977	
The Gobi Desert with Mildred Cable, with France sca French	1942	M. Aurel Stein
Tibet-Land of Snows		Giuse Ppe Tucci
The Silk Route and the Diamond Path		E. Klimbug Salter
Tibet–The Country and its Inhabitants	1891	F.Grenard
On Top of the World Five Women Explorers in Tibet	1984	Luree Miller
An English Buddhist in Rizong Monastery	1962	Lobzang Jivaka

The Kingdom of Guge, Puhrang	1996	Roberto Vitali
Ordering Spirits: The Inatiation of Village Oracles in Ladakh	1990	Sophie Day
Imperial Gazetter of India Provincial Series—Jand K	1909	Sir Walter Lawrence
Peaks and Lamas	1939	Marco Pallis
Ancient Futures–Learning from Ladakh	1991	Helena Norberg Hodge
Sustainable Development, Social Identification and Politics of Representation in Ladakh	1996	Kristoffer Brix Bertelsen
Travels in Mughal Empire (1656–1668)	1891	Francois Bernier
A Trip to Kashmir and Ladakh	1877	Cowley Lambert
The Unknown Life of Christ	1894	Nicolas Notovitch
The Tourist Guide to Ladakh, Skardu etc.	1908	Arthur Neve
Picture sque Kashmir		Arthur Neve
yak Shooting in Tibet	1900	Edgar Phelps
History of Buddhism in Kashmir		Sarla Khosla
Travels in Kashmir, Ladakh, Skardu	1842	G.T. Vigne

Cosma De Kross	1923	Hirendranath Mukerjee
A Journey to India	1811	Rafiul Danlegov
Travels in the Himaliyan Provinces of Hindustan and the Punjab	1837	William Moorcraft and George Trebeck
A. H. Francky		John Bray
Travels Beyond the Himalayas	1812	Mir Izat-u-Llah
The Folk Songs of Ladakh		Rev. Hanlon
Riots in Ladakh		Sidiq Wahid
Indipendence is not enough	1995	Martijn and Kristoffer
A Summer in the Himalyas	1860	W. Wilson
Britain and Chinese Central Asia–The Road to Lhasa	1960	Alastair Lamb
Among the Tibetans	1904	Isbella L. Bishop
Kashmir		Young Husband
Golden Doorway to Tibet	1947	Nicol Smith
Moved on from Kashghar to Kashmir	1935	P.S. Nazaroff
Trans Himalaya (3 vol.)	1909	Sven Hedin
Tales of Tirah and Lesser Tibet	1922	Lilian A. Starr
Realm of the Gods (a Tale of Travel)	1915	C.M. Enriquiz

Indian Explorers of the 19th Century	1973	I. Singhrawai
India and Tibet	1910	F. Young Husband
Wonders of the Himalaya	1924	F. Young Husband
Diary of a Journey Across Tibet	1889	Hamilton Bower
Ladakh Through the Ages	1992	Shri Dhar Koul and H.N. Koul
Four Years in Tibet	1894	Ahmed Shah
Trans Himalaya Unveiled	1906	David Fraser
Disseration (about Ladakh)	1996	Martijn Van Beek
Dissertation (about Ladakh)	1994	Ravina Aggarwal
In the Ice World of Himalaya	1898	F.B. Workman and William H. Workman
The Sacred Mountain	1941	Kirghiz Kazaki
The Travels of Filip Yefr Mov	1781–82	Filip Yefremov
Ladakh Expedition University of Southampton	1980	
An Echo of the Unknown	1931	Pt. Amar Nath
Guide to Ladakh		
A Ride to Leh	1919	Ashbrooke Crump
Mountain Magic	1926	Eve Orme
Ladakh (Economic)	1948	A.N. Sapru
Ladakh Studies No: 13	2000	Differnt Authors
A Summer in High Asia	1899	F.E.S. Adair

Buddhism in Kashmir and Ladakh	1979	J.N. Ganhar
Famous Western Explorers to Ladakh	1995	Prem Singh Jina
The Italian Expedition to the Himalaya, Karakoram and Eastern Turkistan (1913–14)	1913–14	Fillipo De Fillipe
East of the Sun and West of the Moon	1926	Theodore Roosevelt and Kermit Roosevelt
A Summer Ride Through western Tibet	1906	Jane. E. Duncan
Portrait of India	1969	Ved Mehta
Himalayan Frontiers	1969	Dorothy woodman
In the World's Attic	1931	Henrie Sands Merrick
The Trekkers Guide to the Himalaya and Karakoram	1981	Hugh Swift
My Journey to Lhasa	1923	Alexandar David Neel
The Flora of Ladakh	1916	R.R. Stewart
Magic Ladakh	1928	M.L.A. Gompertz
Our visit to Hindustan Kashmir and Ladakh	1879	J.C. Murray Aynsley
Frontier Callings	1976	P.N. Koul
Himalayan Letters of Gypsy Devy and Lady BA	1927	Devy and Lady BA
A Journey to Ldakh	1981	Andrew Harvey

Western Himalaya and Tibet	1852	Thomas Thomson
Ladakh–The Moonland	1980	Fida Hassnain
Recent Research (Ladakh)	1985	Differnt Writers
Thirty Years in Kashmir	1913	Arthur Neve
Cross Road of High Asia	1983	Janet Rizvi
This is Kashmir	1954	Pearce Gervis
I was on the Kashmir Front	1948	Mohinder Bahl
The Voice of People, The Voice of God, Buddhists and Muslims in a Frontier Community of Ladakh	1989	Smriti Srinivas
Dynamics of Tourism Development and Aspects of Sustainability—A Case Study of Ladakh		Vibha Krishan Sood
In Kashmir and Tibet	1922	Swami Abheda Nanda
Rahula Sankrtyayana and the History of Buddhist Organisation in Ladakh (Ladakh Studies: No. 16)	2001	Martijn Van Beek
The Lost Years of Jesus	1984	E.C. Prophet
The Mountain Ungulates of Ladakh	1991	Joseph L. Fox. R.S. Chundawat
Travels in Ladakh	1998	Syed Ali Najaf
Beyond the High Himalayas	1953	William O. Douglas

Tarikh Rashidi, (English Translation by Denison Ross)	1973	Mirza Mohammad Haider
Early Jesuit Travellers in Central Asia (1603–1721)	1924	C.S.J. Wessels
Servant of the Sahibs	1923	Rassul Galwan
Ladakh and Western Himalayan Politics	1973	C.L. Datta
William Moorcraft—An Assesment	1995	Philip Denwood
Life and Works of Alexander Cosma De Coros		Theodore Duka
Beyond Bokhara—The Life of William Moorcraft		Gary Alder
Western Tibet, A Practical Dictionary of the Language and Customs of the district included in the Ladakh Wazarat	1890	Captain H. Ramsay
The Exploration of the Siachan or Rose Glacier, Eastern Karakoram	1914	Fanny Bullock Workman
Ladakh, With Special Reference Toits Natural History	1927	Col. R. Meinertzhgen
Himalayan Buddhist Villages	1994	John Crook and Henry Osmoston

Printed at : Compudata Services, New Delhi – 20